جدید لائبریری

غبن

منشی پریم چند

اعوان پبلیکیشنز شیدی ولیج روڈ۔ پوسٹ بکس ۵۱۲۹ کراچی ۲

5/2

غبن

ایک معاشرتی ناول

منشی پریم چند

اعوان پبلیکیشنز پوسٹ بکس نمبر ۵۱۴۹ کراچی ۲

(جملہ حقوق محفوظ)

جدید لائبریری میں پاکستان میں پہلی بار چھپا

جون ۱۹۶۵ء

ناشر

ایم ایوب خان اعوان

(جاوید پریس)

قیمت [redacted]

۱

برسات کے دن ہیں، ساون کا مہینہ۔ آسمان پر سنہری گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ رہ رہ کر رم جھم بارش ہونے لگتی ہے۔ ابھی تیسرا ہی پہر ہے پر ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا شام ہو گئی۔ آموں کے باغ میں جھولا پڑا ہوا ہے لڑکیاں بھی جھول رہی ہیں اور ان کی مائیں ۲ ی، دو چار جھول رہی ہیں دو چار جھولنے کے انتظار میں کھڑی ہیں۔ کوئی کجلی گانے لگتی ہے کوئی بارہ ماسہ، یہ موسم دیویوں کے دل میں بچپن کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ یہ پھوہاریں گویا فکروں کو دل سے دھو ڈالتی ہیں۔ سبھی کے دل امنگوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ دھانی ساڑیاں قدرت کی ہریالی سے رنگ ہو رہی ہیں۔

اسی وقت ایک بساطی آکر جھولے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی جھولا بند ہو گیا۔ چھوٹی بڑی سبھوں نے آکر اسے گھیر لیا۔ بساطی نے اپنا صندوق کھولا اور چمکتی دمکتی چیزیں نکال کر دکھانے لگا کچے موتی کے گہنے ننھے ننھے لیس اور گوٹے، رنگین موزے خوبصورت گڑیاں۔ بچوں کے لٹو اور جھنجھنے، طرح طرح کے بگل اور سیٹیاں، سبھی نے اپنی اپنی پسند کی چیزیں چھانٹنی شروع کیں۔ ایک بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی نے وہ چیز پسند کی، جو ان چمکتی ہوئی چیزوں میں سب سے زیادہ خوشنما تھی۔ وہ فیروزہ رنگ کا ایک چندن ہار تھا۔

ماں نے بساطی سے پوچھا۔ یہ ہار کتنے کا ہے؟
بساطی نے ہار کو پونچھتے ہوئے کہا۔ خرید تو بیس آنے کی ہے آپ جو چاہیں دے دیں۔
ماں نے کہا۔ یہ تو بڑا مہنگا ہے۔ چار دن میں اس کی یہ چمک دمک جاتی رہے گی۔
بساطی نے پُر معنی انداز سے سر ہلا کر کہا۔ ہو جی۔ چار دن میں تو بٹیا کو اصلی چندن ہار مل جائے گا۔
ماں کے دل پر ان ہمدردانہ الفاظ نے چوٹ کی۔ ہار خرید لیا گیا۔
اس بھولی بھالی لڑکی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ شاید ہیروں کے ہار سے بھی اُسے اتنی خوشی نہ ہوتی۔ اُسے پہن کر وہ سارے گاؤں میں ناچتی پھری۔ اس کی ملکیت میں جو چیز سب سے قیمتی اور سب سے عزیز تھی وہ یہی بلّور کا ہار تھا۔
لڑکی کا نام جالپا تھا۔ ماں کا مانکی۔

(۲)

منشی دین دیال الہ آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ کسان نہ تھے مگر کھیتی کرتے تھے۔ زمیندار نہ تھے، مگر زمینداری کرتے تھے۔ تھانیدار نہ تھے مگر تھانیداری کرتے تھے۔ وہ زمیندار کے مختار تھے۔ گاؤں میں ان کی دھاک تھی۔ ان کے پاس چار چپڑاسی تھے۔ ایک گھوڑا۔ کئی گائیں اور بھینسیں۔ تنخواہ کل پانچ روپے تھی جو ان کے تمباکو کے خرچ کو بھی کافی نہ ہوتی تھی۔ مگر اس میں کچھ ایسی برکت تھی کہ رئیسانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ جالپا انہیں کی لڑکی تھی۔ پہلے اس کے تین بھائی اور تھے۔ مگر اس وقت وہ اکیلی تھی۔ اس سے کوئی پوچھتا تیرے بھائی کیا ہوئے؟ تو وہ بڑی سادگی سے کہتی۔ بڑی دور کھیلنے گئے ہیں۔ کہتے ہیں مختار صاحب نے ایک غریب کسان کو اتنا پٹوایا

تھا کہ وہ ایک ہفتہ کے اندر مر گیا اور سال کے اندر منشی جی کے تینوں لڑکے چلتے رہے۔ تب بیچارے بہت سنبھل کر چلتے تھے۔ اب یہی لڑکی ماں باپ کی زندگی کا سہارا تھی۔

منشی جی جب کبھی باہر جاتے تو جالپا کے لئے کوئی نہ کوئی زیور ضرور لاتے تھے۔ ان کے نجتہ کار ذہن میں یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ جالپا کسی اور چیز سے زیادہ خوش ہو سکتی ہے۔ گڑیاں اور کھلونے ان کی نظروں میں بیکار تھے۔ اس لئے جالپا زیوروں ہی سے کھیلتی تھی۔ یہی اس کے کھلونے تھے۔ وہ بلور کا ہار جو اس نے بساطی سے لیا تھا اب اس کا سب سے پیارا کھلونا تھا۔ اصلی ہار کی تمنا اس کے دل میں طلوع نہ ہوئی تھی۔ گاؤں میں کوئی تقریب ہوتی یا کوئی تیوہار آتا تو وہ وہی ہار پہنتی۔ کوئی دوسرا گہنا اس کی آنکھوں میں جچتا ہی نہ تھا۔

ایک دن منشی جی لوٹے تو مانکی کے لئے ایک چندن ہار لائے۔ مانکی کو یہ ارمان بہت دنوں سے تھا۔ جالپا کو اپنا ہار پھیکا معلوم ہونے لگا۔ باپ سے بولی۔ مجھے بھی ایسا ہی ہار لا دیجئے۔

منشی جی نے مسکرا کر کہا۔ لا دونگا بیٹی!

"کب لا دیجئے گا؟"

"بہت جلد۔"

باپ کی باتوں سے جالپا کا من نہ بھرا۔ اس نے ماں سے جا کر کہا۔ "مجھے بھی ایسا ہی ہار بنوا دو۔"

"اس میں تو بہت روپے لگیں گے۔"

"تم نے اپنے لئے بنوایا ہے تو میرے لئے کیوں نہیں بنواتیں؟"

"تیرے لئے سسرال سے آئے گا۔"

جالپا شرما کر بھاگ گئی۔ پر یہ الفاظ اس کے دل میں پتھر کی لکیر ہو گئے۔ سسرال اب اس کے لئے اتنی خوفناک چیز نہ تھی۔ سسرال سے چندن ہار آئے گا۔ شاید وہ لوگ

اسے ماں باپ سے زیادہ پیار کریں گے۔
اس طرح ہنستے کھیلتے سات سال گزر گئے۔

(۳)

منشی دین دیال کے نتنا ساؤں میں ایک بابو دیا ناتھ تھا۔ بہت ہی وضعدار اور خلیق کچہری میں پچاس روپے کے نوکر تھے۔ دین دیال عدالت کے کیڑے تھے۔ آئے دن دیا ناتھ سے سابقہ پڑتا رہتا۔ چاہتے تو دین دیال سے ہزاروں وصول کرتے پر کبھی ایک پیسے کے بھی روادار نہ ہوئے تھے اور ان کا یہ برتاؤ کچھ دین دیال ہی کے ساتھ نہ تھا۔ یہ ان کی عادت تھی۔ یہ بات بھی نہ تھی کہ بڑے پرہیزگار ہوں۔ مگر رشوت کو حرام سمجھتے تھے، شاید اس لئے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس کے نتائج دیکھ چکے تھے۔ کسی کو جیل جاتے دیکھا تھا۔ کسی کو اولاد سے ہاتھ دھوتے دیکھا تھا۔ کسی کو مکروہات میں پھنستے۔ ایسی انہیں کوئی مثال نہ ملتی تھی جس نے رشوت لے کر چین کیا ہو۔ ان کے دل میں یہ خیال راسخ ہو گیا تھا کہ حرام کی کمائی حرام میں جاتی ہے۔

اس زمانے میں پچاس روپے کی بھگت ہی کیا؟ پانچ آدمیوں کی پرورش بڑی مشکل سے ہوتی تھی۔ لڑکے اچھے اچھے کپڑوں کو ترستے۔ بیوی گہنوں کو ترستی۔ مگر دیا ناتھ نیت کو برگشتہ نہ ہونے دیتے۔ بڑا لڑکا دو ہی مہینے کالج میں رہنے کے بعد پڑھنا چھوڑ بیٹھا۔ بابو صاحب نے صاف کہہ دیا۔ میں تمہاری ڈگری کے لئے سارے گھر کو بھوکا اور ننگا نہیں رکھ سکتا۔ پڑھنا چاہتے ہو تو اپنی قوت بازو سے پڑھو۔ لیکن رما ناتھ میں اتنا استقلال نہ تھا۔ ادھر دو سال سے وہ بالکل بیکار تھا۔ شطرنج کھیلتا، سیر سپاٹے کرتا، ماں باپ اور چھوٹے بھائیوں پر رعب جماتا۔ دوستوں کی بدولت امارت کے شوق پورے ہوتے رہتے تھے۔ کسی کا چسٹر مانگ لیا اور شام کو ہوا کھانے نکل گئے۔ کسی کا پمپ شو پہن لیا۔ کسی کی گھڑی کلائی پر باندھ لی۔ کبھی بنارسی فیشن میں نکلے۔ کبھی لکھنوی فیشن میں۔ دس دوستوں نے ایک ایک سوٹ بنوالیا

تو دس سوٹ بدلنے کے سامان ہو گئے۔ باہمی امداد کا یہ نیا استعمال تھا۔ اسی نوجوان کو منشی دین دیال نے جاکیا کے لئے انتخاب کیا۔ دیا ناتھ لڑکے کی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کے پاس روپے نہ تھے اور نہ نئے خاندان کے بوجھ اٹھانے کی ہمت۔ مگر باگیشری کی تریاہٹ کے سامنے ان کی ایک بھی پیش نہ گئی۔ باگیشری برسوں سے بہو کے لئے تڑپ رہی تھی جو اس کے سامنے بہوئیں بن کر آئیں وہ آج پوتے کھلا رہی ہیں۔ پھر اس غریب کو کیسے صبر ہوتا۔ وہ کچھ کچھ مایوس ہو چلی تھی۔ ایشور سے منانی تھی کہ کہیں سے پیغام آئے۔ دینڈیال نے پیغام بھیجا تو اس کو آنکھیں سی مل گئیں۔ اگر کہیں یہ شکار ہاتھ سے نکل گیا تو پھر نہ جانے اور کتنے دن راہ دیکھنی پڑے گی۔ کوئی یہاں کیوں آنے لگا؟ گھر میں نہ دولت ہے نہ اثاثہ۔ اس لئے اس نے اس موقع پر سارا زور لگا دیا۔ اور بالآخر اس کی فتح ہوئی۔

دیا ناتھ نے کہا۔ بھئی تم جانو۔ تمہارا کام جانے۔ مجھ میں اتنی مقدرت نہیں ہے۔ جو آدمی اپنے پیٹ کی فکر نہیں کر سکتا۔ اس کی شادی کرنا مجھے تو گناہ معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ بریں نقد روپے بھی چاہئیں۔ ایک ہزار سے کم تو نمائش ہی میں نہ صرف ہوں گے۔ جوڑے اور زیورات کے لئے الگ، دکانوں پر ہاتھ (ذکر کر) نا۔ بابا یہ بوجھ میرے بوتے کا نہیں!

باگیشری پر ان دلیلوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بولی، وہ بھی تو کچھ دے گا۔

"تو کیا میں اس سے مانگنے جاؤں گا؟"

"تمہارے مانگنے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ لڑکی کی شادی میں کوئی پیسے کا منہ نہیں دیکھتا۔ پھر دینڈیال کے یہی ایک لڑکی ہے۔ بچا کر رکھیں گے تو بھی کس لئے؟"

دیا ناتھ کو اب کوئی بات نہ سوجھی۔ صرف اتنا بولے "وہ چاہے لاکھ دے دیں اور چاہے ایک نہ دیں۔ میں نہ کہوں گا کہ دو ورنہ کہوں گا کہ مت دو۔ قرض میں لینا نہیں چاہتا اور لوں تو دوں کس کے گھر سے۔"

باگیشری نے اس مشکل کو یوں آسان کیا۔ "مجھے تو یقین ہے کہ وہ ٹیکے میں ایک

ہزار سے کم نہ دینگے۔ نمائش کے لئے اتنا بہت ہے۔ گہنوں کا انتظام کسی صرّاف سے کر لیتا۔ دروازے پر بھی تو کچھ ملے گا ہی، وہ صرّافت کو دے دیتا۔ دو چار سو رہ جائیں گے تھوڑا تھوڑا کر کے وہ بھی چکا دیتا۔ پھر بچے کے لئے بھی تو کوئی نہ کوئی دروازہ کھلے گا۔"

دیانا تھ نے بے رُخی سے کہا۔ "دو کمل چکا جسے شطرنج اور سیر سپاٹے سے فرصت نہ ملے اس کے لئے سبھی دروازے بند رہیں گے۔"

باگیشری کو اپنی شادی کے حالات یاد آئے۔ اس وقت دیانا تھ بھی تو کُل چھرّے اُڑاتے تھے۔ لیکن اس کے گھر میں آتے ہی انہیں چار پیسے کمانے کی فکر کیسی سر پر سوار ہو گئی تھی ۔؟ سال بھر کے اندر ہی پندرہ روپے کی جگہ پا گئے۔ بولی "بہو کو آنے دو۔ یہ سیر سپاٹے بھول جائیں گے۔ دیکھ لینا۔ اپنی بات یاد کرو۔ جب تک گلے میں جوا نہیں پڑتا سبھی کو کلیلیں سوجھتی ہیں۔ جوا پڑا اور سارا نشہ ہرن ہوا۔ نکموں کو راہ پر لانے کی اس سے بڑھ کر دوسری ترکیب ہی نہیں۔"

دیانا تھ اخبار پڑھنے لگے۔ جب وہ ہار جاتے تھے تو اخبار پڑھنے لگتے تھے۔ اپنی شکست کو چھپانے کا ان کے پاس یہی ایک ذریعہ تھا۔

(۴)

منشی دیندیال ان آدمیوں میں سے تھے جو سیدھوں کے ساتھ سیدھے ہوتے ہیں، مگر ٹیڑھوں کے ساتھ ٹیڑھے ہی نہیں، شیطان ہو جاتے ہیں۔ دیانا تھ نے بے پرکی اڑائی ہوتی تو دین دیال انہیں ایسا چکمہ دیتے کہ وہ عمر بھر یاد رکھتے۔ دیانا تھ کی شرافت نے انہیں فریفتہ کر لیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ ایک ہزار میں شادی کی ساری رسمیں پوری کر دیں۔ مگر ایک ہزار ٹیکے ہی میں لے آئے۔

دیانا تھ ایک ہزار کی تھیلی پا کر خوش تو ہوئے مگر اس نے ان کے سر کا بوجھ ہلکا

کرنے کے بدلے اور بھاری کر دیا۔ شادی کی تیاریاں بھی اب وسیع پیمانے پر کرنی پڑیں گی۔ اس شادی میں انہوں نے کم سے کم خرچ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن دین دیال کی فیاضی نے انہیں بھی فیاض بننے پر مجبور کر دیا۔ وہ سارے ٹیم ٹام۔ ناچ تماشے جنہیں وہ لغو سمجھتے تھے اب فرض کی صورت میں ان کے روبرو آ کھڑے ہوئے۔ بندھا ہوا گھوڑا تھان سے کھل گیا۔ کون روک سکتا ہے۔ پہلے چڑھاوے کو انہوں نے محض رسم سمجھا تھا۔ اب ایسا چڑھاوا لے جانے کی تجویز ہوئی جسے دیکھ کر سب کی آنکھیں کھل جائیں۔ کوئی تین ہزار کا سامان بنوا ڈالا۔ صراف کو ایک ہزار نقد مل گیا۔ ایک ہزار کے لئے ایک ہفتے کا وعدہ ہوا۔ تو اس نے کوئی عذر نہ کیا۔ بیوپاری کی لاگت نکل آتی ہے تو نفع کے متعلق اسے زیادہ اندیشہ نہیں ہوتا۔ پھر بھی چندن ہار کی کسر رہ گئی۔ جڑاؤ چندن ہار ایک ہزار سے کم میں اچھا نہیں مل سکتا تھا۔ دیا ناتھ کا جی تو ہرایا کہ لگے ہاتھ اسے بھی لے لو۔ مگر باگیشری اس پر راضی نہ ہوئی۔ بازی پلٹ چلی تھی۔

دیا ناتھ نے گرم ہو کر کہا: "تمہیں کیا تم گھر میں بیٹھی رہو گی۔ ندامت تو مجھے ہو گی۔ جب ادھر والے مین میکھ نکالنے لگیں گے"

"دو گے کہاں سے کچھ سوچا ہے۔"

"کم از کم ایک ہزار تو وہاں سے مل جائیں گے۔"

"وہ خون منہ لگ گیا شاید؟"

دیا ناتھ نے شرما کر کہا: "نہیں نہیں۔ مگر آخر وہاں بھی تو کچھ ملے گا۔"

باگیشری بولی۔ "وہاں ملے گا تو وہاں خرچ بھی ہو گا۔ نام چڑھاوے سے نہیں ہوتا دان دکشنا سے ہوتا ہے۔"

اس طرح چندن ہار کی تجویز فسخ ہو گئی۔

مگر دیا ناتھ نمائش کو کتنا ہی غیر ضروری سمجھیں۔ رما ناتھ اور اس کے احباب اسے

مقدم سمجھتے تھے۔ برات ایسی دھوم دھام سے جانی چاہیئے کہ سارے علاقے میں دھوم پڑ جائے پہلے نوشہ کے لئے پالکی کی تجویز ہوئی تھی۔ رما ناتھ اور اس کے دوستوں نے موٹر پر زور دیا۔ دیا ناتھ تنہائی پسند آدمی تھے، نہ کسی سے دوستی تھی اور نہ ربط وضبط۔ رما ناتھ ملنسار تھا اس کے احباب بھی اس وقت سارے تیاریوں میں پیش پیش تھے۔ وہ جو کام کرتے دل کھول کر۔ آتشبازیاں بنوائیں تو اوّل درجے کی طائفہ کیا تو اوّل درجہ کا باجے لگے جو بھی اول درجے کے۔ دوم سوم کا وہاں ذکر ہی نہ تھا۔ دیا ناتھ ان کی فضول خرچی دیکھ کر فکر مند ہو جاتے تھے، مگر کرتے کیا!

(۵)

ناٹک اس وقت پاس ہوتا ہے، جب اہل ذوق اسے پسند کر لیتے ہیں۔ برات کا ناٹک اس وقت پاس ہوتا ہے تب ہر خاص وعام اسے پسند کر لیتا ہے۔ ناٹک کا امتحان چار پانچ گھنٹے ہوتا رہتا ہے۔ برات کے امتحان کے لئے صرف اتنے منٹوں کا موقعہ ہوتا ہے، ساری دوا دوش، کاوش وجانفشانی کا فیصلہ پانچ منٹوں میں ہو جاتا ہے۔ اگر ہر ایک کے منہ سے واہ واہ نکل گئی تو تماشہ پاس۔ نہیں تو فیل۔ فتنی، دیا ناتھ کا تماشہ پاس ہو گیا۔ تیسرا درجہ ملتا۔ گاؤں میں اوّل درجہ مل گیا۔ کوئی باجوں کی دھوں دھوں پوں پوں سنکر مست ہو رہا تھا۔ تو کوئی موٹروں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ لیکن کچھ لوگ پھلواریوں کے تختے دیکھ کر لوٹے جاتے تھے۔ اور آتشبازی تو دلچسپی کا خاص مرکز تھی، ہوائیاں جب سن سے اوپر جاتیں اور آسمان میں سرخ سبز، زرد، نیلے قمقمے سے بکھر جاتے۔ جب چرخیاں چھوٹتیں اور ان میں سے ناچتے ہوئے مور نکل آتے تو لوگوں پر جادو کا اثر ہوتا تھا۔

جالپا کے لئے ان نمائشوں میں ذرا بھی کشش نہ تھی۔ ہاں وہ نوشہ کو ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی، وہ سب سے چھپکر، مگر اس بھیڑ بھاڑ میں یہ موقعہ کہاں؟ دروازہ چار کے وقت

اس کی سہیلیاں اسے چھت پر نیچے لے گئیں۔ مگر وہاں بھی وہ رما ناتھ کا صرف سہرا دیکھ سکی۔ چہرہ نظر نہ آیا۔

دروازہ چار کے بعد کھانے پینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ تھوڑے سے آدمیوں نے پوریاں کھائیں۔ زیادہ آدمیوں نے اپلوں پر باٹیاں پکائیں۔ چاروں طرف دھواں ہی دھواں نظر آنے لگا۔ تماشائیوں کی تفریح کے لئے محفل آراستہ ہوئی۔

آدھی رات کو پھر یکایک باجے بجنے لگے۔ معلوم ہوا کہ چڑھاوا آرہا ہے۔ شادی کی ہر ایک رسم ڈنکے کی چوٹ ادا ہوتی ہے۔ نوشہ کرنے آرہا ہے۔ باجے بجنے لگے۔ میری ملنے آرہا ہے۔ باجے بجنے لگے۔ خیر، چڑھاوا جونہی پہنچا، گھر میں ہل چل مچ گئی۔ مرد، بوڑھے جوان چھوٹے بڑے سب چڑھاوا دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ آپس میں دھکم دھکا ہونے لگا۔ مانکی پیاس سے بے حال ہو رہی تھی۔ حلق سوکھا جاتا تھا۔ چڑھاوا آتے ہی اس کی پیاس بھاگ گئی۔ دینڈیال ایک کوٹھری میں نیم جان سے پڑے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی بے تحاشا دوڑے، مانکی مانکی ایک ایک چیز کو نکال کر دیکھنے اور دکھانے لگی۔ وہاں سب ہی اس فن کے ماہر تھے۔ مردوں نے گہنے بنوائے تھے۔ عورتوں نے پہنے تھے۔ سبھی تبصرے کرنے لگے۔ یہ چوہے دنتی کتنی خوبصورت ہے۔ کوئی دس تولے کی ہوگی۔ یہ شیر وہان تو دیکھو۔ کیا ہاتھ کی صفائی ہے۔ کوئی بارہ تولے کا ہوگا۔ واہ کبھی دیکھا بھی ہے! سولہ تولے سے کم نکل جائے تو منہ نہ دکھاؤں۔ ہاں مال اتنا چوکھا نہیں ہے۔ یہ کنگن تو دیکھو۔ کیسی جڑائی ہے۔ کتنا باریک کام ہے کہ آنکھ نہیں ٹھیرتی سچے نگینے ہیں۔ اصلی چیز تو یہ گلوبند ہے۔ کتنے خوبصورت پھول ہیں! اور ان کے بیچ کے ہیرے کیسے چمک رہے ہیں۔ بنگالی سنار نے بنایا ہوگا۔ کیا بنگالیوں نے کاریگری کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ ہمارے یہاں ایک سے ایک کاریگر پڑے ہوئے ہیں۔ بنگالی سنار بیچارے کیا ان کی برابری کریں گے۔

اسی طرح ہر ایک چیز کی تنقید ہوتی رہی۔ دفعتاً کسی نے کہا۔ کیا چندن ہار

نہیں ہے۔؟

مالتی نے رونی صورت بنا کر کہا۔ نہیں۔ چندن ہار تو نہیں آیا۔

ایک بوڑھی عورت نے حیرت کا اظہار کیا۔ ارے چندن ہار نہیں آیا۔

دینڈیال نے اپنی خفت کو چھپاتے ہوئے کہا۔ اور سب چیزیں تو ہیں ایک چندن ہار ہی تو نہیں ہے۔

بوڑھی عورت نے منہ بنا کر کہا۔ "چندن ہار کی بات اور ہی ہے۔"

مالتی نے چڑھاؤ کو سامنے سے ہٹا کر رکھا۔ بیچاری کی تقدیر میں چندن ہار لکھا ہی نہیں ہے۔

تماشائیوں کے اس جھتے کے پیچھے جا لیا امید و بیم کی تصویر سی بنی کھڑی تھی اور سب زیوروں کے نام کان میں آتے تھے۔ چندن ہار کا نام نہ آتا تھا۔ اس کا سینہ دھک دھک کر رہا تھا۔ چندن ہار شاید سب زیوروں کے نیچے ہو۔ ممکن ہے کسی کی نگاہ نہ پڑی ہو۔ یا پیچھے سے کسی اور رسم میں ملے۔ اس طرح وہ دل کو سمجھاتی رہی۔ جب یقین ہو گیا کہ چندن ہار نہیں ہے تو اس کے جگر پر چوٹ سی لگی۔ معلوم ہوا جسم میں ایک قطرہ بھی خون نہیں ہے۔ وہ ایک بے خودی کی حالت میں اپنے کمرہ میں آئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ تمنا جو سات برس پہلے اُس کے دل میں اُگی تھی جو اس وقت پھول اور پتوں سے لدی کھڑی تھی۔ اس پر بجلی گر پڑی۔ اس مایوسی کے عالم میں اُسے ایسا غصہ آ رہا تھا کہ چڑھاوے کو اُٹھا کر پھینک دے۔ کمرے میں ایک طاق پر شیو کی مورت رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اُسے اُٹھا کر اتنے زور سے پٹکا کہ اس کی تمنا ہی کی طرح وہ بھی چور چور ہو گئی۔ اس نے دل میں عہد کیا۔ اب کوئی زیور نہ پہنوں گی۔ زیور پہننے سے ہوتا ہی کیا ہے۔ مفت کی زحمت! جلنے کہاں سے کوڑا کرکٹ اٹھا لائے۔ جس چیز میں روپے خرچ ہونے تھے اس کا نام ہی نہ لیا۔

وہ غصہ میں بھری بیٹھی تھی کہ اس کی تین سہیلیاں آکر کھڑی ہو گئیں۔ جالپا نے انہیں دیکھتے ہی آنکھیں پونچھ ڈالیں اور مسکرانے لگی۔

رادھا بولی۔ بہن تم نے بڑی تپسیا کی تھی۔ ایسا چڑھاوا میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اب تو تیرا کوئی ارمان باقی نہیں رہا۔

جالپا نے لمبی لمبی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف ایسی بیکسانہ نگاہوں سے دیکھا۔ گویا زندگی میں اب اس کے لئے کوئی امید نہیں ہے۔ ہاں بہن سارے ارمان پورے ہو گئے۔

تینوں سہیلیاں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگیں۔ گویا اس جملے کا مطلب ان کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔

بسنتی نے کہا۔ تمہاری ساس بڑی عقلمند معلوم ہوتی ہے۔ کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ ایسا جی چاہتا ہے کہ کاریگر کے ہاتھ چوم لوں۔

رادھا۔ اور تو سب کچھ ہے۔ صرف چندن ہار نہیں ہے۔

شہزادی۔ ایک چندن ہار کے نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اس کے عوض گلوبند تو ہے۔

جالپا نے طنز سے کہا۔ ہاں! آنکھ نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ جسم میں اور سب اعضاء تو ہوتے ہی ہیں۔ آنکھیں ہوئیں تو کیا، نہ ہوئیں تو کیا۔

بچوں کے منہ سے دانشمندی کی باتیں سن کر جیسے ہمیں ہنسی آجاتی ہے۔ اسی طرح جالپا کے منہ سے یہ مایوسانہ الفاظ سن کر رادھا اور بسنتی اپنے تئیں نہ روک سکیں۔ ہاں شہزادی کو ہنسی نہ آئی۔ ایسی زیور کی ہوس اس کے نزدیک ہنسنے کی بات نہیں رونے کی بات تھی۔ مصنوعی ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے بولی وہ سب کے سب نہ جانے کہاں کے دہقان ہیں کہ سب چیزیں تو لائے لیکن چندن ہار نہ لائے جو سب گہنوں کا راجہ ہے۔ ابھی نوشہ صاحب آتے ہیں تو پوچھتی ہوں۔ تم نے یہ کہاں سے ریت نکالی ہے۔ کوئی ایسا ظلم بھی

کرتا ہے؟

رادھا اور بسنتی سہم رہی تھیں کہ جالپا کہیں تاڑ نہ جائے۔ ان کا بس ہوتا تو شہزادی کا منہ بند کردیتیں، مگر جالپا کو شہزادی کے تصنع میں خلوص کا رنگ نظر آرہا تھا۔ آبدیدہ ہوکر بولی ان سے پوچھ کر کیا کروگی۔ جو ہونا تھا سو ہوگیا۔

شہزادی۔ تم پوچھنے کو کہتی ہو۔ میں رلا کر چھوڑوں گی۔ میرے چڑھاؤ میں کنگن نہ آئے تھے۔ اس وقت طبیعت ایسی کھٹی ہوئی کہ سارے زیوروں پر لات ماردوں۔ جب تک کنگن نہ بن گئے میں نیند بھر سوئی نہیں۔

رادھا۔ تو کیا تم سمجھتی ہو۔ چندن ہار ملے گا ہی نہیں۔

شہزادی ملے گا جب ملے گا۔ اس موقعہ پر تو نہیں ملا۔ دس پانچ کی چیز تو ہے نہیں کہ جب چاہا بنوالیا۔ سینکڑوں کا خرچ ہے۔ پھر کاریگر بھی تو ہمیشہ نہیں ملتے۔

جالپا۔ یہی تو میں بھی سوچ رہی ہوں۔ جب آج نہ ملا تو پھر کیا ملے گا۔

رادھا اور بسنتی دونوں شہزادی کو دل میں کوس رہی تھیں۔ اور تنبیہ دکھا رہی تھیں مگر شہزادی کو اس وقت تماشے کا مزا آرہا تھا۔ بولی نہیں یہ بات نہیں ہے۔ بہن! ضد کرنے سے سب کچھ ہوجاتا ہے۔ ساس سسر کو بار بار یاد دلاتی رہنا۔ دولہا صاحب سے بھی دو چار دن روٹھ کر بیٹھنے سے کچھ کام نکل سکتا ہے۔ بس یہی سمجھ لو کہ گھر والے چین نہ لینے پائیں۔ انہیں یقین ہوجائے کہ بغیر چندن ہار بنوائے خیریت نہیں۔ تم ذرا بھی نرم پڑیں اور کام بگڑا۔

رادھا نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ ان سے نہ بنے تو تمہیں بلالیں۔ کیوں؟ اب اٹھوگی یا ساری رات سبق ہی دیتی رہوگی۔

شہزادی۔ چلتی ہوں۔ ایسی کیا بھاگڑ پڑ رہی ہے۔ ہاں! خوب یاد آئی۔ کیوں بہن! تیری اماں جی کے پاس تو بڑا اچھا چندن ہار ہے۔ تجھے نہ دے گی۔

جالپا نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ مجھے تو اس سے کوئی اُمید نہیں ہے بہن!

شہزادی۔ ایک بار کہہ کر دیکھ لو۔ اب کون ان کے پہننے اوڑھنے کے دن ہیں۔

جالپا۔ مجھ سے تو کہا نہ جائے گا۔

شہزادی۔ میں کہہ دوں گی۔

جالپا۔ نہیں۔ تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میں ذرا ان کی ماتا کا امتحان لینا چاہتی ہوں۔

بسنتی نے شہزادی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ معلوم ہوتا ہے تو ساری رات کا بیڑا لے کر آئی ہے۔ چل مجھے پہنچا کر لوٹ آنا۔

شہزادی اُٹھی۔ مگر جالپا نے راستہ روک لیا۔ اور بولی۔ نہیں ابھی بیٹھو بہن! تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔

شہزادی۔ جب یہ دونوں چڑیلیں بیٹھنے بھی دیں۔ میں تو تمہیں گر سکھاتی ہوں اور یہ دونوں جھلاتی ہیں۔

بسنتی۔ تو بِش کی گانٹھ ہے۔

شہزادی۔ تم بھی تو سُسرال سے سال بھر بعد آئی ہو۔ کون کون سی نئی چیزیں بنوا کر لائیں؟

بسنتی۔ اور تم نے تین سال میں کیا بنوا لیا۔

شہزادی۔ میری بات چھوڑو۔ میرا خصم تو میری بات ہی نہیں پوچھتا۔

رادھا۔ محبت کے سامنے زیوروں کی کوئی حقیقت نہیں۔

شہزادی۔ تو وہ سوکھی محبت تمہیں مُبارک رہے۔

اتنے میں مانکی نے آن کر کہا۔ تم تینوں یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ چلو وہاں لوگ کھانا کھانے آ رہے ہیں۔ تینوں سہیلیاں چلی گئیں۔ جالپا ماں کے گلے میں چندن ہار کی دو نق دیکھ کر

سوچنے لگی۔ ان زیوروں سے ان کی طبیعت اب تک سیر نہیں ہوئی۔

(۶)

بابو دیاناتھ جتنے حوصلے سے شادی کرنے گئے تھے۔ اتنے ہی خاطر شکستہ ہو کر لوٹے دینڈیال کی فیاضی میں شبہ نہیں۔ لیکن وہاں سے جو کچھ ملا، وہ سب وہیں خرچ ہو گیا۔ بار بار اپنی غلطی پر پچھتاتے۔ کیوں نمود نمائش میں اتنے روپئے خرچ کر دیئے۔ زیادہ سے زیادہ لوگ یہی کہتے کہ یہ حضرت بڑے بخیل ہیں۔ اتنا سُن لینے میں کیا نقصان تھا اور سبھی تقاضے تو پانچ دس دن میں ٹل سکتے تھے۔ مگر صراف کسی طرح نہ مانتا تھا۔ اس سے شادی کے ساتویں دن ایک ہزار روپے دینے کا وعدہ تھا۔ ساتویں دن صراف آ گیا۔ مگر یہاں روپے کہاں تھے۔ دیاناتھ میں للّو چپو کی عادت نہ تھی۔ مگر ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ انہوں نے اسے چکمہ دینے کی خوب کوشش کی۔ چھ مہینے میں باقساط زر بیراادا کرنے کا وعدہ کیا۔ پھر تین مہینے پر آئے مگر صراف بھی ایک گُھٹا ہوا۔ اسی وقت ٹلا۔ جب دیاناتھ نے تیسرے دن باقی رقم کے زیور واپس کر دینے کا وعدہ کیا۔ آخر وہ تیسرا دن بھی آ گیا اور اب دیاناتھ کو اپنی لاج رکھنے کی کوئی ترکیب نہ سوجھتی تھی۔ کوئی چلتا ہوا آدمی شاید اتنا پریشان نہ ہوتا۔ حیلے حوالے کر کے مہاجن کو مہینوں ٹالتا رہا۔ لیکن دیاناتھ اس معاملہ میں اناڑی تھے۔

باگیشری نے آ کر کہا۔ کھانا کب سے پکا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ کھا کیوں نہیں لیتے۔

دیاناتھ نے اس طرح گردن اٹھائی۔ گویا سر پر سینکڑوں من کا بوجھ لدا ہوا ہے اور بولے تم جا کر کھا لو۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔

باگیشری۔ بھوک کیوں نہیں ہے۔ رات بھی تو کچھ نہیں کھایا تھا۔ یوں دانہ پانی چھوڑ دینے سے مہاجن کے روپے تھوڑے ہی ادا ہو جائیں گے۔

دیاناتھ۔ یہی سوچتا ہوں۔ اسے آج کیا جواب دونگا۔ میں تو یہ شادی کر کے بُرا پھنسا۔

بہو کچھ زیور لوٹا تو دے گی۔

باگیشری۔ بہو کا حال تو سن چکے۔ پھر بھی اس سے ایسی امید رکھتے ہو۔ اس کی ٹیک ہے کہ جب تک چندن ہار نہ بن جائے گا کوئی گہنہ نہ پہنوں گی۔ ساری چیزیں صندوق میں بند کر رکھی ہیں۔ بس ایک وہی بلوریں ہار گلے میں ڈالے ہوئے ہے۔ بہوئیں بہت دیکھی ہیں مگر ایسی بہو نہ دیکھی تھی۔ پھر کتنا برا معلوم ہوتا ہے کہ کل کی آئی بہو اس سے گہنے مانگ لئے جائیں۔

دیاناتھ نے چڑ کر کہا۔ تم تو جلے پر نمک چھڑکتی ہو۔ برا معلوم ہوتا ہے تو لاؤ روپے نکال کر دے دو۔ دیتی ہو۔ برا مجھے خود معلوم ہوتا ہے۔ مگر تدبیر کیا ہے۔ گلا کیسے چھوٹے۔

باگیشری۔ بیٹے کا بیاہ کیا ہے یا مذاق ہے۔ شادی بیاہ میں سبھی قرض لیتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ پارسا بننے کا کچھ سبق ملنا چاہیئے یا نہیں۔ تمہارے ہی دوست لالہ سبتہ دیو ہیں۔ پکا مکان کھڑا کر لیا۔ زمینداری خریدی۔ بیٹی کی شادی میں کچھ نہیں تو پانچ ہزار تو خرچ کئے ہوں گے اور تم اپنی پارسائی لئے پھرتے ہو۔

دیاناتھ۔ جبھی دونوں لڑکے بھی تو چل دیئے۔

باگیشری۔ مرنا جینا تو دنیا کا طریق ہے۔ جو لیتے ہیں وہ بھی مرتے ہیں جو نہیں لیتے وہ بھی مرتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو چھ مہینے میں سب روپے چکا سکتے ہو۔

دیاناتھ نے تیوری بڑھا کر کہا۔ جو بات زندگی بھر نہیں کی۔ وہ اب آخری وقت نہیں کر سکتا۔ بہو سے گھر کا حال صاف صاف کہہ دو۔ اس سے پردہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اور پردہ رہ ہی کتنے دن سکتا ہے۔ بس تین چار چیزیں لوٹا دے۔ تم اسے ایک بار کہو تو۔

باگیشری جھنجلا کر بولی۔ اس سے تمہیں کہو۔ مجھ سے نہ کہا جائے گا۔

اسی وقت رماناتھ ٹینس ریکٹ لئے باہر سے آیا۔ جسم پر سفید ٹینس شرٹ تھا۔ سفید پتلون۔ کینوس کا جوتا۔ خوش رو آدمی تھا۔ اس لباس سے رئیس زادوں کی شان

پیدا کر دی تھی۔ رومال میں بیلے کے گجرے لئے ہوئے تھا۔ اس سے خوشبو اڑ رہی تھی۔ ماں باپ کی آنکھیں بچا کر زینہ پر جانا چاہتا تھا کہ باگیشری نے ٹوکا۔ کہاں جاتے ہو۔ تم نے ناحق تماشے میں بارہ تیرہ سو روپے اڑا دیئے۔ بتلاؤ صراف کو کیا جواب دیا جائے۔

رما ناتھ نے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ میں نے روپے اڑا دیئے۔ میں نے بابو جی کے حکم بغیر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔

حقیقت بھی یہی تھی۔ اگر دیا ناتھ کی مرضی نہ ہوتی۔ تو رما کیا کر سکتا تھا۔ جو کچھ ہوا۔ ان کی رضا مندی سے ہوا۔

دیا ناتھ نے اس قول کی تائید کی۔ میں تمہیں الزام نہیں دیتا بھائی۔ کیا تو میں نے ہی۔ مگر یہ بلا تو کسی طرح سر سے ٹالنی چاہیئے۔ صراف کا تقاضا ہے۔ میرے سمجھ میں یہی ایک تدبیر ہے کہ باقی رہ پیوں کے زیور واپس کر دئے جائیں۔ تمہاری کیا صلاح ہے۔

رما نے شرماتے ہوئے کہا۔ میں اس معاملہ میں کیا صلاح دے سکتا ہوں۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس تجویز کو وہ خوشی سے منظور نہ کرے گی۔

باگیشری نے خوش ہو کر کہا۔ یہی تو میں ان سے کہہ رہی ہوں۔

ورنہ رونا دھونا شروع ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی گھر کا پردہ بھی کھل جائے گا۔

دیا ناتھ نے آزردہ خاطر ہو کر کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس سے پردہ رکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ اپنی اصلی حالت کا اسے جتنی جلدی علم ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

رما ناتھ نے عام نوجوانوں کی طرح جالپا سے خوب زیٹ اڑائی تھی۔ خوب بڑھ بڑھ کو باتیں بنائی تھیں۔ زمینداری ہے۔ اس سے کئی ہزار کا نفع ہے۔ بینک میں روپے ہیں سود آتا ہے۔ بولا۔ آپ کا فرمانا درست ہے۔ پر اتنی جلدی بھرم کھل جانے کا نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ ہمیں ذلیل سمجھنے لگے گی۔

دیا ناتھ۔ ہم نے دینِدیال سے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ ہم لکھ پتی ہیں۔

رما۔ تو آپ نے یہی کب کہا تھا کہ جا کر پرزیور لائیں گے اور دو چار دن میں لوٹا دیں گے۔ آخر یہ سارا سوانگ اپنی دھاک بٹھانے کے لئے ہی تو کیا تھا یا کچھ اور۔

نہ دیا تو پھر کچھ دوسرا بہانہ کرنا پڑے گا۔ دوسری کوئی تدبیر نہیں۔ کل یا تو روپے دینے پڑیں گے یا زیور واپس کرنے پڑیں گے۔

باگیشری۔ اور کونسا بہانہ کیا جائے گا۔ اگر کہا جائے کسی کو مانگے دینا ہے، تو شاید وہ دے ہی نہیں۔ دیا ناتھ کو ایک حکمت سوجھی۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ان زیوروں کے بدلے ملمع کی چیزیں دے دی جائیں۔ مگر فوراً ہی خیال آگیا کہ یہ بچربات ہے، خود ہی اس کی تردید کی اور بولے۔ کیوں نہ ساری حالت اسے سمجھا دی جائے۔ ذرا کے لئے اسے رنج تو ہوگا۔ لیکن ہمیشہ کے لئے راستہ صاف ہو جائے گا۔

لیکن اس میں رما ناتھ کی کرکری ہوتی تھی۔ پھر تو اسے منہ دکھانے کی بھی جگہ نہ رہے گی۔ جب وہ پوچھے گی۔ تمہاری زمینداری کیا ہوئی۔ بینک کے روپے کیا ہوئے۔ تو وہ کیا جواب دے گا؟ رنجیدہ ہو کر بولا۔ اس میں سراسر بے عزتی ہے۔ کیا آپ صراف کو دو چار مہینے بھی نہیں ٹال سکتے۔

دیا ناتھ۔ غیر ممکن۔

تینوں کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ دیا نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ چونکہ ماں اور بیٹے کو یہ فیصلہ منظور نہ تھا۔ اس لئے اب اس گتھی کو سلجھانے کا بار بھی انہیں دونوں پر تھا۔ باگیشری نے تو طے کر لیا تھا کہ دیا ناتھ کو تھپک مار کر اپنی پارسائی کو رخصت کرنا پڑے گا۔ یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ ہمارے اوپر بوجھ لدا ہوا ہو اور ہم دھرم کا راگ الاپتے جائیں۔ مگر رما ناتھ جانتا تھا کہ والد نے جو کام اپنی زندگی میں کبھی نہیں کیا وہ آج نہ کریں گے۔ وہ بغیر پس و پیش کے جالپا سے زیور مانگ بیٹھیں گے اور وہ

یہ نہ چاہتا تھا۔ وہ اب پچھتا رہا تھا کہ کیوں جا لپا سے ڈینگیں ماریں۔ اس وقت اسے ذرا بھی فکر نہ تھی کہ ایک دن سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ دروغ دور اندیش نہیں ہوتا لیکن وہ دن اتنے جلد آئے گا۔ یہ کون جانتا تھا۔ اگر اس نے جھوٹا وقار نہ جمایا ہوتا تو باگیشری کی طرح وہ بھی سارا بار دیا ناتھ پر چھوڑ کر بے فکر ہو جاتا۔ لیکن اس وقت وہ اپنے ہی بنائے ہوئے جال میں پھنس گیا تھا۔ کیسے نکلے؟

اس نے کتنی ہی تدبیریں سوچیں۔ لیکن ایسی کوئی نہ تھی۔ جو آگے چل کر اسے الجھن میں نہ ڈال دیتی۔ یکایک اسے ایک چال سوجھ گئی۔ اس کا دل اچھل پڑا۔ لیکن جا لپا کے ساتھ دغا یا فریب کرنے کا خیال بھی اسے ذلت آمیز معلوم ہوا۔

دیا ناتھ نے پوچھا۔ کوئی تدبیر سوجھی۔

"مجھے تو کچھ نہیں سوجھتا۔"

"مگر کوئی تدبیر تو سوچنی ہی پڑے گی۔ کیوں اس سے دو چار عدد مانگ نہیں لیتے۔ یہ تو ایسا مشکل کام نہیں۔"

"مجھے شرم آتی ہے۔"

"تم بھی عجیب آدمی ہو۔ نہ خود مانگو گے نہ مجھے مانگنے دو گے۔ تو آخر یہ ڈرے گا کیسے پار لگے گا۔ میں تم سے ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے کوئی امید نہ رکھنا۔ اپنی زندگی کے آخری دن جیل میں نہیں کاٹنا چاہتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ کس کی زندگی میں ایسے موقع نہیں آتے۔ تمہیں اپنی ماں سے پوچھو۔"

باگیشری نے اس کی تائید کی۔ مجھ سے تو یہ نہیں دیکھا جاتا تھا کہ گھر کے لوگ پریشان ہوں اور میں زیور پہنے بیٹھی رہوں۔ نہیں تو آج میرے پاس گہنے ہوتے۔ شادی میں پانچ ہزار سے کم کا چڑھاوا نہیں گیا تھا۔ مگر پانچ ہی سال میں سب صاف ہو گیا۔

دیا ناتھ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "شرم کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔"

رما ناتھ نے جھینپتے ہوئے کہا "مانگ تو میں بھی نہیں سکتا۔ ہاں! کہیئے اٹھا لاؤں ؟"

دیا ناتھ نے حیرت میں آکر پوچھا "اٹھا لاؤ گے اس سے چھپا کر ؟"

رما نے ترش ہو کر کہا "اور آپ کیا سمجھ رہے ہیں ؟"

دیا ناتھ نے پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا۔ اور ایک لمحے کے بعد بولے۔ "نہیں میں نے چال کبھی نہیں کیا اور نہ کبھی کروں گا۔ چال کروں اپنی بہو کے ساتھ۔ چھی، چھی، جو کام آسانی سے ہو سکتا ہے اس کے لئے فریب! کہیں اس کی نگاہ پڑ گئی۔ تو تمہیں دل میں کیا سمجھے گی۔ مانگ لینا اس سے کہیں بہتر ہے۔"

رما نے کہا۔ "آپ کو اس سے کیا مطلب! مجھ سے چیزیں لے لیجئے گا مگر جب آپ جانتے تھے کہ ایک دن یہ نوبت آئے گی۔ تو اتنے زیور لے جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ مفت کا درد سر مول لیا۔ اس کھانے سے کیا فائدہ کہ پیٹ میں درد ہونے لگے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ نے کوئی راستہ نکال لیا ہوگا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ زحمت میرے سر ڈالدیں گے۔ ورنہ میں ان تمام چیزوں کو کبھی نہ لے جانے دیتا۔ یہی تو ہوتا کہ ادھر والوں کو شکایت ہوتی۔ مگر شکایتوں سے ہمارا کیا نقصان تھا۔ یہ تو گناہ بے لذت ہوا۔ بدنامی الگ ہوئی۔ پریشانی الگ۔ میں یہ نہیں دکھانا چاہتا کہ ہم سب اتنے پھٹے حال ہیں۔ چوری ہو جانے پر تو صبر کرنا ہی پڑے گا۔"

دیا ناتھ چپ ہو گئے۔ اس جوش میں رما نے انہیں خوب کھری کھری سنائیں اور وہ چپ چاپ سنتے رہے۔ آخر جب نہ سنا گیا تو اٹھ کر پھر کتب خانے میں چلے گئے۔ یہ ان کا روز کا دستور تھا۔ جب تک دو چار رسالے نہ پڑھ لیں۔ ان کا کھانا ہضم نہ ہوتا تھا۔ اسی گوشۂ عافیت میں پہنچکر وہ گھر کی فکروں سے آزاد ہو جاتے تھے۔

آخر رما بھی وہاں سے اٹھا پر جالپا کے پاس نہ جا کر اپنے کمرے میں گیا۔ اس کا

کوئی کمرہ الگ تو تھا نہیں۔ ایک ہی مردانہ کمرہ تھا۔ اسی میں دیا ناتھ آپنے دوستوں سے گپ شپ کرتے۔ دونوں لڑکے پڑھتے اور رما احباب کے ساتھ شطرنج کھیلتا رہا کرے میں پہنچا تو دیکھا۔ دونوں لڑکے تاش کھیل رہے ہیں۔ گوپی کا تیرھواں سال تھا۔ بشمبھر کا نواں۔ دونوں رما سے تھر تھر کانپتے تھے۔ رما خود خوب تاش اور شطرنج کھیلتا۔ مگر بھائیوں کو کھیلتے دیکھ کر اس کے ہاتھ میں کھجلی ہونے لگتی تھی۔ خود چاہے دن بھر سیر سپاٹے کیا کرے مگر کیا مجال کہ دونوں بھائیوں میں سے کوئی باہر نکلے۔ دیا ناتھ خود لڑکوں کو کبھی نہ مارتے تھے۔ موقع ملتا تو ان کے ساتھ کھیلتے تھے۔ انہیں کنکوے اُڑاتے دیکھ کر ان کی بچپن کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ دو چار پینچ لڑا دیتے۔ اس لئے لڑکے رما سے جتنا ڈرتے تھے اتنا ہی باپ سے محبت کرتے تھے۔

رما کو دیکھتے ہی لڑکوں نے تاش کو ٹاٹ کے نیچے چھپا دیا۔ اور پڑھنے لگے مگر کن انکھیوں سے سر پر پڑنے والی چپت کا انتظار کر رہے تھے۔

رما نے مونڈھے پر بیٹھ کر گوپی ناتھ سے کہا۔ تم نے بھنگ کی دکان دیکھی ہے نہ کڑبڑ۔

گوپی ناتھ خوش ہو کر بولا۔ ہاں! دیکھی کیوں نہیں۔

جا کر چار پیسے کا معجون لے لو۔ اور آدھ سیر مٹھائی بھی لیتے آنا۔

گوپی روپیہ لے کر بازار چلا گیا۔

(۷)

رات کے دس بج گئے تھے۔ جالپا کھلی چھت پر لیٹی ہوئی تھی۔ جیٹھ کی مدھم چاندنی رات میں سامنے گنبد۔ مینار اور درخت۔ خواب کی تصویروں سے معلوم ہوتے تھے جالپا کی آنکھیں چاند کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں چاند کی

طرف اڑی جا رہی ہو۔ اُسے اپنی ناک میں کھجلی۔ آنکھوں میں جلن اور سر میں چکر کا احساس ہو رہا تھا۔ کوئی بات ذہن میں آتے ہی بھول جاتی اور بہت یاد کرنے پر بھی یاد نہ آتی۔ ایک بار گھر کی یاد آئی۔ رونے لگی۔ ایک ہی لمحہ میں سہیلیوں کی یاد آگئی ہنسنے لگی۔

دفعتاً رمانا تھ ایک پوٹلی لئے مسکراتا ہوا آیا اور چار پائی پر بیٹھ گیا۔

جالپا نے اُٹھ کر پوچھا۔ پوٹلی میں کیا ہے۔

بوجھ جاؤ تو جانوں۔

ہنسی کا گول گیا ہے۔ یہ کہہ کر ہنسنے لگی۔

"غلط۔"

"تو پریم کی تیاری ہوگی۔"

رما نے کہا۔ ٹھیک آج میں تمہیں پھولوں کی دیوی بناؤں گا۔

جالپا کھل اٹھی۔ رمانے بڑے شوق سے اُسے پھولوں کے زیور پہنانے شروع کئے۔ پھولوں کے نازک اور طراوٹ آمیز احساس سے جالپا کا تنِ نازک میں گدگدی سی ہونے لگی۔ انہیں پھولوں کی طرح اس کے جسم کا ایک ایک ذرہ کھل اُٹھا۔

رمانے مسکرا کر کہا۔ کیا انعام دیتی ہو؟

جالپا نے کچھ جواب نہ دیا۔ سامنے کمرے میں لیمپ جل رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر کمرے میں گئی۔ اور آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ نشہ کے ترنگ میں کچھ ایسا ہوا کہ میں سچ مچ پھولوں کی دیوی ہوں وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔

رما کو اس وقت اپنی دغا بازی پر ندامت ہو رہی تھی۔ جالپا نے کمرے سے لوٹ کر اس کی طرف مخمور نگاہوں سے دیکھا۔ تو اس نے منہ پھیر لیا۔ ان بے لوث اور پر اعتقاد آنکھوں کے سامنے وہ آنکھیں نہ اٹھا سکا۔

جالپا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ میرے بابوجی تمہیں دیکھ کر گئے۔ اور

اماں سے تمہاری تعریف کرنے لگے۔ تو میں سوچتی تھی۔ تم کیسے ہو گے۔ دل میں طرح طرح کی تصویریں آتی تھیں۔

رمانا تھ نے ایک لمبی سانس کھینچی اور کچھ جواب نہ دیا۔

جالپا نے اسی سادگی کے انداز سے کہا۔ میری سہیلیاں تمہیں دیکھ کر لبھائیں۔ شہزادی تو کھڑکی کے سامنے سے ہٹتی ہی نہ تھی۔ جب تم اندر گئے تھے تو اسی نے تمہیں پان کے بیڑے دیئے تھے۔ یاد ہے؟

رمانے کوئی جواب نہ دیا۔ جالپا پھر بولی۔ اجی وہی جو رنگ روپ میں سب سے اچھی تھی۔ جب تم نے اس کی طرف رسیلی آنکھوں سے دیکھا تو بےچاری شرم کے مارے گڑ گئی۔ مجھ سے کہنے لگی۔ جیجا تو بڑے رنگین مزاج معلوم ہوتے ہیں۔ سہیلیوں نے اسے خوب چڑایا۔ یاد ہے؟

رمانا تھ نے گویا ندی میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ "مجھے یاد نہیں آتا۔"

اچھا اب کے چلو گے تو دکھا دوں گی۔ "آج تم بازار گئے تھے کہ نہیں۔"

رمانے سر جھکا کر کہا۔ "آج تو فرصت نہیں ملی۔"

"جاؤ۔ میں تم سے نہ بولوں گی۔ روز حیلے حوالے کرتے ہو۔ اچھا کل تو لا دو گے؟"

رمانا تھ کا دل مسوس اٹھا۔ یہ غریب چندن ہار کے لئے اس قدر بیتاب ہو رہی ہے اسے کیا خبر؟ بخت نارسا اسے تباہ کرنے کا سامان کر رہا ہے۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔ چاند کسی چور کی طرح ایک درخت کی آڑ سے جھانک رہا تھا جالپا شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے مستِ خواب تھی۔ رما آہستہ سے اٹھا۔ مگر نیند کی گود میں سوئی ہوئی نازنین نے اسے متلون کر دیا۔ وہ ایک لمحہ تک کھڑا ہفتوں نظروں سے جالپا کی طرف دیکھتا رہا۔ نیند میں وہ پھول کتنا شگفتہ ہو گیا تھا۔ کمرے سے اندر قدم نہ رکھ سکا۔ پھر لیٹ گیا۔

جالپا نے چونک کر پوچھا۔ کہاں جاتے ہو۔ کیا سویرا ہوگیا؟

"ابھی تو بڑی رات ہے۔"

"تو تم بیٹھے کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں۔ ذرا پانی پینے گیا تھا۔"

جالپا نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے اور اُسے سُلا کر کہا۔ تم اس طرح مجھ پر ٹونا کرو گے تو میں بھاگ جاؤں گی۔ بسنتی سچ کہتی تھی۔ مردوں کی آنکھوں میں جادو ہوتا ہے رما ناتھ نے روتے ہوئے دل کو سمجھا کر کہا۔ "کیا کروں۔ آنکھوں کی پیاس نہیں بجھتی۔" دونوں پھر لیٹے۔ ایک اُلفت میں متوالی۔ دوسرا فکر کے سمندر میں ڈوبا ہوا۔ تین گھنٹے اور گذر گئے۔ دو اوشی کے چاند نے اپنا چراغ بجھا دیا۔ آدھی رات تک جاگنے والا باز ابھی سو گیا۔ صرف رما ابھی تک جاگ رہا تھا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے کے باعث وہ بار بار اُٹھتا تھا اور پھر لیٹ جاتا تھا۔ آخر جب چار بجے کی آواز کان میں آئی۔ تو گھبرا کر اٹھا اور کمرے میں جا پہنچا۔ زیوروں کا صندوقچہ الماری میں رکھا ہوا تھا۔ رما نے اسے اٹھا لیا اور تھر تھر کانپتا ہوا اسے لے کر نیچے اتر گیا۔ اس عجلت میں اسے اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ چار چیزیں چھانٹ کر نکال لے۔

دیانا تھ نیچے برآمدے میں سو رہے تھے۔ رما نے انہیں آہستہ سے جگایا۔ انہوں نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔ کون؟

رما نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہا۔ میں ہوں۔ یہ صندوقچی اٹھا لایا۔ رکھ لیجئے۔

دیا ناتھ صورت حال سمجھ گئے۔ رما ناتھ نے جس وقت ان سے زیوروں کے اٹھا لانے کا ذکر کیا تھا۔ انہوں نے سمجھا تھا کہ یہ محض چہلے کر رہا ہے۔ انہیں اس کا یقین نہ آیا تھا کہ یہ ارادے کو پورا کر دکھائے گا۔ ایسی کمینہ حرکتوں سے وہ علیحدہ رہنا چاہتا تھا۔ پوچھا اسے کیوں اٹھا لائے؟

"آپ نے ہی تو فرمایا تھا۔"

"جھوٹ کہتے ہو۔"

"تو کیا پھر رکھ آؤں۔"

رما ناتھ کے اس سوال نے منشی جی کو مخمصہ میں ڈال دیا۔ جھینپتے ہوئے بولے۔ اب کیا رکھ آؤ گے۔ کہیں دیکھ لے تو غضب ہی ہو جائے۔ وہی کام کرو گے جس میں رسوائی ہو۔ اب کھڑے کیا ہو۔ صندوقچی میرے بڑے صندوق میں رکھ آؤ اور جا کر لیٹ رہو۔

برآمدے کے پیچھے دیا ناتھ کا کمرہ تھا۔ اس میں دیار کا ایک پرانا صندوق رکھا ہوا تھا۔ رما نے صندوقچی اس کے اندر رکھ دی اور بڑی تیزی سے اوپر چلا گیا۔ چھت پر پہنچ کر اس نے آہٹ لی۔ جالپا ابھی پچھلے پہر کے خواب نوشیں کے مزے لے رہی تھی۔

رما چوں ہی چارپائی پہ بیٹھا۔ جالپا چونک کر اس سے چمٹ گئی۔

رما نے پوچھا کیا ہے۔ تم کیوں چونک پڑیں۔

جالپا نے ادھر ادھر شبہ آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ کچھ نہیں ایک خواب دیکھ رہی تھی۔ کتنی رات ہے ابھی۔

رما نے لیٹتے ہوئے کہا۔ سویرا ہو رہا ہے کیا خواب دیکھتی تھیں۔

جالپا نے شرماتے ہوئے کہا۔ جیسے کوئی چور میرے گہنوں کی صندوقچی اٹھائے لئے جاتا ہو۔

رما کا دل اتنے زور زور سے دھک دھک کرنے لگا کہ گویا اس پر ہتھوڑے پڑ رہے ہوں۔ خون سرد ہو گیا۔ وہ زور سے چلا اٹھا۔ چور! چور!

نیچے برآمدے میں منشی جی بھی چلا اٹھے۔ چور! چور!

جالپا گھبرا کر اٹھی۔ دوڑی ہوئی کمرے میں گئی۔ ایک جھٹکے میں الماری کھولی۔ صندوقچی

وہاں موجود نہ تھی۔ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

(۸)

صبح ہوتے ہی دیا ناتھ گہنے لے کر صراف کے پاس پہنچے اور حساب ہونے لگا۔ صراف کے پندرہ سو روپے آتے تھے۔ مگر وہ صرف پندرہ سو روپیہ کے زیور رکھ کر راضی نہ ہوا۔ بکے ہوئے زیوروں کو وہ بٹے پر ہی لے سکتا تھا۔ بکی ہوئی چیز کون واپس لیتا ہے۔ جا کر ٹاپر دیئے ہوتے تو دوسری بات تھی۔ ان چیزوں کا تو سودا ہو چکا تھا۔ اس نے کچھ ایسے "تاجرانہ اصول کی باتیں کیں اور دیا ناتھ کو کچھ ایسا شکنجہ میں کسا کہ بے چارے کو ہاں ہاں کرنے کے سوا اور کچھ نہ سوجھی۔ دفتر کا بابو شاطر دوکاندار سے کیا جیت پاتا۔ پندرہ سو میں ڈھائی ہزار کے گہنے بھی چلے گئے۔ اوپر سے پچاس روپے اور باقی رہ گئے۔ اس مسئلے پر باپ بیٹے میں کئی دن خوب مباحثے ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کو الزام دیتے کئی دن آپس میں بول چال بند رہی۔ مگر اس چوری کا حال پوشیدہ رکھا گیا۔ پولیس کو خبر ہو جاتی تو بھانڈا پھوٹ جاتا۔ جالپا سے یہی کہا گیا کہ مال تو دستیاب نہ ہوگا۔ مفت کی زحمت ہوگی۔

جالپا کو زیوروں سے جتنی الفت تھی۔ اتنی شاید دنیا کی اور کسی چیز سے نہ تھی۔ اور اس میں تعجب کی کونسی بات تھی۔ جب وہ تین سال کی نادان بچی تھی۔ اس وقت اس کے لئے سونے کے جوڑے بنوائے گئے تھے۔ دادی جب اسکو گود میں کھلانے لگتی تو زیوروں ہی کی چرچا کرتی۔ تیرا دولہا تیرے لئے اچھے گہنے لائے گا۔ تو ٹھمک ٹھمک کر چلے گی۔

جالپا پوچھتی۔ چاندی کے ہوں گے یا سونے کے دادی۔

دادی کہتی سونے کے ہونگے بیٹی۔ چاندی کے کیوں لائے گا؟ چاندی کے لائے

تو تم اٹھا کر اس کے منہ پر ٹپک دینا۔

مانکی چیڑ کر کہتی۔ چاندی کے تولائے گا ہی! سونے کے اُسے کہاں ملے جاتے ہیں۔

جالپا رونے لگتی۔ اس بوڑھی دادی۔ مانکی۔ گھر کی مہریاں۔ پڑوسنیں اور دینڈیال سب ہنس پڑتے۔ ان لوگوں کی تفریح کا یہ زوال سرچشمہ تھا۔

لڑکی جب ذرا اور سیانی ہوئی۔ تو گڑیوں کے بیاہ رچانے لگی۔ لڑکے کی طرف سے چڑھاوے آتے۔ وہ دلہن کو گہنے پہناتی اور ڈولی میں بٹھا کر رخصت کرتی۔ کبھی کبھی دلہن گڑیا اپنے دولہا گڈے سے زیوروں کے لئے روٹھ جاتی۔ گڈا بے چارہ کہیں نہ کہیں سے زیور لا کر دلہن کو خوش کرتا تھا۔ انہیں دنوں بساطی نے اسے وہ چندن ہار دیا۔ جو اب تک اس کے پاس محفوظ تھا۔

جب ذرا بڑی ہوئی۔ تو بڑی بوڑھیوں میں بیٹھ کر زیوروں کے چرچے سننے لگی۔ عورتوں کی اس چھوٹی سی دنیا میں اس کے سوا اور کوئی مشغلہ ہی نہ تھا۔ کس نے کون کون سے زیور بنوائے کتنا صرف ہوا؟ ٹھوس ہیں یا پولے؟ جڑاؤ ہیں یا سادے؟ سونے کے ہیں یا چاندی کے انہیں اہم مسائل پر ہمیشہ تنقید و تبصرے ہوتے رہتے تھے۔ کوئی دوسرا تذکرہ اتنا دلچسپ اتنا مزے دار ہو ہی نہ سکتا تھا۔

اس مرقع دنیا میں پلی ہوئی جالپا کی یہ زیور پسندی بالکل فطری تھی مہینہ بھر سے زیادہ ہو گیا۔ پر ابھی اس کا زخم تازہ ہے۔ برائے نام کچھ کھا پی لیتی ہے۔ برائے نام ہنس بول لیتی ہے۔ دن بھر چارپائی پر پڑی ہوئی آسمان کی طرف تاکتی رہتی ہے۔ سارا گھر سمجھا کر ہار گیا۔ پڑوسنیں سمجھا کر ہار گئیں۔ دینڈیال آ کر سمجھا گئے۔ پر جالپا کے درد میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اسے اب گھر میں کسی پر اعتبار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ رما سے بھی کھچی ہوئی رہتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے سارا گھر اس سے بے اعتنائی کر رہا ہے۔ سب کے سب اس کی جان کے گاہک ہو رہے ہیں۔ جب ان کے پاس اتنی دولت ہے تو پھر اس کے گہنوں کو کیوں نہیں

بنوا دیتے ۔ جس سے ہم سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں ۔ اسی پر سب سے زیادہ ناراض بھی ہوتے ہیں جالپا کو سب سے زیادہ غصہ رما ناتھ پر تھا ۔ اگر یہ اپنے ماں باپ سے زور دے کر کہتے تو کوئی ان کی بات نہ ٹال سکتا ۔ مگر یہ کچھ کہیں بھی ان کے منہ میں تو دہی جما یا ہوا ہے ۔ مجھ سے محبت ہوتی تو یوں بے فکر نہ بیٹھے رہتے ۔ جب تک ساری چیزیں نہ بنوا لیتے رات کو نیند نہ آتی ۔ آخر جائیں گے تو اپنی ہی طرف ! میں کون ہوں ۔

وہ رما سے صرف کبیدہ خاطر ہی نہ رہتی ۔ وہ اس کی دلجوئی کرتا تو دو چار جلی کٹی سنا دیتی ۔ بے چارہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ۔ غریب اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جلا جاتا تھا اگر وہ جانتا کہ اس کی ڈینگوں کا یہ نتیجہ ہوگا ، تو زبان پر مہر لگا لیتا ۔ یہ غم اس کے لئے سوہانِ روح ہو رہا تھا ۔ کہاں صبح سے شام تک ہنسی ، قہقہہ ، سیر سپاٹے میں کٹتے تھے ۔ کہاں اب نوکری کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا ۔ ساری مستی غائب ہو گئی ۔ تین ہزار کے زیور کیسے بنیں گے ؟ اگر نوکر بھی ہوا تو ایسا کون سا بڑا عہدہ مل جائے گا ۔ تین ہزار تو شاید تین جنموں میں بھی نہ جمع ہوں ۔ وہ کوئی ایسی تدبیر سوچ نکالنا چاہتا تھا جس سے وہ جلد سے جلد بے حساب دولت کا مالک ہو جائے ۔ کہیں اس کے نام کوئی لاٹری نکل آتی ۔ تو پھر تو وہ جالپا کو زیوروں سے مڑھ دیتا ۔ سب سے پہلے چندن ہار بنواتا ۔ اس میں ہیرے جڑوا دیتا ۔ اگر آج اسے جعلی نوٹ بنانا آجاتا تو ضرور بنا کر چلا جاتا ۔

ایک دن وہ شام تک نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا ۔ شطرنج کی بدولت اس کے کتنے ہی اچھے اچھے آدمیوں سے یارانہ ہو گیا تھا ۔ لیکن وہ شرم و لحاظ کے مارے کسی سے اظہار نہ کرتا ۔ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ خاطر داریاں اسی وقت تک ہیں جب تک وہ کسی سے اظہار حال نہ کرتا ۔ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ خاطر داریاں اسی وقت تک ہیں جب تک وہ کسی کے سامنے مدد کے لئے جال نہیں پھیلاتا ۔ یہ آن ٹوٹی تو پھر کوئی بات نہ پوچھے گا کوئی ایسا نکتہ اس آدمی میں نہ نظر آتا تھا جو ساری کیفیت بتانے سے "تاڑ جائے اور

اُسے کوئی معقول جگہ دلوادے۔ آج وہ بہت رنجیدہ تھا۔ دوستوں پر ایسا غصہ آرہا تھا کہ ایک ایک کو پھٹکارے اور آئیں تو دروازے سے ہی دھتکارے۔ مگر وہ ذرا غور کرتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اس معاملے میں دوستوں کا اتنا قصور نہ تھا۔ جتنا منبوا س کا کوئی ایسا دوست نہ تھا۔ جس سے اس نے بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بنائی ہوں۔ یہ اس کی عادت تھی۔ مگر گھر کی اصلی کیفیت کو وہ بدنامی کے داغ کی طرح چھپاتا رہا۔ اور اب وہ کسی سے اپنا دردِ دل نہیں کہہ سکتا۔ گھر میں آکر منہ لٹکائے ہوئے بیٹھ گیا۔

باگیشری نے پانی لاکر رکھ دیا۔ اور پوچھا۔ آج تم دن بھر کہاں رہے بیٹا؟ ہاتھ منہ دھو ڈالو۔

رمانے لوٹا اٹھایا ہی تھا کہ جالپانے آکر تند لہجے میں کہا "مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ اسی وقت۔"

رمانے لوٹا رکھ دیا۔ اور اس کی طرف اس طرح تاکنے لگا۔ گویا اس کی بات سمجھ میں نہ آئی ہو۔

باگیشری بولی۔ کیسی بات کہتی ہو بہو۔ بھلا اس طرح کہیں بہو بیٹیاں بدا ہوتی ہیں۔

جالپانے جھلاہٹ کے ساتھ کہا۔ میں ان بہو بیٹیوں میں نہیں ہوں۔ میرا جس وقت جی چاہے گا جاؤں گی۔ جس وقت جی چاہے گا آؤں گی۔ جب یہاں کوئی میری بات نہیں پوچھتا تو میں بھی کسی کو اپنا نہیں سمجھتی۔ میں چڑیا نہیں ہوں جس کا پنجرہ اور دانہ پانی رکھ کر بند کر دیا جائے۔ میں بھی آدمی ہوں۔ اب اس گھر میں ایک لحہ بھر نہ رہوں گی۔ اگر کوئی میرے ساتھ نہ جائے گا۔ تو میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔ راہ میں کوئی بھیڑیا نہیں بیٹھا ہے جو مجھے اٹھالے جائے گا۔

رمانے پوچھا۔ آخر کچھ معلوم بھی تو ہو کیا بات ہے؟

بات کچھ نہیں ہوئی۔ اپنا جی ہے۔ یہاں نہیں رہنا چاہتی۔

بھلا اس طرح جاؤ گی تو تمہارے گھر والے کیا کہیں گے۔ یہ تو سوچو۔

یہ سب سوچ چکی ہوں اور زیادہ نہیں سوچنا چاہتی۔ میں جا کر اپنا اسباب باندھتی ہوں اور اسی گاڑی سے جاؤں گی۔

یہ کہہ کر جالپا اوپر چلی گئی۔ رما بھی پیچھے پیچھے یہ سوچتا ہوا چلا کہ اس کا غصہ کیسے ٹھنڈا کروں۔

جالپا اپنے کمرے میں جا کر بستر باندھ رہی تھی کہ رما نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ تمہیں میری قسم جو اس وقت جانے کا نام لو۔

جالپا نے تیوری چڑھا کر کہا۔ تمہاری قسم کی مجھے کچھ پرواہ نہیں ہے۔

اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اور پھر بستر لپیٹنے لگی۔ رما کھسیانا سا ہو کر ایک کنارے کھڑا ہو گیا۔ جالپا نے بستر بند سے بستر کو باندھا اور اپنا صندوق صاف کرنے لگی۔ مگر اس میں اب وہ پہلے کی سی تیزی نہ تھی۔ صندوق کو بار بار بند کرتی اور کھولتی تھی۔ بارش بند ہو چکی تھی صرف چھت پر رکا ہوا پانی ٹپک رہا تھا۔

آخر وہ بستر کے بنڈل پر بیٹھ گئی۔ اور بولی۔ تم نے مجھے قسم کیوں دلائی۔

رما کے دل میں امید کی گدگدی پیدا ہوئی۔ بولا۔ اس کے سوا تمہیں روکنے کا میرے پاس اور کون ذریعہ تھا۔

کیا تم چاہتے ہو۔ میں یہیں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں؟

تم ایسے منحوس الفاظ کیوں منہ سے نکالتی ہو۔ میں تو چلنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر کم سے کم ان لوگوں سے تو پوچھ لوں۔

بجھتی ہوئی آگ میں تیل پڑ گیا۔ جالپا ترش ہو کر بولی۔ وہ میرے کون ہوتے ہیں کہ میں ان سے پوچھوں۔

رمانے پوچھا۔ کوئی نہیں ہوتے؟

جالپانے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ کوئی نہیں۔ اگر کوئی ہوتے تو میری طرف سے یوں دل نہ موٹا کرتے۔ اس قید میں تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔ نہ کہیں آنا نہ جانا۔ نہ کبھی سے بات چیت۔ یہ صورت تو مجھ سے نہیں دکھائی جاتی۔ آخر دو لڑکے اور بھی تو ہیں ان کے لئے بھی تو کچھ جوڑیں گے۔

رما کو بڑی بڑی باتیں کرنے کا پھر موقع ملا۔ بولا۔ شاید تمہارا خیال ٹھیک ہے نہیں تو ڈھائی تین ہزار ان کے لئے کیا بڑی بات تھی۔

"مگر ہیں مکھی چوس پرلے درجے کے۔"

"مکھی چوس نہ ہوتے تو اتنی دولت کہاں سے آتی۔"

"مجھے تو کسی کی پرواہ نہیں ہے جی۔ ہمارے گھر کس بات کی کمی ہے۔ جب تمہاری نوکری لگ جائے تب مجھے بلا لینا۔"

"تلاش کر رہا ہوں۔ کتنے ہی بڑے آدمیوں سے ملاقات ہے۔ رہی ہے۔ ذرا اچھی جگہ چاہتا ہوں۔"

"میں ان لوگوں کا رخ سمجھتی ہوں۔ میں بھی یہاں اب دعوے کے ساتھ رہوں گی۔ کسی سے ذکر کیا؟"

"شرم آتی ہے کسی سے کہتے ہوئے۔"

"اس میں شرم کی کونسی بات ہے۔ کہتے شرم آتی ہو تو رقعہ لکھ دو۔"

رما اچھل پڑا۔ کتنی آسان تدبیر تھی۔ اور ابھی تک یہ سیدھی سی بات اسے سمجھ نہ آئی تھی۔ بولا۔ ہاں! یہ تم نے اچھی ترکیب بتائی۔ کل ضرور لکھونگا۔

جالپا بولی۔ "واہ! تم آج ہی تھوڑی لوٹ آؤ گے۔"

رما بولا۔ کیا تم سچ مچ جاؤ گی؟ تو جب مجھے نوکری مل چکی اور میں خط لکھ چکا۔ تمہارے

فراق میں بیٹھ کر رؤوں گا کہ نوکری ڈھونڈوں گا۔ نہیں اس وقت جانے کا خیال چھوڑو۔ نہیں سچ کہتا ہوں ہیں، کہیں بھاگ جاؤں گا۔ گھر کا حال دیکھ چکا تھا۔ تمہارے سوا اب اور کون بیٹھا ہوا ہے کہ جس کے لئے یہاں پڑا رہوں۔ ہٹو تو ذرا میں بستر کھول دوں۔"

جالپا نے بستر پر سے ذرا کھسک کر کہا "میں بہت جلد چلی آؤں گی۔ تم آگئے اور میں آئی۔"

رما بستر کھولتا ہوا بولا "جی نہیں۔ معاف کیجئے۔ اس دھوکے میں میں نہیں آتا۔"

جالپا نے احسان جتلاتے ہوئے کہا "تم نے میرا بندھا بندھا بستر کھول دیا۔ نہیں تو آج کتنے مزے سے گھر پہنچ جاتی۔ میں نے آج پکا ارادہ کر لیا تھا۔

رما نے پان کھایا اور اپنے کمرے میں آکر دوستوں کو خط لکھنے لگا۔

(۹)

رما ناتھ کے شناساؤں میں ایک رمیش بابو میونسپل بورڈ کے ہیڈ کلرک تھے۔ عمر تو چالیس سے اوپر تھی۔ مگر تھے بڑے شوقین! شطرنج کھیلنے بیٹھ جاتے تو سویرا کر دیتے۔ دفتر کی بھی یاد نہ رہتی۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ جوانی میں بیوی مر گئی تھی۔ دوسری شادی نہیں کی۔ اس تجرد کی زندگی میں تفریحی مشاغل کے سوا دلچسپی کا اور کیا سامان تھا۔ رما سے ان کی بڑی بے تکلفی تھی۔ وہاں اور کون ایسا نٹھلا تھا جو رات رات بھر ان سے شطرنج کھیلتا۔ کئی دن سے بچارے بہت بے قرار ہو رہے تھے۔ نہ رما آیا اور نہ شطرنج کی کوئی بازی ہوئی۔ اخبار کہاں تک پڑھتے سوچا اب رما میرے پاس کیوں آنے لگا۔ کئی بار جی میں آیا کہ اسے بلوائیں، مگر یہ سوچ کر کہ وہ کیوں آنے لگا، رہ گئے کہاں جائیں۔ سوچا سنیما ہی دیکھ آئیں۔ کسی طرح دن تو کٹے۔ سنیما سے انہیں بہت رغبت نہ تھی۔ مگر اس وقت انہیں سنیما کے سوا اور کچھ نہ سوجھا۔ کپڑے پہنے اور جانا ہی چاہتے تھے کہ رما نے کمرے

یں قدم رکھا۔

رمیش اُسے دیکھتے ہی گیند کی طرح لڑھک کر دروازے پر جا پہنچے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ آؤ جی آؤ۔ تم اس بڈھے کو بھول ہی گئے۔ ہاں بھائی اب کیوں آؤ گے! معشوق کی رسیلی باتوں کا مزا یہاں کہاں۔ چوری کا کچھ پتہ چلا۔؟

رمانے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "کچھ بھی نہیں۔"

رمیش بابو نے چھوٹی میز اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ بہت اچھا ہوا تم نے یں رپٹ نہیں لکھائی۔ نہیں سو دو سو کے ماتھے اور جاتی۔ دلہن کو تو بہت رنج ہوا ہو گا۔

"کچھ پوچھئے مت۔ میں تو تنگ آ گیا ہوں۔ بابوجی ہنستے ہی نہیں۔"

بابوجی کے پاس کیا قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ دس بیس ہزار روپے ہوں گے تو ابھی دو بچے بھی تو سامنے ہیں۔ نوکری کا بھروسہ ہی کیا۔

یں تو مصیبت میں پھنس گیا۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ کہیں نوکری کرنی پڑے گی۔ چین سے زندگی کٹتی تھی۔ نہیں تو بیٹھے بٹھائے اس جنجال میں پھنس گئے۔ بتلائیے ہے کہیں نوکری چاکری کا سہارا۔

رمیش نے طاق پر سے مہرے اور بساط اتارتے ہوئے کہا۔ "آؤ ایک بازی ہو جائے۔ پھر اس مسئلے پر غور کریں۔ اسے جتنا آسان سمجھ رہے ہو۔ اتنا آسان نہیں ہے

رمانے منہ پھیر کر کہا۔ میرا تو اس وقت کھیلنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس وقت تو یہی سر پر سوار ہے۔

رمیش بابو شطرنج کے مہرے بچھاتے ہوئے بولے۔ آؤ بیٹھو ایک بازی تو کھیل لو۔ پھر سوچیں کیا ہو سکتا ہے۔

ذرا بھی جی نہیں چاہتا۔ میں جانتا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑیں گے تو

شادی کے قریب ہی نہ جاتا۔

"دو چار چالیں چلو۔ تو آپ ہی جی لگ جائے گا۔ ذرا عقل کی گانٹھ کھلے۔"

بازی شروع ہوئی۔ کئی معمولی چالوں کے بعد رمیش نے رما کا رخ پلٹ لیا رما نے میز پر ہاتھ ٹیک کر کہا۔ "اُف کیا غلطی ہوئی ہے؟"

رمیش بابو کی آنکھوں میں نشہ کی سی سرخی پیدا ہونے لگی، شطرنج ان کے لئے شراب سے کم سرور انگیز نہ تھا۔ بولے۔ بہتی تو اچھی ہوئی۔ تمہارے لئے میں ایک تدبیر سوچ رہا ہوں۔ میرے ہی دفتر میں ایک جگہ خالی ہے۔ مگر مشاہرہ بہت کم ہے۔ محض تیس روپے وہ خضابی ڈاڑھی والے خانصاحب نہیں ہیں۔ ان سے کام نہیں چلتا۔ سوچا تھا جب تک کسی طرح کام چلا چلے۔ پڑا رہنے دوں۔ بال بچے والے آدمی ہیں۔ اس بیکاری کے زمانے میں کہاں مارے مارے پھریں گے۔ مگر وہ خود ہی نوکری سے بیزار ہو رہے ہیں۔ تمہارے لائق وہ جگہ نہیں ہے۔ مگر چاہو تو فی الحال کر لو۔

یہ کہتے کہتے رما کا فیلا مار لیا۔

رما نے فیلے کو پھر اٹھانے کی کوشش کر کے کہا۔ آپ مجھے باتوں میں لگا کر میرے مہرے اڑاتے جاتے ہیں۔ اس کی سند نہیں لایئے میرا فیلا۔

"دیکھو بھائی بے ایمانی مت کرو۔ میں نے تمہارا فیلا زبردستی تو نہیں اٹھا لیا۔ ہاں تو تمہیں وہ جگہ منظور ہے۔"

"تنخواہ تو تیس ہی ہیں۔"

ہاں تنخواہ تو کم ہے۔ مگر شاید کچھ دنوں کے بعد ترقی ہو جائے۔ میری تو رائے ہے کر لو۔ جگہ آمدنی کی ہے۔ خانصاحب نے تو اسی جگہ رہتے ہوئے لڑکوں کو ایم اے، ایل۔ بی کرا لیا۔ لڑکیوں کی شادیاں اچھے گھروں میں کیں۔ ہاں ذرا سمجھ بوجھ سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

رما نے بے غرضی جھلا کر کہا۔ "آمدنی کی مجھے پرواہ نہیں۔ رشوت کوئی اچھی چیز تو نہیں۔"

رمیش بابو نے رما کی آنکھ بچا کر ایک مہرے کو آگے بڑھا کر کہا۔ بہت خراب مگر عیالدار آدمی کیا کرے۔ میں اکیلا آدمی ہوں۔ میرے لئے ڈیڑھ سو کافی ہیں۔ لیکن جس گھر میں بہت سے آدمی ہوں۔ لڑکوں کی تعلیم ہو۔ لڑکیوں کی شادیاں ہوں۔ اس کے لئے رشوت کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ جب تک چھوٹے چھوٹے آدمیوں کی تنخواہ اتنی نہ ہو جائے گی کہ وہ بھلمنسی کے ساتھ نباہ کر سکیں۔ تب تک رشوت بند نہیں ہو سکتی۔

رما کا فرزیں پٹ گیا۔ رمیش بابو نے زور سے قہقہہ مارا۔

رما نے جھلا کر کہا۔ "اگر آپ چپ چاپ کھیلئے تو کھیلئے۔ ورنہ میں تو جاتا ہوں۔ مجھے باتوں میں لگا کر سارے مہرے اڑا لئے۔"

رمیش نے دب کر کہا۔ "اچھا صاحب اب بولوں تو زبان پکڑ لیجئے۔ یہ لیجئے شہ۔ تو تم کل عرضی پیش کر دو۔ مگر جس دن جگہ ملے گی میرے ساتھ رات بھر کھیلنا پڑے گا۔

"آپ تو ذرا سی باتوں میں رونے لگتے ہیں۔"

"ابھی وہ دن گئے۔ جب آپ مجھے مات کر دیا کرتے تھے۔ ادھر میں نے ایک منتر جگایا ہے۔ کیا مجال کوئی مات دے سکے۔ پھر شہ۔"

"جی تو یہی چاہتا ہے کہ دوسری مات دے کر جاؤں۔ مگر دیر ہو گئی۔"

"دیر کیا ہو گئی؟ ابھی تو کل نو بجے ہیں۔ کھیل لو۔ دل کا ارمان نکل جائے۔ یہ شہ۔ اور مات۔"

"اچھا کل ہی رہی! کل للکار کر پانچ ماتیں نہ دی ہوں تو کہئے گا۔"

"اجی جاؤ بھی۔ تم مجھے کیا مات دو گے۔ ہمت ہو تو ابھی سہی۔"

"اچھا آیئے آپ بھی کیا کہیں گے۔ مگر پانچ بازیوں سے کم نہ کھیلوں گا۔"

"پانچ نہیں تم دس کھیلو جی۔ رات تو اپنی ہے تو چلو پھر کھانا کھا لیں۔ تب اطمینان سے بیٹھیں۔ تمہارے گھر کہلائے دیتا ہوں کہ آج یہیں سوئیں گے۔ انتظار نہ کریں۔"

دونوں نے کھانا کھایا۔ اور شطرنج پر بیٹھے۔ پہلی بازی میں گیارہ بج گئے۔ رمیش کی جیت رہی۔ دوسری بازی بھی انہیں کے ہاتھ رہی۔ تیسری بازی ختم ہوئی تو دو بج گئے تھے۔ رمانے آنکھیں مل کر کہا۔ اب تو مجھے نیند آرہی ہے۔

رمیش نے کہا۔ تو منہ دھو ڈالو۔ برف رکھی ہوئی ہے۔ پانچ بازیاں کھیلے بغیر سونے نہ دوں گا۔

رمیش بابو کو یقین ہو رہا تھا۔ کہ آج میرا اقبال اوج پر ہے۔ نہیں تو رما کو متواتر تین ماتیں دینا آسان نہ تھا۔ مگر جب چوتھی ہار گئے تو یقین جاتا رہا۔ اندیشہ ہوا کہ کہیں متواتر ہارتا جاؤں۔ بولے اب تو سونا چاہیئے۔

"کیوں پانچ بازیاں پوری نہ کر لیجئے۔"

"کیا فائدہ کل دفتر بھی تو جانا ہے۔"

رمانے زیادہ اصرار نہ کیا۔ دونوں آدمی سوئے۔

رما یوں بھی آٹھ بجے سے پہلے نہ اٹھتا تھا۔ پھر آج تو تین بجے سویا تھا۔ آج تو اسے دس بجے تک سونے کا حق تھا۔ مگر رمیش بابو حسب معمول پانچ اُٹھے۔ نہایا سندھیا کی گھومنے گئے۔ اور آٹھ بجے لوٹ آئے۔ رما اس وقت تک سوتا ہی رہا۔ آخر جب ساڑھے نو بج گئے تو انہوں نے اُسے جگایا۔

رمانے بگڑ کر کہا۔ ناحق جگایا۔ کیسے مزے کی نیند آرہی تھی۔

"اجی دفتر بھی دینی ہے تم کو یا نہیں؟"

"آپ دے دیجئے گا۔"

"اور جو کہیں صاحب نے بلایا تو میں چلا جاؤں گا۔"

"اونہہ! جو چاہے کیجئے گا۔ میں تو سوتا ہوں۔"

رما پھر لیٹ گیا۔ رمیش نے کھانا کھایا۔ کپڑے پہنے اور دفتر چلنے کو تیار ہوئے اس وقت رما ایک بکا کر اٹھا اور بولا۔ میں بھی چلوں گا۔

"ارے منہ تو دھو لو بھلے آدمی۔"

"آپ تو چلے جا رہے ہیں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ پندرہ بیس منٹ تک رک سکتا ہوں تیار ہو جاؤ!"

رما نے ایک منٹ میں منہ دھویا۔ پانچ منٹ میں کھانا کھایا اور جھٹ پٹ رمیش کے ساتھ دفتر چلا۔

راستے میں رمیش نے مسکرا کر کہا۔ گھر کیا بہانہ کرو گے۔ کچھ سوچ رکھا ہے۔

"کہہ دونگا۔ رمیش بابو نے آنے نہیں دیا۔"

"مجھے گالیاں دلواؤ گے اور کیا۔"

"مجھے عرضی دے کر صاحب کے پاس تو نہ جانا پڑے گا۔"

"اور کیا تم سمجھتے ہو گھر بیٹھے جگہ مل جائے گی؟ مہینوں دوڑنا پڑے گا۔"

"تو میں ایسی نوکری سے باز آیا۔ مجھے تو عرضی دے کر جاتے شرم آتی ہے۔ پہلے میں کلرکوں کو ذلیل سمجھتا تھا۔ مگر وہی بلا میرے سر پڑی۔"

"اجی پہلے سب یوں ہی گھبراتے ہیں۔ جب میں نوکر ہوا۔ تو تمہاری عمر تھی۔ جس دن میری پیشی ہونے والی تھی میں ایسا گھبرایا ہوا تھا جیسے پھانسی پانے جا رہا ہوں۔"

"آپکے تو بیس بائیس سال تو نوکری کرتے ہو گئے ہوں گے۔"

"پورے پچیس سال ہوگئے صاحب! بیس سال تو بیوی کے انتقال کو ہوگئے۔"

"لالہ آپ نے دوبارہ شادی کیوں نہیں کی۔ تب تو آپ کی عمر پچاس سے زیادہ نہ ہوگی۔"

رتیش نے حسرت ناک تبسم کے ساتھ کہا۔ محلوں کا سکھ بھوگنے کے بعد جھونپڑا کیسے اچھا لگتا ہے بھائی۔ محبت سے روح کو دائمی سکون ہوجاتا ہے۔ تم میری حالت سے واقف ہو۔ اب تو بوڑھا ہوا۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ اس فرقت نصیب زندگی میں کبھی میری آنکھوں نے کسی حسینہ کی طرف نگاہ نہیں ڈالی۔ کئی بار شادی کے لئے لوگوں نے گھیرا بھی۔ لیکن کبھی خواہش پیدا نہ ہوئی۔ اس محبت کی شیریں یادگاروں میں میرے لئے مسرت کے سارے سامان موجود ہیں۔

یوں باتیں کرتے ہوئے دونوں آدمی دفتر پہونچ گئے۔

(۱۰)

رما دفتر سے گھر پہنچا۔ تو چار بج گئے تھے۔ وہ دفتر ہی میں تھا کہ آسمان پر بادل گھر آئے۔ پانی آیا ہی چاہتا تھا۔ پر رما کو گھر پہنچنے کی ایسی جلدی تھی کہ وہاں رک نہ سکا۔ احاطہ کے باہر بھی نکلنے نہ پایا تھا کہ زور کی بارش ہونے لگی۔ اساڑھ کا پہلا پانی تھا۔ ایک لمحہ میں وہ لت پت ہوگیا۔ پھر بھی وہ کہیں ٹھہرا نہیں۔ کامیابی کی خوشخبری کی مسرت میں اس ڈونگرے کی کیا پرواہ کرسکتا تھا۔ اس نے دل میں حساب لگا لیا تھا کہ کتنی ماہوار بچت ہوجانے سے وہ جالپا کے لئے جلد سے جلد چندن ہار بنوا سکے گا۔ اگر پچاس ساٹھ روپے مہینہ بھی بچ جائیں تو پانچ سال میں جالپا زیوروں سے لد جائے گی۔ گھر پہنچ کر اس نے کپڑے بھی نہ اتارے۔ لت پت جالپا کے کمرے میں پہنچ گیا۔

جالپا نے پوچھا: "یہ بھیگ کہاں گئے۔ اور رات کہاں غائب تھے۔"

رما ناتھ نے کپڑے اتارتے ہوئے کہا۔ نوکری کی فکر میں پڑا ہوا تھا۔ اس وقت دفتر سے چلا آتا ہوں۔ مجھے ایک جگہ مل گئی ہے۔

جالپا نے کھل کر پوچھا "سچ! کتنے کی جگہ ہے!"

رما کو صحیح بتلانے میں تامل ہوا۔ تیس کی نوکری بتانا کسر شان تھی۔ بولا۔ ابھی تو چالیس ملیں گے۔ مگر ترقی جلد ہو گی۔ جگہ آمدنی کی ہے۔

جالپا نے کسی بڑے عہدے کی امید کر رکھی تھی۔ بولی "چالیس میں کیا ہوگا؟ بھلا ساٹھ ستر تو ہوتے۔"

رما۔ مل تو سکتی تھی سو روپیہ کی بھی۔ مگر یہاں رعب ہے اور بالائی آمدنی کی گنجائش بھی کافی ہے۔

جالپا نے سادگی سے پوچھا۔ تو تم رشوت لوگے۔ غریبوں کو لوٹو گے۔

رما نے ہنس کر کہا۔ نہیں جی۔ وہ جگہ ایسی نہیں ہے کہ غریبوں کا گلا کاٹنا پڑے بڑے بڑے مہاجنوں سے سابقہ ہوگا اور وہ خوشی سے دیں گے۔

جالپا کو اطمینان ہو گیا۔ بولی۔ تب ٹھیک ہے۔ غریبوں کا کام یوں ہی کر دینا۔

"ہاں! ایسا تو کروں گا ہی۔"

"جا کر اماں جی سے تو کہہ آؤ۔ مجھے تو سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ اب معلوم ہوگا۔ یہاں میں بھی کچھ ہوں۔"

"ہاں جاتا ہوں۔ مگر ان سے تو میں بیس ہی بتاؤں گا۔"

جالپا خوش ہو کر بولی۔ اور کیا۔ اوراوپر کی آمدنی کا تو ذکر کرنا فضول ہے اتنے میں ڈاکیئے نے پکارا۔ رما نے دروازے پر جا کر دیکھا تو ان کے

نام کا ایک پارسل تھا۔ منشی دینددیال نے بھیجا تھا۔ لے کر خوش خوش گھر میں آئے اور جھٹ پٹ قینچی نکال کر پارسل کھولا۔ اس کے اندر ایک چھوٹی سی ڈبیا میں ایک چندن ہار رکھا ہوا تھا۔ رما نے خوش ہو کر کہا۔ یہ تو اچھا شگون ہے۔

جالپا نے کچھ رنجیدہ ہو کر کہا۔ اماں جی کو یہ کیا سوجھی۔ یہ تو انہیں کا ہار ہے ابھی ڈاک کا وقت ہو تو اسے لوٹا دو۔

رما نے تعجب سے پوچھا۔ کیوں لوٹانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ ناراض نہ ہوں گے۔

جالپا نے ناک سکوڑ کر کہا۔ میری بلا سے! میں ان کی عنایت کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہوں۔ آج اتنے دنوں کے بعد انہیں یہ خیال آیا ہے۔ ان کی چیز انہیں مبارک ہو۔ میں کسی کا احسان لینا نہیں چاہتی۔ تم خیریت سے رہو گے تو مجھے بہت زیور ملیں گے۔

رما نے تسکین دے کر کہا۔ میری رائے تو یہ ہے کہ اس وقت ہار رکھ لو۔ سوچو انہیں کتنا رنج ہوگا۔ اگر رخصتی کے وقت نہ دیا تو اچھا ہی ہوا۔ ورنہ یہ بھی غائب ہو جاتا۔

"میں اسے لوں گی نہیں۔ یہ طے ہے۔"

"آخر کیوں؟"

جالپا نے حسرت ناک لہجہ میں کہا۔ اسی لئے کہ اماں نے اسے خوشی سے نہیں دیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ اسے بھیجتے وقت وہ روئی ہوں اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ اسے واپس پا کر انہیں سچی خوشی ہوگی۔ دینے والے کا دل دیکھا جاتا ہے۔ خوشی سے اگر وہ مجھے ایک چھلا بھی دیں تو دونوں ہاتھ بڑھا کر لے لوں۔ جب دل پر جبر کر کے دنیا کی لاج سے دیا تو کیا دیا۔ میں کسی کی خیرات نہ لوں گی۔ چاہے وہ

اپنی ماں ہی کیوں نہ ہو۔

جالپا کو ماں کی طرف سے اتنا بدظن دیکھ کر اور کچھ نہ کہہ سکا۔ بدگمانی دلیل اور ثبوت کی پرواہ نہیں کرتی۔ اس نے ہار اٹھا لیا۔ اور بولا۔ ذرا لوگوں کو تو دکھا دوں۔ کم سے کم ان سے پوچھ تو لینا چاہیئے۔

جالپا نے ہار اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور بولی۔ میں کسی سے کچھ نہیں پوچھنا چاہتی۔ میری مرضی ہے لوں یا واپس کر دوں۔ کسی سے پوچھنے کی ضرورت ؟

اس نے ہار کو اسی ڈبیا میں رکھ دیا۔ اور اس پر کپڑا لپیٹ کر سینے لگی۔ رما نے ایک بار پھر ڈرتے ہوئے کہا۔ ایسی جلدی کیا ہے ؟ دس پانچ دن میں لوٹا دینا۔ ان لوگوں کی بھی خاطر ہو جائے گی۔

جالپا نے بے رخی سے کہا۔ جب تک میں اسے لوٹا نہ دوں گی۔ مجھے چین نہ آئے گا۔

ایک لمحہ میں پارسل تیار ہو گیا اور رما اسے لئے متفکرانہ انداز سے نیچے اُترا۔ گھڑی میں چار بجے تھے۔

(۱۱)

منشی دیا ناتھ کو جب رما کے نوکر ہونے کی خبر ملی، تو بہت خوش ہوئے۔ شادی ہوتے ہی وہ اتنی جلدی سنبھل جائے گا۔ اس کی انہیں امید نہ تھی۔ بولے جگہ تو اچھی ہے۔ ایمانداری سے کام کرو گے تو اچھی جگہ پر پہنچ جاؤ گے۔ میری نصیحت ہے کہ پرائے پیسے کو حرام سمجھنا۔

رما کے جی میں تو آیا کہ صاف کہہ دے کہ آپ اپنی نصیحت اپنے ہی لئے رکھیں۔ یہ میرے موافق نہیں ہے۔ مگر اتنا بے حیا نہ تھا۔

دیاناتھ نے پھر پوچھا۔ یہ جگہ تو تیس روپے کی تھی، تمہیں بیس ہی کیوں ملے؟
رماناتھ نے بات بنائی۔ نئے آدمی کو پوری تنخواہ کیسے دیتے۔ شاید سال چھ مہینے میں ترقی ہو جائے۔

رما نے دوسرے دن نیا سوٹ بنوایا۔ اور فیشن کی کتنی ہی چیزیں خریدیں۔ سسرال سے ملے ہوئے روپے کچھ بچ رہے تھے۔ کچھ دوستوں سے قرض لئے۔ وہ صاحبی ٹھاٹھ بنا کر سارے دفتر پر رعب جما دینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ اچھی آمدنی جبھی ہو سکتی ہے جب اچھا ٹھاٹھ ہو۔ سڑک کے چوکیدار کو یکے والے ایک پیسہ دے کر ٹال دیتے ہیں۔ اس کی جگہ سارجنٹ ہو تو کسی کی ہمت بھی نہ پڑے گی کہ اسے ایک پیسہ دکھائے۔ پھٹے حال بھکاری کے لئے ایک چٹکی کافی ہے۔ لیکن گیروے ریشم پہنے ہوئے باباجی کو شرماتے شرماتے بھی ایک روپیہ دینا ہی پڑتا ہے۔

تیسرے دن رما کوٹ پتلون پہن کر نکلا۔ تو اس کی شان ہی کچھ اور ہو گئی۔ چپراسیوں نے جھک جھک کر سلام کئے۔ رمیش بابو سے مل کر جب وہ اپنے کام کا چارج لینے آیا تو دیکھا۔ ایک برآمدے میں پھٹی ہوئی میلی دری پر ایک میاں صاحب صندوق پر رجسٹر پھیلائے بیٹھے تھے اور بیوپاری لوگ انہیں چاروں طرف سے گھیرے کھڑے ہیں، سامنے ٹھیلے اور گاڑیوں کے بازار لگے ہوئے ہیں۔ سبھی اپنے اپنے کام کی جلدی مچا رہے ہیں۔ سارا کام انتہا درجہ کی بے قاعدگی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس پھٹی ہوئی دری پر بیٹھنا رما کو اپنی شان کے خلاف معلوم ہوا۔ وہ سیدھا رمیش کے پاس جا کر بولا۔ کیا آپ مجھے بھی اس میلی دری پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ ایک اچھی سی میز اور کئی کرسیاں بھجوا دیئے۔ رمیش بابو نے مسکرا کر میز اور کرسیاں بھجوا دیں۔ رماناتھ شان سے کرسی پر بیٹھا۔ بوڑھے منشی جی اس کی رعونت پر دل میں ہنس رہے تھے۔ سمجھ گئے

ابھی نیا جوش ہے، نئی امنگ ہے، چارج دے دیا، چارج میں تھا ہی کیا۔ صرف ایک رجسٹر اور آج کی آمدنی کا حساب! محصول کے نرخ کا گوشوارہ موجود تھا۔ بوڑھے منشی جی نے اگر خود استعفیٰ دیا تھا، پر اس وقت یہاں سے جاتے ہوئے انہیں رنج ہو رہا تھا۔ اس جگہ وہ تیس سال سے برابر چلے آرہے تھے۔ اسی جگہ کی بدولت انہوں نے بہت روپیہ کمایا۔ اسے چھوڑتے ہوئے کیوں نہ رنج ہوتا۔ چارج دے کر جب رخصت ہونے لگے تو رما تھوڑی ان کے ساتھ زینہ تک نیچے گیا۔ خانصاحب اس کے اخلاق سے خوش ہو گئے اور بولے ہر ایک بلٹی پر ایک آنہ بندھا ہوا ہے، کھلا ہوا راز ہے۔ لوگ شوق سے دیتے ہیں آپ کو خدا نے توفیق دی ہے۔ مگر رسم نہ بگاڑیئے گا۔ ایک بار کوئی رسم ٹوٹ جاتی ہے تو اس کا باندھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس ایک آنے میں آدھا چپراسیوں کا حق ہے آدھا آپ کا۔ جو بڑے بابو پہلے تھے وہ پچیس روپے ماہوار لیتے تھے۔ مگر یہ تو بالکل بے لوث ہیں۔

رما نے بے دلی کے ساتھ کہا۔ مجھے تو یہ گندہ معلوم ہوتا ہے۔ میں صفائی کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں۔

بوڑھے میاں نے ہنس کر کہا۔ ابھی گندہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پھر اسی میں لطف آئے گا۔

خانصاحب کو رخصت کر کے رما اپنی کرسی پر آبیٹھا۔ اور ایک چپراسی سے بولا۔ ان لوگوں سے کہو کہ برآمدے کے نیچے چلے جائیں اور ایک ایک کر کے نمبروار آویں۔ ایک کاغذ پر سب کے نام نمبروار لکھ لیا کرو۔ جو پہلے آئے اس کا کام پہلے ہونا چاہیئے۔ مجھے یہ سیٹر دھوں دھوں پسند نہیں کہ سب سے پیچھے والے شور مچا کر پہلے آجائیں اور پہلے والے کھڑے منہ تکتے رہیں۔

کئی بیوپاریوں نے کہا۔ ہاں بابو جی یہ انتظام ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔

یہ حکم رما کا رعب جمانے کے لئے کافی تھا۔ روزگاڑیوں کے حلقے میں آج ہی اس باقاعدگی اور ضابطہ کی تعریف ہونے لگی ہے۔ کسی بڑے کالج کے پروفیسر کو اتنی شہرت عمر بھر میں نہ ملتی۔

دو چار دن کے تجربے سے رما کو سارے داؤ گھات معلوم ہو گئے۔ ایسی ایسی گھاتیں سوجھ گئیں جو خالصاحب کو خواب میں بھی نہ سوجھی تھیں، مال کے وزن شمار اور تشخیص میں اتنی دھاندلی تھی جس کی کوئی حد نہیں۔ جب اس دھاندلی سے بیوپاریوں کو سینکڑوں کی بچت ہو جاتی ہے تو رما بلٹی پر ایک ایک آنہ لے کر کیوں قناعت کرے۔ ذرا سختی کا برتاؤ کر کے وہ دولت اور نیک نامی دونوں ہی حاصل کر سکتا ہے، پھر وہ اس سنہرے موقع کو کیوں چھوڑے۔

رما کی آمدنی تیزی سے بڑھنے لگی۔ آمدنی کے ساتھ وقار بھی بڑھا کہ سوکھی قلم گھسنے والے دفتر کے بابوؤں کو جب سگریٹ، پان، چائے یا چاٹ کی خواہش ہوتی تو رما کے پاس چلے آتے، بہتی گنگا تھی، جس میں سبھی ہاتھ دھو سکتے تھے۔ سارے دفتر میں رما کی تعریف ہونے لگی۔ پیسے کو تو وہ کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ کیا دل ہے کہ واہ! اور جیسا دل ہے ویسی زبان بھی ہے، معلوم ہوتا ہے رگ رگ میں شرافت بھری ہوئی ہے۔ بابوؤں کا جب یہ حال تھا تو چپراسیوں اور چوکیداروں کا پوچھنا کیا؟ سب کے سب رما کے بن داموں غلام تھے۔ ان غریبوں کا وقار بھی بڑھا۔ جہاں گاڑیبان تک پھٹکار دیا کرتے تھے، وہاں اب اچھے اچھوں کی گردن پکڑ کر نیچے دھکیل دیتے تھے۔ رما نا تھ کا سکہ بیٹھ گیا۔

مگر جالپا کی آرزوئیں ابھی ایک بھی پوری نہ ہوئیں۔ ناگ پنچمی کے دن محلے کی کئی لڑکیاں جالپا کے ساتھ کجلی کھیلنے آئیں۔ مگر جالپا اپنے کمرے کے باہر نہیں نکلی۔ بھادوں میں جنم اشٹمی کی تقریب آئی۔ پڑوس ہی میں ایک سیٹھ جی رہتے تھے۔ ان کے

یہاں بڑے دھوم دھام سے جشن منایا جاتا تھا۔ وہاں سے ساس اور بہو کا بلاوا آیا، جاگیشر
گئی۔ جالپا نے جانے سے انکار کر دیا۔ ان تین مہینوں میں اس نے رما سے ایک بار بھی زیورود
کا چرچا نہ کیا۔ اس گوشہ تنہائی میں وہ اس فہرست کو دیکھا کرتی، جو رما ایک دن کہیں سے اٹھا
لایا تھا، اس میں طرح طرح کے نفیس زیوروں کے نمونے بنے ہوئے تھے۔ رما کو دیکھتے ہی
وہ فہرست چھپا لیتی تھی۔ اپنی گرویدگی کا پردہ ڈھکا رکھنا چاہتی تھی۔

رما آدھی رات کے بعد لوٹا تو دیکھا جالپا کمرے کے دروازے پر کھڑی ہے ——
ہمدردانہ انداز سے بولا۔ تم گئی کیوں نہیں۔ لوگ انتظار کر رہے تھے۔ بڑا اچھا گانا ہو
رہا تھا۔

جالپا نے بے اعتنائی سے کہا "تم تو سُن آئے۔ میں نہ گئی تو کیا ہوا۔ وہاں جاتی تو
کس کے منہ میں کالک لگتی"

رما شرمندہ ہو کر بولا۔ کالک لگنے کی کوئی بات نہ تھی۔ سبھی جانتے ہیں کہ چوری
ہو گئی ہے اور اس زمانے میں دو چار ہزار روپیہ کی چیزیں بنوا لینا منہ کا نوالہ نہیں
ہے۔

چوری کا لفظ زبان پر لاتے ہی رما کا کلیجہ دھڑک اُٹھا۔ جالپا شوہر کی طرف
تیز نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئی۔ بولنے سے بات بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ لیکن رما کو اس کی
نگاہ سے ایسا مترشح ہوا۔ گویا اسے چوری کا راز معلوم ہے اور محض حجاب کے باعث
اسے زبان پر نہیں لاتی۔ انہیں اس خواب کی بھی یاد آئی، جو جالپا نے اس رات کو
دیکھا تھا۔ وہ نگاہ تیر کی طرح اس کے دل میں چبھنے لگی۔ اُسے پھر خیال آیا شاید مجھے
دھوکا ہوا۔ اس کی نگاہ میں غصہ کے سوائے اور کچھ نہیں ہے۔ مگر یہ چپ کیوں ہے!
کچھ بولتی کیوں نہیں۔ اس کی خاموشی غضب تھی۔ اپنا شبہ رفع کرنے اور جالپا کے
دل کی تھاہ لینے کے لئے گویا اس نے ڈبکی لی۔ یہ کون جانتا تھا کہ اس کے گھر میں

رکھتے ہی یہ مصیبت تمہاری پیشوائی کرے گی۔

جالپا آنکھوں میں آنسوں بھر کر بولی۔ تو میں تم سے زیوروں کا تقاضا تو نہیں کرتی تقدیر کے نوشتہ کو انسان ٹال سکتا تو رونا ہی کس بات کا تھا۔ جن عورتوں کو زیور میسّر نہیں ہوتے کیا ان کے دن نہیں کٹتے۔

اس جواب نے رما کا شبہ تو رفع کر دیا تھا۔ مگر اس میں جو نالۂ درد چھپا ہوا تھا اس سے چھپا نہ رہا۔ ان تین مہینوں میں بہت احتیاط کرنے پر بھی وہ سو روپیہ سے زیادہ جمع نہ کر سکا تھا۔ بابوؤں کی خاطر اور تواضع میں اسے بہت پل کھانا پڑتا تھا۔ مگر بغیر کھلائے پلائے کام بھی تو نہ چل سکتا تھا۔ سبھی اس کے دشمن ہو جاتے اور اسے اکھاڑنے کی گھاتیں سوچنے لگتے۔ مفت کی دولت تنہا ہضم نہیں ہوتی۔ یہ وہ خوب جانتا تھا۔ ہاں وہ خود ایک پیسہ بھی فضول نہ خرچ کرتا۔ ہشیار بیوپاری کی طرح وہ جو کچھ خرچ کرتا تھا وہ صرف کمانے کے لئے۔ اسے تسلی دے کر بولا۔ ایشور نے چاہا ایک آدھ چیز بن ہی جائے گی۔

جالپا نے صابرانہ انداز میں کہا۔ میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو زیوروں پر جان دیتی ہیں۔ ہاں اسی طرح کسی کے گھر آتے جاتے شرم آتی ہے۔

جالپا کے ایک ایک لفظ سے حسرت اور مایوسی ٹپک رہی تھی۔ اس کی روحانی خلش کا باعث کون تھا۔ جالپا نے اگر لحاظ کے مارے زیوروں کا ذکر نہ کیا تو رما اس کے آنسو پونچھنے کے اس کی دلجوئی کرنے کے لئے کیا خاموشی کے بجائے کوئی تدبیر نہ تھی۔ محلے میں روز ہی ایک نہ ایک تقریب آتی رہتی ہے۔ روز ہی پاس پڑوس کی عورتیں ملنے آتی ہیں۔ بیچاری جالپا کب تک اس طرح اپنے دل پر جبر کرتی رہے گی۔ ہنسنے بولنے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ کون قیدیوں کی طرح اکیلے پڑا رہنا پسند کرتا ہے۔

اس نے سوچا کیا کسی تدبیر سے زیور ادھار نہیں لئے جا سکتے۔ کئی بڑے بڑے صرافوں سے اس کا دوستانہ ہو گیا تھا۔ لیکن مشکل یہی تھی کہ ان سے کہے کون۔ ممکن ہے کہ وہ انکار ہی کر دیں یا کوئی بہانہ کر کے ٹال دیں۔ تو مفت کی خفت ہو۔ اس نے طے کیا کہ ابھی ادھار لینا مناسب نہ ہوگا۔ کہیں وعدے پر روپے نہ ادا ہوئے تو شرمندہ ہونا پڑے گا۔ ابھی کچھ دن اور صبر کرنا چاہیئے۔

دفعتاً اسے خیال آیا۔ دیکھوں جالپا کی اس معاملے میں کیا رائے ہے۔ اگر جالپا کو خواہش ہو تو وہ کسی صراف سے سلسلہ جنبانی کرے گا اور ذلت اور شرمندگی کو خوشی سے برداشت کرے گا۔ بولا۔ تم سے ایک صلاح کرنا چاہتا ہوں۔

جالپا کو نیند آ رہی تھی۔ آنکھیں بند کئے ہوئے بولی۔ اب سو نے دو بھائی! سویرے اٹھنا ہے۔

رمانے پوچھا۔ اگر تمہاری رائے ہو تو کسی صراف سے وعدے پر چیزیں بنوا لاؤں۔ اس میں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔

جالپا کی آنکھیں کھل گئیں۔ کتنا بے رحمانہ سوال تھا۔ کسی مہمان سے پوچھنا کہ کہیئے تو آپ کے لئے کھانا لاؤں۔ اس کا تو یہی مطلب ہے کہ ہم مہمان کو کھانا کھلانا نہیں چاہتے۔ رما کو لازم تھا کہ چیزیں لا کر جالپا کے سامنے رکھ دیتا۔ اس کے بار بار پوچھنے پر بھی اسے یہی کہنا چاہیئے تھا کہ نقد لایا ہوں۔ تب وہ البتہ خوش ہوتی۔ اس معاملے میں اس کی صلاح لینا اس کے زخم پر نمک چھڑکنا تھا۔ جالپا نے رما کی طرف ناہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ میں تو زیوروں کے لئے اتنی بے قرار نہیں ہوں۔

رمانے کہا۔ نہیں یہ بات نہیں۔ آخر اس میں کیا حرج ہے کہ کسی صراف سے سودا کر لیا جائے۔ روپے رفتہ رفتہ چکا دیئے جائیں گے۔

جالپا نے بغیر کسی توقف کے جواب دیا۔ نہیں میرے لئے قرض لینے کی ضرورت

نہیں۔ میں بیسوا نہیں ہوں کہ تمہیں نوچ کھسوٹ کر اپنا راستہ لوں۔ مجھے تمہارے ساتھ جینا اور مرنا ہے۔ اگر مجھے ساری عمر زیوروں کے بغیر رہنا پڑے۔ تو بھی میں قرض لینے کو نہ کہوں گی۔ عورتوں کو گہنوں کی اتنی ہوس نہیں ہوتی۔ گھر کے آدمیوں کو مصیبت میں ڈال کر زیور پہننے والیاں دوسری ہونگی۔ لیکن تم نے تو پہلے کہا تھا۔ جگہ بڑی آمدنی کی ہے۔ مجھے تو کوئی خاص بچت نہیں دکھائی دیتی۔

رمانے صفائی دی۔ بچت تو ضرور ہوتی۔ اور اچھی ہوتی۔ لیکن جب اہلکاروں کے مارے بچنے بھی پائے۔ سب کے سب شیطان کی طرح سر پر سوار رہتے ہیں۔

تو ابھی کونسی جلدی ہے۔ بنتے رہیں گے آہستہ آہستہ!

خیر تمہاری صلاح ہے تو ابھی خاموش رہتا ہوں۔ میں سب سے پہلے کنگن بنوا دُوں گا۔

تمہارے پاس ابھی اتنے روپے کہاں ہوں گے؟

اس کی فکر میں کر لونگا۔ تمہیں کیسا کنگن پسند ہے۔

جالپا اپنے مصنوعی استغنا کو نہ نبھا سکی۔ الماری میں سے زیوروں کی فہرست نکال کر رما کو دکھانے لگی۔ اس وقت وہ اتنی سرگرم تھی۔ گویا سونا آ کر رکھا ہوا ہے سنار بیٹھا ہوا ہے صرف وضع کا پسند کرنا باقی ہے۔ اس نے فہرست کے دو ڈیزائن پسند کئے اور دونوں نہایت خوشنما۔ مگر رما ان کی قیمت دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ ایک ایک ہزار کا تھا۔ دوسرا آٹھ سو کا۔

رمانے ٹال کر کہا۔ ایسی چیزیں تو یہاں بن بھی نہ سکیں۔ مگر کل میں ذرا صرافے کی سیر کرونگا۔

جالپا نے فہرست کو بند کر کے حسرت ناک لہجہ میں کہا۔ تمہارے پاس نہ جانے کبھی روپے ہوں گے یا نہیں۔ اُونہہ! بنیں گے۔ نہیں کون کوئی گہنے کے بغیر مرا جاتا ہے۔

رما کو آج اس ادھیڑ بن میں بڑی دیر میں نیند آئی۔ یہ جڑاؤ کنگن اس گوری گوری کلائیوں پر کتنے بھلے معلوم ہونگے۔ یہ دل آویز خواب دیکھتے دیکھتے نہ جانے کب اُسے نیند آ گئی۔

(۱۲)

دوسرے دن سویرے ہی رما نے رمیش بابو کے گھر کا راستہ لیا۔ ان کے یہاں جنم اشٹمی کی جھانکی ہوتی تھی۔ انہیں خود تو اس سے کوئی شوق نہ تھا۔ مگر ان کی بیوی یہ جشن منا تھیں۔ اس کی یادگار میں وہ اب تک رسم ادا کرتے جاتے تھے۔ رما کو دیکھ کر بولے، آؤ جی رات کیوں نہیں آئے۔ مگر یہاں غریبوں کے گھر کیوں نہیں آتے، سیٹھ جی کے یہاں تو خوب بہار ہو گی۔

رما۔ ایسی سجاوٹ تو نہ تھی، ہاں گانے کا اچھا انتظام تھا۔ کئی کتھک اور کئی طوائفیں بھی تھیں۔

رمیش۔ سیٹھ جی نے تو وعدہ کیا تھا کہ طوائفیں نہ آنے پائیں گی۔ مگر اس کی پروا نہ کی۔ ایک تو طوائفوں کا ناچ یوں ہی برا۔ اس پر ٹھاکر دوارے میں۔ نہ جانے ان گدھ کو کب عقل آئے گی۔

رما۔ طوائفیں نہ ہوں تو جھانکی کو دیکھنے جائے ہی کون۔ سبھی تو آپ کی طرح زا نہیں ہیں۔

رمیش۔ خیر! فرصت ہو تو آؤ۔ ایک آدھ بازی ہو جائے۔

رما۔ اور آیا کس لئے ہوں۔ مگر آج آپ کو میرے ساتھ صرافے تک چلنا پڑے گا۔

رمیش۔ چلنے کو چلا چلوں گا۔ مگر اس معاملے میں میں بالکل کورا ہوں۔ رنہ کو

جیز بنوائی نہ خریدی۔ تمہیں کچھ لینا ہے؟

رما۔ لینا دینا کیا ہے۔ ذرا بھاؤ تاؤ دیکھنا ہے؟

رمیش۔ معلوم ہوتا ہے گھر میں پھٹکار پڑی ہے۔

رما۔ وہ تو زیوروں کا نام تک نہیں لیتی۔ لیکن اپنا فرض تو کچھ ہے؟

رمیش۔ شاید کچھ روپے جمع کر لیے ہوں۔

رما۔ روپے کس کے پاس نا ہیں۔ وعدے پر لونگا۔

رمیش۔ بھائی اس خبط میں نہ پڑو۔ جب تک روپے ہاتھ میں نہ ہوں بازار کی طرف جاؤ ہی مت۔ زیوروں سے تو بڈھے نئی بیبیوں کا دل خوش کیا کرتے ہیں۔ جوانوں کے نئے بہت سے نسخے ہیں۔

رما۔ میں دو تین مہینے میں سب روپے ادا کر دونگا۔ اگر اس کا یقین نہ ہوتا تو میں ذکر ہی نہ کرتا۔

رمیش۔ تو دو تین مہینے اور کیوں صبر نہیں کر جاتے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ تمہاری آمدنی اچھی ہے۔ لیکن آئندہ کے بھروسے پر اور جو کام چاہے کرو۔ قرض کبھی مت لو۔ زیوروں کا قرض اس غریب ملک میں نہ جانے کیسے پھیل گیا۔ جنہیں روٹیوں کا بھی ٹھکانہ نہیں۔ وہ بھی زیوروں کے پیچھے جان دیتے ہیں۔ ہر سال اربوں روپے سونا چاندی خرید میں صرف ہو جاتے ہیں۔ دنیا کے اور کسی ملک میں زیوروں کا اتنا رواج نہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں دولت تجارت میں صرف ہوتی ہے جس سے لوگوں کی پرورش ہوتی ہے اور دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہاں دولت آرائش میں خرچ ہوتی ہے۔ بس یہی سمجھ لو کہ جس ملک میں جتنی ہی زیادہ جہالت پیدا ہوتی ہے اتنا ہی زیوروں کا رواج ہوتا ہے۔ یہاں تو خیر ناک کان چھدا کر ہی رہ جاتے ہیں۔ مگر بعض ایسے ملک بھی ہیں جہاں ہونٹ چھدوا لیے جاتے ہیں۔ اور اس میں زیور پہنتے ہیں۔

رما۔ وہ کونسا ملک ہے۔

رمیش۔ اس وقت تو ٹھیک یاد نہیں آتا۔ شاید افریقہ ہو۔ تمہیں یہ سن کر تعجب ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے ملک والوں کے لئے ناک کان کا چھیدنا کم کچھ تعجب کی بات نہ ہوگی۔ برا مرض ہے! وہ دولت جو کھانے پینے میں صرف ہونی چاہیئے۔ بال بچوں کا پیٹ کاٹ کر زیوروں کی نذر کر دی جاتی ہے۔ بچوں کو دودھ نہ ملے نہ سہی۔ گھی کی بو تک ان کی ناک میں نہ پہنچے نہ سہی۔ میووں اور پھلوں کے درشن انہیں نہ ہوں، کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر بیوی گہنے ضرور پہنے گی۔ اور میاں گہنے ضرور بنوائیں گے۔

رما۔ میں تو سمجھتا ہوں۔ ایسا کوئی بھی ملک نہیں۔ جہاں عورتیں زیور نہ پہنتی ہوں۔

رمیش بابو اس بحث میں شطرنج بھول گئے۔ چھٹی کا دن تھا ہی۔ دو چار ملنے والے اور آ گئے۔ رما چپکے سے کھسک آیا۔ اس بحث میں ایک بات ایسی تھی جو اس کے دل میں بیٹھ گئی۔ اب وہ قرض گہنے نہ لے گا۔ صرافے تک گیا ضرور۔ مگر کسی دوکان پر جانے کی ہمت نہ پڑی۔

وہ گھر پہنچا۔ تو نو بج گئے تھے۔ دیا ناتھ نے اس کو دیکھا تو پوچھا۔ آج نہ سویرے سویرے کہاں چلے گئے تھے۔

رما۔ ذرا بڑے بابو سے ملنے گیا تھا۔

دیا ناتھ گھنٹے آدھ گھنٹے کے لئے کتب خانے کیوں نہیں چلے جایا کرتے ابھی تمہارے پڑھنے لکھنے کی عمر ہے۔ امتحان نہ سہی۔ اپنی لیاقت تو بڑھا سکتے ہو۔ ایک سیدھا ۔۔۔ لکھنا پڑ جاتا ہے۔ تو بغلیں جھانکنے لگتے ہو۔ اصلی تعلیم مدرسہ چھوڑنے کے بعد ہی شروع

باتیں سنی ہیں جن سے مجھے رنج ہوا۔ اور تمہیں میں سمجھا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ میرے گھر میں حرام ایک کوڑی بھی آئے۔

رمانے مصنوعی غصہ دکھا کر کہا۔ آپ سے کس نے یہ بات کہی۔ میں اس کی مونچھیں اکھاڑ لونگا۔

دیا ناتھ۔ کسی نے بھی کہی ہو۔ اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں۔ لیکن بات سچ ہے یا جھوٹ۔ میں اتنا ہی پوچھنا چاہتا ہوں۔

"بالکل جھوٹ۔"

"بالکل جھوٹ۔"

"جی ہاں بالکل جھوٹ۔"

"تم دستوری نہیں لیتے۔"

"دستوری رشوت نہیں ہے۔ سبھی لیتے ہیں اور علانیہ لیتے ہیں۔ لوگ بغیر مانگے دیتے ہیں۔ میں کسی سے مانگنے نہیں جاتا۔"

"سبھی علانیہ لیتے ہیں اور بغیر مانگے دیتے ہیں۔ اس سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ رشوت اچھی چیز ہے۔"

"دستوری بند کر دینا میرے قابو کی بات نہیں۔ میں خود نہ لوں۔ مگر چپڑاسی اور محرر کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ آٹھ آٹھ نو نو روپیہ پانے والے لوگ اگر نہ لیں تو ان کا کام ہی نہیں چل سکتا۔"

دیا ناتھ۔ میں نے تمہیں سمجھا دیا۔ ماننے نہ ماننے کا تمہیں اختیار ہے۔

یہ کہتے ہوئے دیا ناتھ دفتر چلے گئے۔ رما کے جی میں آیا صاف کہہ دے۔ آپ نے بے لوث بن کر زندگی میں کیا کر لیا۔ کہ مجھے تعلیم دے رہے ہیں۔ ہمیشہ پیسے پیسے کو محتاج رہے ہیں۔ لڑکوں کو پڑھا تک نہیں سکے۔ یہ دیانتداری اس وقت اچھی معلوم ہوتی جب کہ نیت بھی صاف رہتی۔ اور زندگی بھی آرام سے گزرتی۔

رما گھر میں گیا تو ماں نے پوچھا۔ تمہارے بابوجی کس بات پر بگڑ رہے تھے؟
رما۔ مجھے تعلیم دے رہے تھے کہ دستوری مت لیا کرو۔
جاگیشری۔ تم نے کہا نہیں۔ آپ نے بڑی ایمانداری کی تو کون سے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ساری زندگی پیٹ پالتے رہے۔
رما۔ کہنا تو چاہتا تھا مگر چڑھ جاتے۔ آپ کو لینے کا شعور تو ہے نہیں عیب دیکھا کہ یہاں دال نہیں گلتی تو بھگت بن گئے۔ بیوپاریوں سے روپے نکالنے کے لئے عقل چاہیئے جہاں کسی نے بھگت پن کی لی اور میں سمجھ گیا کہ بدھو ہے لینے کی تمیز نہیں۔ کیا کرے بیچارہ کسی طرح آنسو تو پونچھتے۔
جاگیشری۔ بس بس یہی بات ہے بیٹا جسے لینا آئے گا وہ ضرور دے گا۔ انہیں تو بس گھر میں قانون بگھارنا آتا ہے۔
رما دفتر جاتے وقت اوپر کپڑے پہننے گیا۔ تو جالپا نے اسے تین لفافے ڈاک میں چھوڑنے کے لئے دیئے۔ اس وقت اس نے تینوں لفافے جیب میں ڈال لیئے۔ لیکن راستے میں انہیں کھول کر چٹھیاں پڑھنے لگا۔ خط کیا تھے؟ مصیبت اور درد کی داستان تھی جو اس نے اپنی سہیلیوں کو سنائی تھی۔
رما نے تینوں چٹھیاں جیب میں رکھ لیں۔ ڈاک خانہ سامنے سے گذر گیا۔ پر اس نے انہیں چھوڑا نہیں۔ جالپا ابھی تک یہی سمجھتی ہے کہ میں اسے دھوکا دے رہا ہوں۔ اسے کیسے یقین دلاؤں۔ اگر اپنا بس ہوتا تو اسی وقت زیوروں کے ٹوکرے بھر بھر جالپا کے سامنے رکھ دیتا۔ یا اسے کسی بڑے صراف کی دکان پر لے جا کر کہتا۔ تمہیں جو جو چیز لینی ہوں لے لو۔ رما کو آج اس درد کا صحیح اندازہ ہوا جو جالپا کے دل کو بے چین کر رہا تھا ایسی حالت میں رما کو وعدے پر زیور لانے میں تامل کرنے کی مطلق گنجائش نہ تھی۔
دفتر پہنچا تو برآمدے میں مال تولا جا رہا تھا۔ میز پر روپے پیسے رکھے جا رہے

تھے اور رما فکر میں ڈوبا بیٹھا تھا۔ کس سے صلاح لے۔ اسے آج اپنے اوپر غصہ آرہا تھا کہ اس نے شادی ہی کیوں کی۔

جب وہ گھر کی حالت سے واقف تھا تو اس نے شادی سے انکار کیوں نہ کر دیا۔ آج اس کا جی مطلق کام میں نہ لگا۔ معین وقت سے پہلے اٹھ کر گھر چلا گیا۔

جالپا نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ میری چٹھیاں چھوڑ تو نہیں دیں؟

رما نے بہانہ کیا۔ مطلق یاد نہ آئی۔ جیب میں پڑی رہ گئیں۔

جالپا۔ یہ بہت اچھا ہوا۔ لاؤ مجھے دیدو۔ اب نہ بھیجوں گی۔

رما۔ کیوں کل بھیجدوں گا۔

جالپا۔ نہیں اب مجھے بھیجنا ہی نہیں ہے۔ میں کچھ ایسی باتیں لکھ گئی تھی جو نازیبا تھیں اگر تم نے خط چھوڑ دیئے ہوتے تو مجھے بڑا رنج ہوتا۔ میں نے ان میں تمہاری شکایت کی تھی۔

یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔

رما۔ شوہر بدنیت ہے دغا باز ہے، حیلہ ساز ہے۔ اس کی اگر تم نے شکایت کی تو کیا بُرا کیا؟

جالپا نے گھبرا کر پوچھا۔ تم نے خط پڑھ لئے تھے کیا؟ تب تو تم مجھ سے بہت ناراض ہو گئے۔

رقت سے جالپا کی آواز رک گئی۔ اس کا سر جھک گیا۔ اور جھکی ہوئی آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں آنچل پر گرنے لگیں۔ ایک لمحہ میں اس نے دل کو سنبھال کر کہا۔ مجھ سے بہت بڑی خطا ہوئی ہے۔ جو سزا چاہے دو۔ پر ہم سے ناراض مت ہو۔ ایشور جانتے ہیں تمہارے جانے کے بعد مجھے کتنا افسوس ہوا۔ میری قلم سے نہ جانے کیسے وہ باتیں نکل گئیں۔

جالپا جانتی تھی کہ رمانا تھ کو زیوروں کی فکر مجھ سے ذرہ بھر بھی کم نہیں ہے۔ لیکن ہمدردوں سے اپنی داستانِ غم کہتے وقت ہم اکثر مبالغہ کر جایا کرتے ہیں۔ جو باتیں پردے کی سمجھی جاتی ہیں۔ ان کا ذکر کر دینے سے قربت اور یگانگت کا اظہار ہوتا ہے۔ دوستوں کی ہمدردی حاصل کرنے کا یہ عام طریقہ ہے۔

رما جالپا کے آنسو پونچھتا ہوا بولا۔ میں تم سے ناخوش نہیں ہوں۔ ناخوش ہونے کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ امید کی تاخیر ہی مایوسی ہے۔ کیا میں اتنا نہیں جانتا۔ اگر تم نے مجھے منع نہ کر دیا ہوتا تو اب تک میں نے کسی نہ کسی طرح دو ایک چیزیں بنوادی ہوتیں۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے تم سے صلاح لی۔ اس وقت مجھے یہ خیال نہ رہا کہ ایسی حالتوں میں آدمی خواہش رہنے پر بھی نہیں نہیں کرنے پر مجبور ہے۔ اب میں وہ غلطی نہ کروں گا۔

جالپا نے متفکرانہ انداز سے پوچھا۔ تو کیا قرض لاؤ گے؟

رما۔ کیا حرج ہے؟ جب سود نہیں دینا ہے تو جیسے نقد ویسے ادھار۔ قرض سے دنیا کا کام چلتا ہے۔ کون قرض نہیں لیتا۔ یوں روپے ملتے بھی ہیں۔ تو الّلے تلّلے خرچ ہو جاتے ہیں۔ قرض سر پر سوار ہوگا تو اس کی فکر ہاتھ کو روکے رہے گی۔

جالپا۔ میں تمہیں فکر میں ڈالنا نہیں چاہتی۔ اب میں بھول کر بھی زیوروں کا نام نہ لوں گی۔

رما۔ نام تو تم نے کبھی نہیں لیا۔ لیکن تمہارے نام نہ لینے سے میرا فرض تو پورا نہیں ہو جاتا۔ تم قرض سے ناحق ڈرتی ہو۔ روپے جمع ہو جانے کے انتظار میں بیٹھا رہوں گا تو شاید کبھی بھی جمع نہ ہوں گے۔

جالپا۔ مگر پہلے کوئی چھوٹی سی چیز لانا۔

رما۔ ہاں ہاں۔ ایسا تو کرونگا ہی۔

رما بازار چلا تو خوب اندھیرا ہو چلا تھا۔ دن رہتے جاتا تو یہ خوف تھا کہ اس پر دوستوں کی نگاہ پڑ جاتی۔ منشی دیانا تھ ہی دیکھ لیتے۔ وہ اس معاملے کو پوشیدہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔

(۱۳)

صرافے میں گنگو کی دکان مشہور تھی۔ گنگو تھا تو برہمن مگر تھا پکا بنیا۔ اس کی دکان پر ہمیشہ گاہکوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اس کا تقدس گاہکوں میں یقین پیدا کرتا تھا۔ دوسری دکانوں پر لوگوں کو ٹھگے جانے کا خوف ہوتا تھا۔ اس دوکان پر دغا بازی کا اندیشہ نہ تھا۔ گنگو نے رما کو دیکھتے ہی مسکرا کر کہا۔ آیئے بابو صاحب اوپر آیئے۔ منیم جی آپ کے واسطے پان منگواؤ کیا حکم ہے بابو جی؟ آپ تو کبھی آتے ہی نہیں۔ غریبوں پر کبھی کبھی کرم کیا کیجئے۔

گنگو کے اخلاق نے رما کی ہمت کھول دی۔ اگر اس نے اصرار نہ کیا ہوتا تو شاید رما کبھی دوکان پر جا ہی نہ سکتا۔ دوکان پر جا کر بولا۔ یہاں ہم جیسے مزدوروں کا کہاں گذر ہے۔ مہاراج! گرہ میں کچھ ہو تو؟

گنگو نے ان کے بیٹھنے کے لئے ایک کرسی منگوائی اور بولا۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں بابو صاحب آپ کی دکان ہے۔ جو چیز چاہئے لے جائیے۔ دام آگے پیچھے ملتے رہیں گے۔ ہم لوگ آدمی کو پہچانتے ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ دکھاؤں کوئی جڑاؤ چیز؟ کوئی کنگن، کوئی ہار۔ ابھی حال ہی میں دلی سے مال آیا ہے۔

"کوئی ہلکے داموں کا ہار دکھایئے؟"

"یہی کوئی سات آٹھ سو کا۔"

"اجی نہیں کوئی چار سو تک حد ہے۔"

گنگو نے زیوروں کا صندوقچہ منگا کر کہا۔ میں آپ کو دونوں دکھائے دیتا ہوں۔ جو پسند آئے رکھ لیجئے گا۔ ہمارے یہاں کسی طرح کا دگل پھیل نہیں ہے بابو صاحب۔

اس کی آپ ذرا بھی فکر مت کریں۔ پانچ برس کا لڑکا ہو یا سو برس کا بوڑھا سب کے ساتھ ایک بات رکھتے ہیں۔ مالک کو بھی ایک دن منہ دکھانا ہے۔

گنگو نے ہار نکال نکال کر دکھانے شروع کئے۔ رما کی آنکھیں کھل گئیں طبیعت لوٹ پوٹ ہو گئی۔ کیا صفائی تھی۔ رنگینیوں کی خوبصورت سجاوٹ۔ کتنی آب و تاب آنکھیں جھپکی جاتی تھیں۔ رما نے سوچ رکھا تھا سو روپیہ سے زیادہ اُدھار نہ رکھونگا۔ لیکن چار سو والا ہار آنکھوں میں کچھ نہ جچتا تھا اور جیب میں تھے کل تین سو روپے سو جا یہ ہار نے گیا اور جالپا نے پسند نہ کیا تو فائدہ ہی کیا۔ ایسی چیز لے جانی چاہیئے کہ وہ دیکھتے ہی پھڑک اٹھے۔ یہ جڑاؤ ہار اس کی گردن میں کتنا خوشنما معلوم ہوگا۔ وہ ہار ایک ہزار مرصع آنکھوں سے گویا رما کے دل کو کھینچنے لگا۔ وہ ایک سکوت کے عالم میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا تھا۔ کہیں گنگو نے تین سو روپے اُدھار ماننے سے انکار کر دیا تو اسے کتنا شرمندہ ہونا پڑے گا۔ گنگو بشرے سے اس کے دل کی بات تاڑ کر بولا۔

آپ کے لائق تو یا لوجی یہی چیز ہے۔ اندھیرے گھر میں رکھ دیجئے تو اجالا ہو جائے۔

رما نے شرماتے ہوئے کہا۔ پسند تو مجھے بھی یہی ہے۔ لیکن میرے پاس کل تین سو روپے ہیں۔ یہ سمجھ لیجئے۔

گنگو نے خلوص کے ساتھ کہا۔ بابو صاحب روپیہ کا ذکر ہی نہ کیجئے۔ حکم ہو تو دس ہزار کا مال ساتھ بھیج دوں۔ مرضی ہو تو ایک آدھ چیز اور دکھاؤں۔ ایک شیش پھول بن کر آیا ہے بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ گلاب کا پھول کھلا ہوا ہے۔ دیکھ کر جی خوش ہو جائے گا اور دام بھی کچھ ایسا بھاری نہیں ہے۔ آپ کو ایک ڈھائی سو میں مل جائے گا۔

رما نے مسکرا کر کہا۔ مہراج بہت باتیں بنا کر الٹے چھرے سے نہ مونڈ لیجیے گا۔ اس معاملے میں میں بالکل اناڑی ہوں۔

گنگو۔ ایسا نہ کہو بابو جی! آپ چیز لے جائیے بازار میں دکھا لیجئے۔ اگر کوئی یہ چیز ڈھائی سو سے کوڑی کم میں دے تو میں مفت دے دونگا۔

شیشی پھول آیا۔ سچ مچ گلاب کا پھول تھا۔ جس پہ ہیرے کی کنیاں اوس کی بوندوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ رما کی ٹکٹکی بندھ گئی۔

گنگو۔ ڈھائی سو تو کاریگر کی صفائی کا انعام ہے بابو جی یہ وہ چیز ہے؟

رما۔ ہاں ہے تو بہت خوبصورت! مگر ایسا نہ ہو کل ہی دام کا تقاضہ کرنے لگو۔ میں خود ہی جہاں تک ہو سکے گا جلد دے دونگا۔

گنگو نے دونوں چیزیں دو خوبصورت مخملی کیس میں رکھ کر رما کو دے دیں۔ رما کی مسرت کا اس وقت اندازہ نہ تھا۔ مگر یہ خاص مسرت نہ تھی۔ اس میں ایک اندیشہ کی آمیزش بھی تھی۔ یہ اس بچے کی خوشی نہ تھی جس نے ماں سے پیسے مانگ کر مٹھائی لی ہو۔ بلکہ اس بچے کی خوشی تھی جس نے پیسے چرا کر لی ہو۔ اسے مٹھائیاں میٹھی تو لگتی ہیں لیکن دل کانپتا رہتا ہے کہ کہیں گھر چلنے پر مار نہ پڑنے لگے۔ ساڑھے پانچ سو روپیہ ادا کرنے کی تو اسے زیادہ فکر نہ تھی اگر زمانہ موافق ہو تو چھ مہینے میں بیباق کر سکتا ہے۔ خوف یہی تھا کہ بابو جی سنیں گے تو ضرور ناراض ہوں گے۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا جالپا کو ان زیوروں سے آراستہ دیکھنے کا اشتیاق اس خوف پر غالب آتا جاتا تھا۔ گھر پہونچنے کی عجلت میں اس نے سڑک چھوڑ دی اور ایک گلی میں گھس گیا۔ گھنا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بادل تو اسی وقت آ گئے تھے جب وہ گھر سے چلا تھا۔ وہ گلی میں گھسا ہی تھا کہ پانی کی بوندیں چھروں کی طرح اوپر پڑیں — جب تک چھتری کھولے وہ لت پت ہو چکا تھا۔ اسے دہشت ہوئی اس اندھیرے

میں کوئی آ کر دونوں چیزیں نہ چھین لے۔ اندھیری گلیوں میں خون تک ہو جاتے ہیں چھپانے لگا اس طرف سے ناحق آیا۔ دو چار منٹ دیر ہی میں پہنچتا تو ایسی کونسی آفت آجاتی۔ بارے کسی طرح گلی کا خاتمہ ہوا اور سڑک ملی۔ لالٹین نظر آئی۔ روشنی کتنی اعتقاد انگیز چیز ہے اس کا آج اسے عملی تجربہ ہوا۔

وہ گھر پہنچا تو دیا ناتھ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ان کی آنکھ بچا کر وہ اندر جانا چاہتا تھا کہ انہوں نے ٹوکا۔ اس وقت کہاں گئے تھے۔

رما نے انہیں کچھ جواب نہ دیا۔ کہیں وہ اخبار سنانے لگیں تو گھنٹوں کی خبر لیں۔ سیدھا اندر جا پہونچا۔ جالپا دروازے پر کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی تھی فوراً اس کے ہاتھ سے چھتری لے لی۔ اور بولی۔ تم تو بالکل بھیگ گئے کہیں ٹھہر نہ گئے۔

رما۔ پانی کا کیا ٹھکانہ رات بھر برستا رہے۔

یہ کہتا ہوا وہ اوپر چلا گیا۔ اس نے سمجھا تھا جالپا بھی پیچھے پیچھے آتی ہوگی۔ پر وہ نیچے بیٹھی اپنے دیوروں سے باتیں کر رہی تھی۔ گویا اُسے زیوروں کی یاد ہی نہیں ہے۔ جیسے وہ بالکل بھول گئی ہے کہ رما صرافے سے آیا ہے۔

رما نے کپڑے بدلے اور دل میں جھنجلاتا ہوا نیچے آیا۔ اسی وقت دیا ناتھ کھانا کھانے آ گئے۔ سب لوگ کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ جالپا نے ضبط تو کیا پر اس اضطراب کی حالت میں آج اس سے کچھ کھایا نہ گیا۔ جب وہ اوپر پہنچی تو رما چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مذاق کر کے بولا۔ آج تو صرافے کا جانا بیکار ہو گیا۔ ہار کہیں تیار ہی نہ تھا بنانے کو کہہ آیا ہوں۔

جالپا کا اشتیاق سے چمکتا ہوا چہرہ ماند پڑ گیا۔ میں تو پہلے ہی جانتی تھی بنتے بنتے پانچ چھ مہینے تو لگ بھی جائیں گے۔

رما۔ نہیں جی بہت جلد بنا دے گا قسم کھا رہا ہوں۔

جالپا۔ اونہہ۔ جب چاہے دے۔

جالپا منہ پھیر کر لیٹنے جا رہی تھی کہ رما نے زور سے قہقہہ مارا۔ جالپا چونک پڑی سمجھ گئی۔ رما نے شرارت کی تھی۔ مسکراتی ہوئی بولی۔ تم بھی بڑے نٹ کھٹ ہو۔ کیا لائے؟

رما۔ کیسا چکمہ دیا۔

جالپا۔ یہ تو مردوں کی عادت ہی ہے۔ تم نے نئی بات کیا کی؟

جالپا دونوں زیوروں کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ اس کے دل میں مسرت کی موجیں سی اُٹھنے لگیں۔ وہ اپنے جذبات کو چھپانا چاہتی تھی کہ رما اُسے اوچھی نہ سمجھنے لگے مگر ایک ایک عضو کھلا جاتا تھا۔ مسکراتی ہوئی آنکھیں دہکتے ہوئے رخسار اور کھلے ہونٹ انشائے راز کئے دیتے تھے۔ اس نے ہار گلے میں پہنا۔ شیش پھول سجایا اور خوشی سے متوالی ہو کر۔ تمہیں دعا دیتی ہوں۔ ایشور تمہاری ساری آرزوئیں پوری کرے۔

آج جالپا کی وہ تمنا پوری ہوئی۔ جو بچپن ہی سے اس کے تخیل کا ایک زرین خواب اس کی امیدوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ آج اس کی وہ سادھ پوری ہوئی۔ اگر ماں کی یہاں ہوتی تو وہ سب سے پہلے یہ ہار اسے دکھاتی اور کہتی۔ تمہارا ہار تمہیں مبارک ہو۔

رما پر گھڑوں نشہ چڑھا تھا۔ آج اسے پہلی بار زندگی کا مزا حاصل ہوا۔

جالپا نے پوچھا جا کر اماں کو دکھا آؤں۔

رما نے جو انکسار دکھا کر کہا۔ اماں کو کیا دکھانے جاؤ گی۔ ایسی کون سی بڑی چیزیں ہیں۔

جالپا۔ اب تم سے سال بھر تک اور کسی چیز کے لئے نہ کہوں گی۔ یہ روپے ادا کر دوں گی میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوگا۔

رما نے پُرغرور انداز سے کہا۔ روپوں کی کیا فکر؟ ہیں ہی کتنے؟

جالپا۔ ذرا [illegible] دیکھو [illegible] کتنے ہوں۔

رما۔ مگر یہ گہنا ادھار لائے ہیں۔

جالپا اس طرح دوڑی ہوئی نیچے گئی گویا اُسے وہاں کوئی خزانہ مل جائے گا۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔ رما خوشی کی نیند سو رہا تھا۔ جالپا نے چھت پر آکر ایک بار آسمان کی طرف دیکھا۔ شفاف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ وہ کاتک کی چاندنی جس میں نغمے کا سکون ہے اور شعر کی روحانیت! اس نے کمرے میں آکر اپنی صندوقچی کھولی اور اس میں سے وہ کانچ کا چندن ہار نکالا جسے پہن کر وہ ایک دن پھولی نہ سمائی تھی مگر اب اس نئے ہار کے سامنے اس کی چمک اس طرح ماند پڑ گئی تھی۔ جیسے اس شفاف چاندنی کے سامنے تاروں کی روشنی۔ اس نے اس نقلی ہار کو توڑ ڈالا اور اس کے دانوں کو نیچے گلی میں پھینک دیا۔ اسی طرح جیسے پوجا ختم ہونے کے بعد کوئی بھگت مٹی کی مورتوں کو پانی میں فنا کر دیتا ہے۔

(۱۴)

اس دن سے جالپا کی زندگی میں ایک نیا پہلو رونما ہوا۔ رما نہا نے جاتا تو اسے اپنی دھوتی چنی ہوئی ملتی۔ طاق پر تیل اور صابون بھی رکھا ہوا پاتا۔ جب وہ دفتر جانے لگتا تو جالپا اس کے کپڑے لاکر سامنے رکھ دیتی۔ پہلے پان مانگنے پر ملتے تھے۔ اب زبردستی کھلائے جاتے تھے۔ جالپا اس کا رخ دیکھا کرتی تھی اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ کھانے بیٹھتا تو وہ پنکھا کرتی۔ پہلے وہ بڑے جبر سے کھانا پکانے جایا کرتی تھی اور اس پر بھی بیگار ہی ٹالتی تھی۔ اب وہ بڑی خوشی سے رسوئی میں جاتی۔ چیزیں وہی پکائی جاتی تھیں مگر ان میں کچھ زیادہ مٹھاس آگئی تھی۔ رما کو ان الفت آمیز دلجوئیوں کے سامنے وہ زیور بہت ہی حقیر معلوم ہوتے تھے۔

ادھر جس دن رمانے گنگو کی دکان سے زیور خریدے اسی دن دوسرے صرافوں کو بھی اس کی قدر دانی کی خبر ملی۔ رما جب ادھر سے نکلتا تو دونوں طرف کے دوکاندار اُٹھ اُٹھ کر سلام کرتے۔ آیئے بابو جی۔ پان تو کھاتے جایئے۔ دو ایک چیزیں ہماری دکان سے بھی تو دیکھئے۔ رما کا خوم واحتیاط اس کی ساکھ کو اور بڑھاتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن ایک دلال رما کے گھر آپہنچا۔ اور اس کے نہیں نہیں کرنے پر بھی اپنا صندوقچہ کھول کر اس کے سامنے رکھ ہی دیا۔

رمانے اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا۔ بھائی اس وقت مجھے کچھ نہیں لینا ہے کیوں اپنا اور میرا وقت برباد کروگے۔

دلال نے بڑی خوشامد سے کہا۔ بابو جی دیکھ تو لیجئے پسند آئے تو لیجئے گا۔ دیکھ لینے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ آخر رئیسوں کے پاس نہ جائیں تو کس کے پاس جائیں اوروں نے آپ سے گہری رقمیں ماریں۔ ہمارے بھاگ میں بدا ہوگا تو ہمیں بھی آپ سے چار پیسے مل جائیں گے۔ بہو جی اور مائی جی کو دکھا لیجئے۔ میرا دل تو گواہی دیتا ہے کہ آپ کے ہاتھوں بہنی ہوگی۔

رما۔ عورتوں کی پسند کو نہ کہو، چیزیں اچھی ہونگی ہی۔ پسند آتے کیا دیر لگتی ہے لیکن بھائی اس وقت ہاتھ خالی ہے۔

دلال ہنس کر بولا۔ بابو جی بس ایسی بات کہہ دیتے ہیں کہ واہ! آپ کا حکم ہو جائے تو ہزار پانچسو آپ کے اُوپر نچھاور کردیں، ہم لوگ آپ کا مزاج دیکھتے ہیں بابو جی! بھگوان نے چاہا تو آج میں سودا کر کے اٹھوں گا۔ دلال نے صندوقچی سے دو چیزیں نکالیں۔ ایک تو نئے فیشن کا جڑاؤ کا کنگن تھا اور دوسرا کانوں کا رنگ دونوں ہی چیزیں بے مثل تھیں۔ ایسی آب تھی گویا چراغ جل رہا ہے۔ دس بج چکے تھے۔ منشی دیا ناتھ دفتر جا چکے تھے۔ رما خود کہیں نا کہیں جانے کو تیار ہو رہا تھا۔ لیکن ان دونوں

چیزوں کو دیکھ کر اس پر خود فراموشی کی حالت طاری ہو گئی۔ دونوں کیس لئے ہوئے گھر میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں کیس دیکھتے ہی دونوں عورتیں ٹوٹ پڑیں اور ان چیزوں کو نکال نکال کر دیکھنے لگیں۔ ان کی چمک دمک نے انہیں ایسا فریفتہ کر لیا کہ ان میں عیب و حسن کا امتیاز ہی نہ رہا۔

جاگیشری۔ آجکل کی چیزوں کے سامنے تو پرانی چیزیں کچھ جچتی ہی نہیں۔

جالپا۔ نہ جانے وہ عورتیں کیسے ان چیزوں کو پہنتی تھیں۔

رما نے مسکرا کر کہا۔ تو دونوں چیزیں پسند ہیں نہ

جالپا۔ پسند کیوں نہیں ہیں۔ اماں جی تم نے لو۔

جاگیشری نے اپنے درد دل کو چھپانے کے لئے سر جھکا لیا۔ جس کی ساری عمر خانگی تفکرات میں کٹ گئی وہ کیا آج خواب میں بھی ان زیوروں کے پہننے کی امید کر سکتی تھی۔

آہ! اس دکھیا کی زندگی کی کوئی بھی مراد تو پوری نہ ہوئی۔ شوہر کی آمدنی کبھی اتنی نہ ہوئی کہ بال بچوں کی پرورش کے بعد کچھ پس انداز ہوتا۔ جب سے گھر کی مالکن ہوئی تب ہی سے گویا اس کی ریاضت شروع ہوئی۔ اور ساری آرزوئیں ایک ایک کر کے خاک میں مل گئیں۔ اس نے ان زیوروں کی طرف سے آنکھیں ہٹا لیں۔ ان میں اتنی کشش تھی کہ ان کی طرف تاکتے ہوئے وہ ڈرتی تھی۔ کہیں اس کی بے نیازی کا پردہ نہ کھل جائے۔ بولی۔ میں لے کر کیا کروں گی بیٹی؟ میرے پہننے اوڑھنے کے دن تو نکل گئے! کون لایا ہے بیٹا؟ کیا دام مانگتا ہے۔

رما۔ ایک صراف دکھانے لایا ہے۔ ابھی میں نے دام وام نہیں پوچھے۔ مگر دام اونچے ہونگے۔ لینا تو تھا نہیں پوچھ کر کیا کرتا۔

جالپا۔ لینا نہیں تو یہاں لائے کیوں؟

جالپا نے یہ الفاظ کچھ اس تحکم آمیز لہجہ میں کہے کہ رما کھسیا گیا۔ ان میں کچھ ایسی تحریک، کچھ ایسی ملامت، کچھ ایسا اشتیاق تھا کہ وہ ان چیزوں کو واپس نہ لے جا سکا بولا۔ تو لے لوں۔

جالپا۔ اماں لینے کو ہی نہیں کہتیں تو لے کر کیا کرو گے؟ کیا مفت میں دے رہا ہے

رما۔ سمجھ لو مفت ہی ملتے ہیں۔

جالپا۔ سنتی ہو اماں ان کی باتیں۔ آپ جا کر لوٹا آئیے۔ جب ہاتھ میں روپے آ جائیں گے تو بہت گہنے ملیں گے۔

جاگیشری نے پر ہوس انداز سے کہا۔ روپے ابھی تو نہیں مانگتا۔

جالپا۔ ادھار بھی دے گا۔ تو سود لگا ہی لے گا۔

رما۔ تو لوٹا دوں؟ ایک بات چٹ پٹ طے کر ڈالو۔ لینا ہو لے لو ورنہ لینا ہو لوٹا دو۔ پس و پیش میں نہ پڑو۔

جالپا کو یہ بے لاگ گفتگو اس وقت بہت ناگوار معلوم ہوئی انکار کرنا اس کا کام تھا۔ رما کو تو لینے کے لئے اصرار کرنا چاہیئے تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ رما کے دل میں ذرا بھی احساس ذرا بھی درد نہیں ہے۔ جاگیشری کی طرف ہوسناک نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ لوٹا دو۔ رات دن کے تقاضے کون لیگا؟

وہ کیسوں کو بند کرنے ہی والی تھی کہ جاگیشری نے کنگن اٹھا کر پہن لیا۔ گویا چھن بھر پہن لینے ہی سے اس کی ہوس پوری ہو جائے گی۔ پھر دل میں اس اوچھے پن پر شرمندہ ہو کر وہ اسے اتارنا ہی چاہتی تھی کہ رما نے کہا۔ اب تم نے پہن لیا ہے۔ اماں تو پہنے رہو۔ میں اسے تمہاری نذر کرتا ہوں۔

جاگیشری کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ جو آرزو آج تک نہ پوری ہوئی۔ بیٹے کی سعادت مندی کی بدولت پوری ہو رہی تھی۔ لیکن کیا وہ اپنے عزیز بیٹے پر قرض کا اتنا

بوجھ رکھ دے گی۔ ابھی اس غریب کی حیثیت ہی کیا ہے۔ نہ جانے روپے جلد ہاتھ آئیں یا دیر میں۔ قیمت بھی تو نہیں معلوم۔ اگر دام اونچے ہوئے تو دے گا کہاں سے؟ اسے کتنے تقاضے سہنے پڑیں گے اور کتنا شرمندہ ہونا پڑے گا۔ پست ہمت ہو کر بولی۔ نہیں بیٹا میں نے یونہی پہن لیا تھا۔ سے جاؤ لوٹا دو۔

ماں کا اداس چہرہ دیکھ کر رما کا دل ہل اٹھا۔ کیا قرض کے خوف سے وہ اپنی بے نفس ماں کی اتنی خدمت بھی نہ کر سکے۔ ماں کی جانب اس کا کچھ قرض بھی تو ہے۔ بولا روپے بہت مل جائیں گے۔ اماں تم اس کی فکر مت کرو۔

جاگیشری نے بہو کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہی تھی کہ لڑکا مجھ پر کتنا ظلم کر رہا ہے۔ جالپا بے غرضانہ انداز سے بیٹھی ہوئی تھی۔ شاید اسے خوف ہو رہا تھا کہ رما یہ کنگن نہ لے لیں۔ اس کے بشرے سے جاگیشری کو معلوم ہو گیا۔ اسے میرا کنگن پہننا ناگوار گذرا اس نے فوراً کنگن اتار ڈالا۔ اور جالپا کی طرف بڑھ کر بولی۔ میں اپنی طرف سے تمہیں دیتی ہوں۔ بہو مجھے جو کچھ پہننا اوڑھنا تھا پہن اوڑھ چکی۔ اب تم پہنو۔ دیکھوں۔

جالپا کو اس میں مطلق شبہ نہ تھا کہ اماں کے پاس روپے موجود ہیں۔ وہ سمجھی شاید آج دیوی پسیج گئی ہیں۔ ایک لمحہ پہلے اس نے سمجھا تھا کہ روپے رما کو دینے پڑیں گے اس لئے خواہش رہنے پر بھی وہ اسے واپس کر دینا چاہتی تھی۔ جب اماں دام دینے کو تیار تھیں تو انکار کرنے کی کیا ضرورت؟ اوپرے دل سے بولی۔ روپے نہ ہوں تو رہنے دیجئے ابھی کون جلدی ہے؟

رما نے کچھ چڑھ کر کہا۔ تو تم یہ کنگن لے رہی ہو۔

جالپا۔ اماں نہیں مانتیں تو ہم کیا کریں۔

رما۔ تو ان رنگوں کو بھی کیوں نہیں رکھ لیتیں۔

جالپا۔ جا کر دام تو پوچھ آؤ۔

رما۔ تم ان چیزوں کو لے جاؤ۔

رما نے باہر آ کر دلال سے دام پوچھے تو سناٹے میں آگیا۔ کنگن سات سو کے تھے اور رنگ ڈیڑھ سو کے۔ اس کا اندازہ تھا کہ کنگن زیادہ سے زیادہ تین سو کے ہونگے اور رنگ چالیس پچاس کے۔ پچھتایا کہ ان چیزوں کے دام پہلے ہی کیوں نہ پوچھ لئے تھے۔ تو اندر جانے کی نوبت ہی کیوں آتی۔ مگر کچھ بھی ہو۔ واپس تو کرنا ہی پڑے گا۔ اتنا بڑا بوجھ وہ سر پر نہیں لے سکتا۔ دلال سے بولا۔ بڑے مہنگے ہیں بھائی۔ میرا اندازہ تو تین چار سو کے اندر ہی تھا۔

دلال کا نام چرنداس تھا بولا۔ دام میں ایک کوڑی کا فرق پڑ جائے سرکار تو منہ نہ دکھاؤں۔ لالہ دھنی رام کی کوٹھی کا تو مال ہے۔ آپ چل کر پوچھ لیں۔ چھدام روپے کی دلالی البتہ میری ہے۔ آپ کی مرضی ہے دیجئے یا نہ دیجئے۔

رما۔ تو بھئی ان داموں کی چیزیں تو اس وقت ہم نہیں لے سکتے۔

چرنداس۔ ایسی بات نہ کہئے بابوجی۔ آپ کے لئے اتنے روپے کون بڑی بات ہے آپ سے بڑھ کر دوسرا کون شوقین ہوگا۔ یہ سب رئیسوں ہی کے پسند کی چیزیں ہیں گنوار ان کی قدر کیا جانے؟

رما۔ ساڑھے آٹھ سو بہت ہوتے ہیں بھائی۔

چرنداس۔ روپوں کا منہ نہ دیکھئے بابوجی! جب بہوجی پہن کر بیٹھیں گے تو ایک نگاہ میں سارے روپے وصول ہو جائیں گے۔

رما کو یقین تھا کہ جالپا زیوروں کی یہ قیمت سن کر آپ ہی بدک جائے گی ـــ دلال سے اور زیادہ بات نہ کی۔ اندر جا کر زور سے ہنسا اور بولا۔ آپ نے اس کنگن کا کیا دام سمجھا تھا اماں؟

جاگیشری کوئی جواب دے کر بیوقوف نہ بننا چاہتی تھی۔ بولی۔ ان جڑاؤ چیزوں

میں ناپ تول کا تو کوئی حساب ہوتا نہیں۔ جتنے میں طے ہو جاوے وہی ٹھیک ہے۔

رما۔ اچھا تم بتاؤ جالپا۔ اس کنگن کا کتنا دام آ گیا ہو؟

جالپا۔ چھ سو سے کم نہیں ہے۔

رما نے قیمت کا خوف دکھا کر ان چیزوں کو واپس کر دینا چاہتا تھا۔ مگر اس میں اسے کامیابی نہ ہوئی۔ چھ اور سات میں تھوڑا ہی فرق تھا اور ممکن ہے چرنداس چھ سو ہی میں راضی ہو جائے۔ کچھ جھینپ کر بولا سچے نگینے نہیں ہیں۔

جالپا۔ کچھ بھی ہو۔ چھ سو سے زیادہ کا نہیں ہے۔

"اور رنگ کے؟"

"زیادہ سے زیادہ سو روپے۔"

"یہاں بھی چوکیں۔ ڈیڑھ سو مانگتا ہے۔"

"جھوٹا ہے کوئی۔ ہمیں ان داموں لینا ہی نہیں۔"

رما کی چال الٹی پڑی۔ جالپا کو ان چیزوں کی قیمت کے بارے میں بہت غلط فہمی ہوئی تھی۔ لیکن سات سو ہی کوئی چھوٹی رقم ہے۔ آخر جالپا اس کی مالی حالت سے تو واقف تھی۔ پھر بھی سات سو روپے کی چیزوں کے لئے منہ کھولے بیٹھی تھی۔ رما کو کیا معلوم تھا کہ جالپا کچھ اور ہی سمجھ کر کنگن پر لہرائی تھی۔ اب تو گلا چھوٹنے کی ایک ہی تدبیر تھی اور وہ یہ کہ دلال چھ سو پر راضی نہ ہو۔ بولا۔ وہ ساڑھے آٹھ سو سے کوڑی کم نہ لیگا۔

جالپا۔ تو لوٹا دو۔ نہیں چلو۔ میں پوچھتی ہوں۔

رما کی روح فنا ہو گئی۔ دلال راضی ہو گیا تو پھر اس کے بنائے کچھ نہ بنے گی۔

جالپا دالان میں آ کر بولی۔ ذرا یہاں آنا جی۔ اوہ راف! لوٹنے آئے ہو یا مال بیچنے آئے ہو۔ سات سو روپے کنگن کے مانگتے ہو۔

چرنداس۔ سات سو تو اس کی کاریگری کے دام ہیں حضور!

جالپا۔ اچھا جو اس پر سات سو نچھاور کرے۔ اس کے پاس لے جاؤ۔ یہاں تو دونوں چیزوں کے سات سو ملیں گے۔

چرنداس۔ بہوجی! آپ تو اندھیر کرتی ہو۔ کہاں ساڑھے آٹھ سو اور کہاں سات سو!

جالپا۔ تمہاری خوشی! اپنی چیز لے جاؤ۔

چرنداس نے خوشامد کرتے ہوئے کہا۔ اتنے بڑے دربار میں آکر چیز لوٹا لے جاؤں آپ یونہی پہنیں۔ دس پانچ کی بات ہوتی تو آپ کی زبان پھیرنا۔ آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ ان چیزوں پر بیسیوں روپیہ نفع ہے۔ اسی ایک پیسے میں دکان کا بھاڑا۔ دستوری دلال سب سمجھئے۔ ایک بات ایسی سمجھ کر کہہ دیجئے کہ ہمیں بھی چار پیسے مل جائیں۔ سویرے سویرے لوٹنا نہ پڑے۔

جالپا نے بے اعتنائی سے کہا۔ کہہ دیئے وہی سات سو۔

چرنداس نے ایسا منہ بنایا گویا اس کی رقم ڈوبی جارہی ہے۔ اور بولا۔ بہوجی ہے تو گھاٹا ہی مگر آپ کی بات نہیں ٹالتے بنتی۔ روپے کب ملیں گے۔

جالپا نے گھر میں جاتے ہوئے کہا۔ جلد ہی مل جائیں گے۔

جالپا اندر آکر بولی۔ آخر دیا کہ نہیں! ڈیڑھ سو صاف اڑائے لئے جاتا تھا مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ کچھ اور کم کیوں نہ کہا۔

یہ لوگ اسی طرح گاہکوں کو لوٹتے ہیں۔

رما کچھ نہ بولا۔ اس کی چالیں کچھ الٹی پڑیں کہ چار و ناچار اس کی گردن پر بوجھ لد ہی گیا۔

جالپا تو خوشی کی امنگ میں دونوں چیزیں لئے اوپر چلی گئی۔ مگر رما سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ جالپا نے اس کی حالت جان کر بھی ان چیزوں سے کیوں انکار

نہ کر دیا۔ کیوں زور دے کر نہیں کہا۔ میں نہ لونگی۔ انہیں واپس کر دو۔ اسے اس کا رنج تھا۔ آخر اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ یہ اپنی ہی حماقتوں کا کفارہ ہے۔ یہ میری ہی غلطی ہے۔ مجھے دلال کو دروازے ہی سے دھتکار دینا چاہیئے تھا۔

کھانا کھا کر جب رما اوپر کپڑے پہننے گیا تو جالپا آئینہ کے سامنے کھڑی کانوں میں رنگ پہن رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بولی۔ آج کسی اچھے کا منہ دیکھ کر اٹھی تھی۔ دو چیزیں مفت ہاتھ آگئیں۔

رمانے تعجب سے پوچھا۔ مفت کیوں؟ روپے نہ دینے پڑیں گے۔

جالپا۔ روپے تو اماں جی دیں گی۔

رما۔ کیا کچھ کہتی تھیں۔

جالپا۔ انہوں نے میری نذر کئے ہیں تو روپے کون دے گا۔

رمانے اس کے بھولے پن پر مسکرا کر کہا۔ یہ سمجھ کر تم نے یہ چیزیں لے لیں۔ اماں کو دینا ہوتا تو اسی وقت دے دیتیں جب چوری ہوئی تھی۔

جالپا سوچ میں پڑ گئی۔ بولی تو مجھے کیا معلوم تھا۔ اب بھی لوٹا سکتے ہو، کہہ دینا جس کے لئے یہ چیزیں لی تھیں اسے پسند نہیں آئیں۔

یہ کہہ کر اس نے فوراً کانوں سے رنگ نکال لئے۔ کنگن بھی اتار ڈالے اور دونوں چیزیں کیسوں میں رکھ کر اس کی طرف اس طرح بڑھا دیں جیسے کوئی بلی چوہے سے کھیل رہی ہو۔ کیا بلی چوہے کو اپنی گرفت سے باہر ہونے دیتی ہے، وہ اسے چھوڑ کر بھی نہیں چھوڑتی۔ جالپا کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا لیکن چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کیوں وہ رما کی طرف نہ دیکھ کر زمین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کسی مصیبت سے سبکدوش ہو جانے پر جو ہو جانے پر دلی مسرت ہونی چاہیئے۔ وہ کہاں تھی؟ اس کی حالت ٹھیک اسی کی سی تھی جو اپنے بیٹے کو پردیس جانے کی اجازت دے رہی ہو۔ وہی مجبوری

وہی کش مکش اس کے چہرے پر جھلک رہی تھی۔

رما اتنا بے درد نہ تھا کہ وہ چیزیں اس کے ہاتھ سے لے لیتا۔ ایسے تقاضے سہنا، شرمندہ ہونا، منہ چھپائے پھرنا، فکر کی آگ میں گھلنا سب کچھ منظور تھا مگر جالپا کو مایوس نہ کر سکتا تھا۔

اس نے مسکرا کر کہا۔ رہنے دو۔ اب لے لیا ہے تو کیا لوٹائیں؟ اماں بھی ہنسیں گی۔

جالپا نے مصنوعی مآل اندیشی سے کہا۔ اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیئے۔ ایک نئی مصیبت مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔

رما نے گویا پانی میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ ایشور مالک ہے فوراً نیچے چلا گیا۔

ہم عارضی شرم و لحاظ میں پڑھ کر اپنی زندگی کے سکون اور عافیت کا کیسے خون کر دیتے ہیں۔ اگر جالپا حسن کے اس جھونکے میں اپنے مستقبل کو رکھ سکتی۔ اگر رما جھوٹے لحاظ کے آگے سر نہ جھکا دیتا۔ دونوں کے دلوں میں سچی ہمدردی ہوتی۔ تو وہ گمراہ ہو کر تباہی کی طرف کیوں گامزن ہوتے۔

گیارہ بج گئے تھے۔ دفتر کے لئے دیر ہو رہی تھی۔ مگر رما اس طرح جا رہا تھا جیسے اپنے کسی عزیز کو دفن کر کے لوٹ رہا ہو۔

(۱۵)

جالپا اب وہ خلوت پسند نازنین نہ تھی جو دن بھر منہ لپیٹے اُداس پڑی رہتی تھی۔ اسے اب گھر میں بیٹھنا اچھا نہ لگتا تھا۔ اب تک وہ مجبور تھی۔ کہیں آجا نہ سکتی تھی۔ اب خدا کے فضل سے اس کے پاس بھی گہنے ہو گئے تھے۔ پھر وہ گوشۂ تنہائی میں کیوں پڑی رہتی۔ زیور لباس کوئی مٹھائی تو نہیں ہے، جس کی لذت تنہائی میں

حاصل کی جا سکے۔ محلے یا برادری میں کہیں سے بلاوا آتا تو وہ ساس کے ساتھ ضرور جاتی۔ کچھ دنوں کے بعد ساس کی ضرورت بھی نہ رہی۔ وہ اکیلی ہی آنے جانے لگی۔ اس کی شکل وصورت، زیور، لباس اور آداب و اخلاق نے تھوڑے ہی دنوں میں اسے محلے کی عورتوں میں اعزاز کے رتبہ پر پہنچا دیا۔ اس کے بغیر محفل سونی رہتی۔ اس کے گلے میں اتنا لوچ تھا۔ انداز گفتگو اتنا دل آویز اور آدائیں اتنی دلکش کہ وہ محفل کی رانی معلوم ہوتی تھی۔ روز ہی کہیں نہ کہیں عورتوں کا جماؤ ہو جاتا۔ گھنٹے دو گھنٹے گا بجا کر یا گپ شپ کر کے عورتیں دل بہلا لیا کرتیں۔ بھاگن میں پندرہ دن لگاتار برابر گانا ہوتا رہا۔ کبھی کسی کے گھر کبھی کسی کے گھر۔ جالپا نے جیسا حسن پایا تھا ویسا ہی فیاض دل بھی پایا تھا۔ مہمان نوازیوں کا خرچ۔ بیشتر اس کے ذمہ آتا۔ کبھی کبھی گانے والیاں بلائی جاتیں۔ ان کی خاطر و مدارات کا بار بھی اسی پر تھا۔ کبھی کبھی مستورات کے ساتھ ندی اشنان کو جاتی۔ تانگے کا کرایہ اور ناشتہ کا خرچ اسی کے متھے جاتا۔ اسی طرح سے دو تین روپیہ روز اڑ جاتے تھے۔ رما جانثار شوہر تھا۔ جالپا کے قدموں پر اپنی جان تک صدقے کر دیتا۔ روپیہ کی حقیقت کیا تھی اس کا منہ تاکتا رہتا تھا۔

ایک بار مستورات کو سنیما دیکھنے کی دھن سوار ہوئی۔ اس میں انہیں مزا آیا کہ آئے دن سنیما کی سیر ہونے لگی۔ رما کو اب تک سنیما کا شوق نہ تھا۔ شوق ہوتا بھی تو کیا کرتا اب ہاتھ میں پیسے آنے لگے۔ اس پر جالپا کا اصرار پھر بھلا وہ کیوں نہ جاتا۔ سنیما حال میں ایسی کتنی ہی عورتیں نظر آتیں جو منہ کھولے بے حجاب ہنستی بولتی رہتی تھیں۔ ان کی آزادی نادانستہ طور پر جالپا پر بھی جادو ڈالتی جاتی تھی۔ وہ گھر سے باہر نکلتے ہی منہ کھول لیتی مگر حجاب کے باعث پردہ نشینوں کے ساتھ ہی بیٹھتی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ رما بھی اس کے ساتھ بیٹھے۔ آخر وہ ان فیشن ایبل عورتوں سے کس بات میں کم ہے۔ روپ رنگ میں کم نہیں۔ سج دھج میں کم نہیں؟ پھر وہ پردے والیوں کے ساتھ کیوں بیٹھے۔ رما

بہت تعلیم یافتہ ہونے پر بھی دورِ جدید کے اثر سے آزاد خیال تھا۔ پہلے تو وہ پردے کا ایسا حامی تھا کہ ماں کو کبھی گنگا اشنان کرنے لے جاتا۔ تو پنڈول تک سے نہ بولنے دیتا۔ کبھی ماں کی ہنسی مردانے میں سنائی دیتی تو آکر بگڑتا۔ تم کو ذرا بھی شرم نہیں اماں۔ باہر لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور تم ہنس رہی ہو۔ ماں شرما جاتی تھی مگر عمر کے ساتھ رما کا وہ حجاب غائب ہو جاتا تھا۔ اس پر جالپا کا شگفتہ حسن اسے اور بھی دلیر بنا رہا تھا۔ جالپا بدوضع بدشکل یا بدتمیز ہوتی تو اسے وہ زبردستی پردے میں بٹھاتا۔ اس کے ساتھ سیر کرنے میں اسے شرم آتی۔ جالپا جیسی بے مثل حسینہ کے ساتھ سیر کرنے میں لطف کے ساتھ ہی کچھ وقار بھی تھا۔ وہاں کے مہذب طبقے میں کوئی نازنین اتنی قبول صورت اتنی خوش ادا اتنی خوش قامت نہ تھی۔ دیہات کی لڑکی ہونے پر بھی وہ شہریت کے رنگ میں ایسی رنگ گئی تھی۔ گویا شہر ہی میں اس کی پرورش ہوئی ہے۔ تھوڑی کمی انگریزی تعلیم کی تھی۔ وہ رما پوری کئے دیتا تھا۔

مگر پردے کی یہ بندش ٹوٹے کیسے؟ سنیما ہال میں رما کے کتنے ہی دوست کتنے ہی شناسا بیٹھے نظر آتے تھے۔ وہ اسے جالپا کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر کتنا مضحکہ اڑائیں گے۔ کتنے فقرے کسیں گے۔

آخر ایک دن اس نے سب کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑے ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جالپا سے بولا۔ آج ہم تم سنیما گھر میں ساتھ بیٹھیں گے۔

جالپا کے دل میں گدگدی ہونے لگی۔ بولی۔ سچ؟ نہیں بھائی ساتھ والیاں زندہ نہ چھوڑیں گی۔

رما۔ اس طرح ڈرنے سے تو کچھ نہ ہوگا۔ یہ کیا مذاق ہے کہ عورتیں منہ چھپائے چق کی آڑ میں بیٹھی رہیں۔ اس طرح بیٹھنا ہی طے ہو گیا۔ دو چار دن دونوں کچھ جھینپتے رہے لیکن پھر ہمت کھل گئی۔ یہاں تک کہ رما اور جالپا شام کے وقت پارک میں ساتھ ساتھ

ٹہلتے نظر آنے لگے۔

ایک دن جالیبا نے مسکرا کر کہا۔ کہیں بابوجی دیکھ لیں تو؟

"تو کیا؟ کچھ نہیں۔"

"میں تو مارے شرم کے گڑ جاؤں!"

"ابھی تو مجھے بھی شرم آئے گی۔ مگر وہ خود ادھر نہ آئیں گے۔"

"اور کہیں اماں دیکھ لیں تو؟"

"اماں سے کون ڈرتا ہے۔ دو دلیلوں میں ٹھیک کر دونگا۔"

دس پانچ دن سے اس نئی سوسائٹی میں اپنا رنگ جما لیا۔ اس نے اس دائرے میں کچھ اس طرح قدم رکھا جیسے کوئی باکمال مقرر پہلی بار منبر پر آتا ہے اور نقاد ان نامہرد ہونے پر بھی اس کے کمال کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ جالیا کے حسن میں وہ تمکنت، وہ خودداری تھی جو عالی نسبی کی دلیل ہے۔ پہلے ہی دن ایک خاتون نے جالیا کو چائے کی دعوت دی اور جالیا نے خواہش نہ ہونے پر بھی اسے قبول کر لیا۔

جب دونوں آدمی وہاں سے لوٹے تو رما نے متفکرانہ انداز سے کہا۔ تو کل اس کی چائے پارٹی میں جانا پڑے گا۔

"تو کیا کرتی! انکار کرتے بھی تو نہ بنتا تھا۔"

تو سویرے تمہارے لئے ایک اچھی سی ساڑھی لادوں؟

"میرے پاس تو ساڑھیاں ہیں۔ ذرا دیر کے لئے پچاس ساٹھ روپے خرچ کرنے سے کیا فائدہ؟"

"تمہارے پاس اچھی ساڑھی کہاں ہے؟ جیسی اس کی ساڑھی تھی ویسی ہی میں بھی لاؤں گا۔"

"مجھے صاف کہہ دینا چاہیئے تھا کہ میں نہیں آسکتی۔"

"پھر اس کی دعوت بھی تو کرنی پڑے گی؟"

"یہ تو بڑی مصیبت گلے پڑی۔"

"مصیبت تو کچھ نہیں ہے۔ صرف یہی خیال ہے کہ میرا مکان بے مصرف ہے۔ میز کرسیاں، چائے کے سیٹ تو رمیش کے یہاں سے مانگ لاؤنگا۔ لیکن گھر کے لئے کیا کروں؟"

"کیا یہ ضروری ہے کہ ہم بھی اس کی دعوت کریں؟"

رما نے اس جملے پر کچھ التفات نہ کیا۔ اسے جالپا کے لئے ایک خوبصورت کلائی کی گھڑی اور ایک ساڑھی کی فکر پیدا ہوگئی۔ اس کے پاس ایک کوڑی بھی نہ تھی اس کا خرچ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ ابھی تک صرافوں کو ایک پیسہ دینے کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ ایک بار گنگو نے اشارے سے تقاضا بھی کیا تھا لیکن یہ بھی تو نہیں ہو سکتا کہ جالپا پھٹے حالوں چائے پارٹی میں جائے۔ رات بھر تو اس نے صبر کیا۔ دوسرے دن دونوں چیزیں لاکر ہی دم لیا۔

جالپا نے جھنجلا کر کہا۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا۔ ڈیڑھ سو سے کم کی نہ ہونگی۔

ڈیڑھ سو! اتنا فضول خرچ میں نہیں ہوں۔"

"ڈیڑھ سو سے کم کی یہ چیزیں نہیں ہیں۔"

رما نے جالپا کی کلائی پر گھڑی باندھ دی اور فریفتہ ہو کر بولا۔ تمہاری کلائی پہ کیسی کھل رہی ہے؟ میرے روپے وصول ہو گئے۔

سچ بتاؤ۔ کتنے خرچ ہوئے۔"

"سچ بتا دوں۔ ایک سو پینتیس روپے۔ پچھتر روپے کی ساڑھی، دس کے جوتے، اور پچاس کی گھڑی۔"

جالپا ملول ہو کر بولی۔ وہ ڈیڑھ سو ہی ہوئے۔ مگر یہ سب روپے ادا کیسے

ہونگے۔ اس چڑیل نے ناحق مجھے دعوت دی۔ اب میں باہر جانا ہی چھوڑ دوں گی۔

رما بھی اسی فکر میں غرق تھا۔ پر اس کا اظہار کر کے جالپا کی مسرت میں کیسے رخنہ ڈالتا بولا۔ سب ادا ہو جائے گا۔

" جالپا نے ترش ہو کر کہا۔ کہاں سے ادا ہو جائے گا۔ ذرا سنوں ؟ کوڑی تو بچتی نہیں ادا کہاں سے ہو جائیگا۔ ان چیزوں کو لوٹا آؤ۔"

رما نے منت آمیز لہجہ میں کہا۔ ان چیزوں کو رکھ لو۔ پھر تم سے بغیر پوچھے نہ لاؤنگا

شام کو جالپا نے نئی ساڑھی پہنی۔ گھڑی کلائی پر باندھی اور آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو غرور اور مسرت سے اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔ اس نے ان چیزوں کو واپس کرنے کے لئے خواہ سچے دل سے اصرار کیا ہو۔ پر اس وقت وہ اتنی نفس کشی کے لئے تیار نہ تھی۔ شام کو جالپا اور رما چھاؤنی کی طرف چلے۔ اس خاتون کا بنگلہ ملنے پر دیر نہ ہوئی پھاٹک پر سائن بورڈ تھا۔ "اندر بھوشن ایڈووکیٹ" اب معلوم ہوا۔ وہ ان وکیل صاحب کی بیوی تھی۔ پنڈت جی یہاں کے نامی وکیل تھے۔ رما نے انہیں کئی بار دیکھا تھا لیکن اتنے بڑے آدمی سے اس کے ذاتی مراسم کیا ہوتے۔ چھ مہینے پہلے وہ اس کا خیال بھی نہ کر سکتا تھا کہ کبھی وہ ان کے یہاں مدعو ہوگا۔ مگر جالپا کی بدولت وہ اعزاز بھی اسے حاصل ہو گیا۔ اس وقت وہ شہر کے سب سے بڑے وکیل کا مہمان تھا۔

رما نے سوچا تھا۔ یہاں بہت سے آدمیوں کی دعوت ہوگی۔ مگر یہاں وکیل صاحب اور ان کی بیوی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ انہیں دیکھتے ہی باہر نکل آئی اور انہیں اندر لے جا کر اپنے شوہر سے ان کا تعارف کرایا۔ پنڈت جی نے آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے دونوں مہمانوں سے ہاتھ ملایا اور رما سے بولے۔ معاف کیجئے گا بابو صاحب میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ یہاں آپ کسی دفتر میں ہیں ؟

رما نے جھینپتے ہوئے کہا۔ جی ہاں میونسپل آفس میں ہوں۔ ابھی حال ہی میں

آیا ہوں۔ قانون کی طرف جانے کا ارادہ تھا۔ لیکن یہاں نئے وکیلوں کی حالت دیکھ کر ہمت نہ پڑی۔

رمانے اپنا وقار بڑھانے کے لئے تھوڑا سا جھوٹ بولنا ضروری سمجھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا اثر خاطر خواہ ہوا۔ اگر وہ صاف کہہ دیتا۔ میں پچیس روپے کا کلرک ہوں تو شاید وکیل صاحب اس سے ہم کلام ہونے میں اپنی توہین سمجھتے۔ مسکرا کر بولے۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو ادھر نہیں آئے۔ دو چار سال کے بعد آپ کسی اچھے عہدے پر پہنچ جائیں گے۔ یہاں ممکن ہے تب تک آپ کو کوئی مقدمہ ہی نہ ملتا۔

جالپا کو ابھی تک شبہ ہو رہا تھا کہ رتن وکیل صاحب کی لڑکی ہے یا بیوی؟ وکیل صاحب کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ چکنی چاند آس پاس کے سفید بالوں کے بیچ میں وارنش کی ہوئی، لکڑی کی طرح چمک رہی تھی۔ مونچھیں صاف تھیں۔ لیکن ماتھے کے شکن اور گالوں کی جھریاں بتا رہی تھیں۔ مسافر منزل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ مریض آرام کرسی پر لیٹے ہوئے وہ ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے برسوں کا مریض ہو۔ ہاں رنگ گورا تھا جو ساٹھ سال کی گرمی اور سردی کھا کر بھی اڑ چکا تھا۔ اونچی ناک تھی۔ اونچی پیشانی اور بڑی بڑی آنکھیں جن میں غرور لبریز تھا۔ اس کے برعکس۔ رتن سانولی بیچ اور بھرے ہوئے بدن کی عورت تھی۔ نہایت ملنسار اور خنداں پیشانی جیسے غرور چھو تک نہ گیا تھا۔ اس کی شکل میں حسن کی کوئی علامت نہ تھی۔ ناک چپٹی تھی۔ چہرہ گول۔ آنکھیں چھوٹی پھر بھی وہ رانی سی لگتی تھی۔ جالپا اس کے سامنے ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے سورج مکھی کے سامنے جوہی کا پھول!

چائے آئی۔ میوے۔ پھل۔ مٹھائی۔ برف کی قلفی سب میزوں پر چن دی گئی رتن اور جالپا ایک میز پر بیٹھیں۔ دوسری میز رما اور وکیل صاحب کی تھی۔ رما اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ مگر وکیل صاحب ابھی آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے۔

رمانے مسکرا کر وکیل صاحب سے کہا۔ آپ بھی تو آئیے۔

وکیل صاحب نے لیٹے ہی لیٹے جواب دیا۔ آپ شروع کیجئے میں بھی آجاتا ہوں۔

لوگوں نے چائے پی۔ پھل کھائے۔ مگر وکیل صاحب کے سامنے ہنستے بولتے رما اور جالیا دونوں ہی جھجکتے تھے۔ زندہ دل بوڑھوں کے ساتھ تو صحت کا لطف اٹھایا جا سکتا تھا لیکن ایسے روکھے سر کہ جیسے بے جان آدمی جوان بھی ہوں تو دوسرے کو افسردہ دل بنا دیتے ہیں۔ وکیل صاحب نے بہت اصرار کرنے پر دو گھونٹ چائے پی۔ دور سے بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔ اس لئے جب رتن نے جالیا سے کہا۔ چلو ہم لوگ ذرا باغیچہ کی سیر کر آویں۔ ان دونوں صاحبوں کو قانون اور اخلاق کی بحث کرنے دیں تو گویا جالیا کے گلے کا پھندا کھل گیا۔ رمانے پنجرے میں بند طائروں کی طرح ان دونوں کو کمرے سے نکلتے دیکھا اور ایک لمبی سانس لی۔ وہ سمجھا تھا کہ یہ مصیبت اس کے سر آکے گی تو یہاں آنے کا نام نہ لیتا۔

وکیل صاحب نے منہ سکوڑ کر پہلو بدلا۔ اور بولے۔ معلوم نہیں کہ پیٹ میں کیا ہو گیا ہے کہ کوئی چیز ہضم ہی نہیں ہوتی۔ دودھ بھی ہضم نہیں ہوتا۔ چائے کو نہ جانے لوگ اتنے شوق سے پیتے ہیں۔ مجھے تو اس کی صورت سے نفرت ہے۔ پیتے ہی جسم میں اینٹھن سی ہونے لگتی ہے اور آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں۔

رمانے پوچھا۔ آپ نے ہاضمہ کی دوا نہیں کی۔

وکیل صاحب نے بے خانہ انداز سے کہا۔ دواؤں پر مجھے ذرا بھی اعتبار نہیں ان ویدوں اور ڈاکٹروں سے زیادہ کج فہم آدمی دنیا میں نہ ملیں گے۔ کسی میں بھی تشخیص کا مادہ نہیں۔ کبھی دو ویدوں یا ڈاکٹروں کی تشخیص ایک سال نہ ہوگی۔ علامتیں وہی ہیں مگر ایک وید خون کا فساد بتلاتا ہے دوسرا اصفر کا۔ ایک ڈاکٹر پھیپھڑے کا آماس بتلاتا ہے تو دوسرا معدے کا سرطان۔ بس قیاس سے دوا کی جاتی ہے اور بے رحمی سے

مریضوں کی گردن پر چھری پھیری جاتی ہے۔ ان ڈاکٹروں نے تو اب تک مجھے جہنم میں پہنچا دیا ہوتا۔ پر کسی طرح ان کے پنجے سے نکل بھاگا۔ یوگ کے علم کی بڑی تعریف سنتا ہوں لیکن ایسا مہاتما نہیں ملتا جس سے کچھ سیکھ سکوں۔

یہاں تو فن طب پر اعتراضات ہو رہے ہیں۔ اور ادھر دونوں حسینوں میں راز و نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں۔ رتن نے مسکرا کر کہا۔ وکیل صاحب کو دیکھ کر تمہیں بڑا تعجب ہوا ہوگا۔ میں ان کی دوسری بیوی ہوں۔ پہلی بیوی کو مرے بتیس سال ہو گئے اس وقت ان کی عمر کل پچیس سال کی تھی۔ لوگوں نے سمجھایا۔ دوسری شادی کر لو۔ لیکن ایک لڑکا موجود تھا۔ شادی کرنے سے انکار کر دیا اور تیس سال تک تنہا رہے۔ مگر آج پانچ سال ہوئے جوان بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ تب دوسری شادی کی فکر ہوئی۔ میرے ماں باپ نہ تھے، ماموں نے میری پرورش کی تھی۔ کہہ نہیں سکتی کہ ان سے کچھ لے لیا۔ یا ان کی شرافت پر ریجھ گئے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ ایشور کی یہی مرضی تھی۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ بس اگر کوئی شکایت ہے تو یہی کہ میں روز بروز موٹی ہوتی چلی جاتی ہوں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تمہیں اولاد نہیں ہو سکتی۔ بہن مجھے تو اولاد کی آرزو نہیں۔ لیکن وکیل صاحب نے اولاد کے لئے شادی ہی کی تھی۔ میری یہ حالت دیکھ کر انہیں بہت رنج ہوتا ہے۔ میں ہی ان کی ساری شکایتوں کی جڑ ہوں۔ آج ایشور مجھے ایک لڑکا دیدے ان کے سارے روگ دور ہو جائیں۔ کتنا چاہتی ہوں کہ دبلی ہو جاؤں۔ گرم پانی سے ٹب اشنان کرتی ہوں۔ روز پیدل گھومنے جاتی ہوں گھی دودھ بہت کم کھاتی ہوں۔ خوراک بھی آدھی کر دی ہے جتنی محنت کر سکتی ہوں اتنی کرتی ہوں۔ پھر بھی دن بدن موٹی ہوتی جاتی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

جالپا نے پوچھا۔ وکیل صاحب تم سے ناراض رہتے ہوں گے۔

رتن نے کہا۔ نہیں بہن بالکل نہیں۔ کبھی بھول کر بھی مجھ سے اس کا چرچا نہیں

کیا شکایت کا کبھی ایک حرف بھی میں نے ان کی زبان سے نہیں سُنا۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ یہ فکر انہیں گھلائے ڈالتی ہے۔ اپنا کوئی قابو نہیں ہے کیا کروں؟ میں جتنا چاہوں خرچ کروں۔ جیسے چاہوں رہوں۔ کبھی نہیں بولتے۔ جو کچھ پاتے ہیں لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔ سمجھاتی ہوں اب تمہیں وکالت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آرام کیوں نہیں کرتے۔ مگر ان سے بیٹھا بھی نہیں جاتا۔ صرف دو چپاتیوں سے ناتا ہے۔ میں نے بہت ضد کی تو دو چار دانے انگور کے کھا لئے۔ مجھے تو ان پر رحم آتا ہے جو خدمت اپنے امکان میں ہے وہ کرتی ہوں۔ آخر وہ میرے ہی لئے تو اپنی جان کھپا رہے ہیں۔

جالپا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ایسے نیک نفس آدمی کو دیوتا سمجھنا چاہئے تیس سال تک تنہا رہنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔

رتن۔ ہاں بہن! ہیں تو دیوتا ہی۔ اب بھی کبھی پہلی بیوی کی یاد آجاتی ہے تو رونے لگتے ہیں۔ دیکھنے میں جتنے روکھے معلوم ہوتے ہیں۔ اندر سے اتنے ہی نرم ہیں یتیموں اور بیواؤں کے وظیفے باندھ رکھے ہیں۔ تمہارا یہ کنگن تو بڑا خوشنما ہے۔

جالپا۔ ہاں! ہوشیار کاریگر نے بنایا ہے۔

رتن۔ میں تو یہاں کسی کو جانتی نہیں۔ وکیل صاحب کو تکلیف دینے کو جی نہیں چاہتا۔ معمولی سناروں سے بنواتے ڈر لگتا ہے نہ جانے کیا ملا دیں۔ تم اپنے بابوجی سے میرے لئے ایسا ہی ایک جوڑ کنگن بنوا دو۔

جالپا نے کنگن بنوانے کا وعدہ کیا۔

رتن۔ آج تمہارے آنے سے طبیعت بہت خوش ہوئی۔ دن بھر اکیلی پڑی رہتی ہوں۔ کس کے پاس جاؤں؟ دو ایک عورتوں سے راہ رسم بڑھائی۔ چاہا کہ ان سے بہناپا جوڑوں۔ لیکن ان کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ان سے دور

رہتا ہے، اچھا معلوم ہوا۔ شوق کی چیزوں پر ایسا ٹوٹتی تھی کہ دیکھ کر شرم آتی تھی
تم گھنٹے آدھ گھنٹے کے لئے روز چلی آیا کرو۔

جالپا۔ واہ! یہ تو میرے دل کی بات ہوئی۔

رتن۔ میں موٹر بھیج دیا کرونگی۔

"کیا ضرورت ہے؟ تانگے تو ملتے ہی ہیں۔"

"نہ جانے کیوں مجھے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ مجھے پاکر رما ناتھ اپنی تقدیر کو سراہتے ہوں گے۔"

جالپا مسکرا کر بولی۔"تقدیر تو نہیں سراہتے۔ گھر کیاں جما یا کرتے ہیں۔"

اسی اثنا میں رما ناتھ بھی وہاں آپہنچا۔ جالپا نے اس سے کنگن کا ذکر کیا
رما نے سرخرو ہونے کا موقع پاکر کہا۔ ہاں بنوا دونگا۔ اس سے بہت اچھے
بنا سکتا ہے۔

رتن نے پوچھا۔ اس جوڑے کے کیا لئے تھے۔

جالپا آٹھ سو کے تھے۔

رتن "کوئی ہرج نہیں۔ مگر بالکل ایسے ہی ہوں۔ اسی نمونے کے۔"

رما۔ ہاں! بنوا دوں گا۔

رتن۔ مگر بھائی ابھی میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

روپے کے معاملے میں عورتوں کے سامنے مردوں کی زبان بند ہو جاتی ہے، کیا وہ کہہ سکتا تھا اس وقت میرے پاس بھی روپے نہیں ہیں۔ یہ عذر وہ کسی حالت میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ چاہے اسے دوسروں سے قرض لینا پڑے۔ دوسروں کی خوشامد کرنی پڑے مگر ایک حسینہ کے روبرو اپنی مجبوری کا اظہار نہ کرے گا۔ شاید اس لئے جب رمانے دلیرانہ انداز سے کہا کہ روپے کی کوئی بات نہیں، جب چاہے دے دیجئے تو وہ خوش

ہوگئی۔

رتن۔ تو کب تک اُمید کروں۔

رما۔ میں آج ہی صراف سے کہہ دوں گا۔ زیادہ سے زیادہ دو ہفتہ سمجھئے۔

جالپا نے رتن کو اپنے گھر جائے کی دعوت دی۔ اور دونوں گلے مل کر بدا ہوئیں۔ گھر پہنچے تو شام ہوگئی تھی۔ رمیش بابو بیٹھے ہوئے تھے۔ جالپا تو اتر کر اندر چلی گئی۔ رما رمیش کے پاس جاکر بولا۔ آپ کو آنے میں دیر ہوئی۔

رمیش۔ ابھی تو چلا آ رہا ہوں۔ وکیل صاحب کے یہاں دعوت تھی؟

رما جی ہاں! تین روپے کی چپت پڑ گئی۔

رمیش۔ کوئی ہرج نہیں۔ یہ روپے وصول ہو جائیں گے۔ بڑے آدمیوں سے راہ و رسم پیدا ہو جائے تو بڑے بڑے کام نکلتے ہیں۔

رما۔ اب کی اتوار کو انہیں بھی چائے کی دعوت دے آیا ہوں۔

رمیش نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ تب تو یہ کہو۔ کہ تم سے یارانہ ہو گیا۔ کہو تو میں بھی آجاؤں۔ سنا ہے وکیل صاحب کے ایک بھائی انجینئر ہیں۔ میرے ایک سالے بہت دنوں سے بیکار بیٹھے ہوئے ہیں اگر وکیل صاحب اس کی سفارش کر دیں تو غریب کو جگہ مل جائے۔ تم ذرا انٹروڈکشن کر دینا۔ باقی میں اور سب کر لونگا۔ پارٹی کا انتظام ایشور نے چاہا تو ایسا ہوگا کہ وہ لوگ خوش ہو جائیں گے۔ سارا انتظام میرے اوپر چھوڑ دو۔ نہ قلی کی ضرورت نہ مزدور کی۔ انہیں موسل بینڈ کو بلا لونگا۔

رما۔ ابھی دو تین مہینے ہوئے آپ نے انہیں ایک جگہ تو دلا دی تھی۔

رمیش۔ اجی ابھی اور چھ باقی ہیں۔ پورے سات دبیوں کی پلٹن ہے۔ ذرا بیٹھ جاؤ ضروری چیزوں کی فہرست بنالی جائے کتنے مہمان ہوں گے۔

رما۔ بس وکیل صاحب ہونگے اور ان کی بیوی۔

ریتش - یہ بہت اچھا کیا۔ اس طرح اپنے عرض حال کا اچھا موقع رہے گا۔ دونوں آدمیوں نے بیٹھ کر ایک لمبی فہرست تیار کی اور دوسرے ہی دن سے ریتش بابو نے سامان بہم پہنچانا شروع کیا۔ ان کی رسائی اچھے اچھے گھروں میں تھی۔ آرائش کی ایسی نفیس چیزیں فراہم کر کے لائے کہ سارا گھر جگمگا اٹھا۔ منشی دیا ناتھ بھی ان تیاریوں میں شریک تھے چیزوں کو قرینے سے سجانا ان کا کام تھا۔ کون گملا کہاں رکھا جائے۔ کون تصویر کہاں لٹکائی جائے کون سا قالین کہاں بچھایا جائے۔ ان مسائل پر تینوں آدمیوں میں گھنٹوں مناظرے ہوتے تھے۔ دفتر جانے سے پہلے اور دفتر آنے کے بعد تینوں اسی کام میں لگ جاتے۔ ایک دن اس بات پر بحث چھڑ گئی کہ کمرے میں آئینہ کہاں رکھا جائے۔ دیا ناتھ کہتے تھے کہ اس کمرے میں آئینہ کی ضرورت نہیں۔ آئینہ پیچھے والے کمرے میں رکھنا چاہیئے۔ ریتش کو اس سے اختلاف تھا۔ اور رما دبدھے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ نہ ان کی سی کہہ سکتا تھا نہ ان کی سی۔

دیا ناتھ نے گرم ہو کر کہا۔ میں نے سینکڑوں انگریزوں کے ڈرائنگ روم دیکھے ہیں۔ مگر کہیں آئینہ نہیں دیکھا۔ آئینہ غسل خانہ میں رکھنا چاہیئے۔ یہاں آئینہ رکھنا بے تکی سی بات ہے۔

ریتش نے اتنی سرگرمی سے جواب دیا۔ مجھے اتنے انگریزوں سے سابقہ تو نہیں پڑا۔ لیکن دو چار بنگلے دیکھے ضرور ہیں۔ اور ان میں آئینہ لگا ہوا دیکھا۔ پھر اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ ہر ایک بات میں انہیں کی نقل کریں۔ ہم انگریز نہیں ہندوستانی ہیں ہندوستانی رؤسا کے کمروں میں بڑے بڑے قد آدم آئینے لگے ہوتے ہیں۔ یہ تو آپ نے ہمارے بگڑے ہوئے بابوؤں کی سی بات کہی۔ جو آرائش و لباس میں، رفتار و گفتار میں، چائے و شراب میں غرض نمائش کی سبھی باتوں میں انگریزوں کا منہ چڑھاتے ہیں۔ لیکن جن باتوں نے انگریزوں کو انگریز بنا دیا ہے اور جن کی بدولت وہ دنیا پر حکومت کرتے ہیں ان کی ہوا تک نہیں

لگنے دیتے۔ کیا آپ کو بھی بڑھاپے میں انگریز بننے کا شوق چرایا ہے۔

دیانا تھ انگریزوں کی نقل کو بہت معیوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کوٹ نہیں پہنا تھا۔ چائے پیتے تھے۔ مگر چینی کے سیٹ کی قید نہ تھی، کٹورا، کٹوری گلاس، لوٹا۔ تسلا غرض کسی سے بھی اعتراض نہ تھا۔ لیکن اس وقت تو انہیں بحث کی دھن سوار تھی۔ بولے۔ ہندوستانی رئیسوں کے کمروں میں میز کرسیاں نہیں ہوتیں۔ فرش ہوتا ہے۔ آپ نے کرسی میز لگا کر اسے انگریزی طرز پر تو سجا دیا۔ آپ آئینہ کے دفعے ہندوستان کی مثال لے رہے ہیں۔ یا ہندوستانی رکھیئے یا انگریزی! یہ کیا کہ آدھا تیتر، آدھا بٹیر، کوٹ پتلون پر چوگوشیہ ٹوپی تو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

رمیش بابو نے سمجھا تھا کہ دیانا تھ لاجواب ہو جائیں گے لیکن یہ جواب سُنا تو جکرا گئے۔ میدان ہاتھ سے جاتا ہوا دکھائی دیا۔ بولے۔ تو آپ نے کسی انگریز کے کمرے میں آئینہ نہیں دیکھا۔ بھلا ایسے دس پانچ انگریزوں کے نام تو بتلایئے۔

ایک آپ کا وہی کرنٹا ہیڈ کلرک ہے۔ اس کے سوا اور کسی انگریز کے کمرے میں تو آپ نے قدم بھی نہ رکھا ہوگا۔ اس کرنٹے کو آپ نے انگریزی مذاق کا نمونہ سمجھ لیا۔ خوب! مانتا ہوں۔

دیانا تھ کچھ خفیف ہو کر بولے۔ یہ تو آپ کی زبان ہے۔ اُسے کرنٹا چمر ٹیشن پلپلی جو چاہیں کہیں۔ لیکن رنگ کو چھوڑ کر وہ کسی بات میں انگریزوں سے کم نہیں۔

رمیش اس کا جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ ایک موٹر کار دروازے پر آ کر رُکی۔ اور رتن برآمدے میں آئی۔ تینوں آدمی چٹ پٹ باہر نکل آئے۔ رما کو اس وقت رتن کا آنا بُرا معلوم ہوا۔ ڈر رہا تھا کہ کہیں کمرے میں نہ چلی جائے۔ نہیں تو ساری قلعی کھل جائے آگے بڑھ کر ہاتھ ملاتا ہوا بولا۔ آیئے۔ یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے دوست رمیش بابو ہیں۔ لیکن ان دونوں بھلے آدمیوں نے نہ اس سے ہاتھ ملایا اور نہ اپنی جگہ سے ہلے

رتن نے بھی ان سے ہاتھ ملانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ دُور ہی سے نمسکار کرکے رما سے بولی۔ میں بیٹھوں گی نہیں اس وقت فرصت نہیں ہے۔ آپ سے کچھ کہنا تھا یہ کہتے ہوئے وہ رما کے ساتھ موٹر تک آئی۔ اور آہستہ سے بولی۔ آپ نے صراف سے کہہ تو دیا ہوگا؟

رما نے برجستہ کہا۔ جی ہاں بنا رہا ہے۔

رتن۔ اس دن میں نے کہا تھا کہ روپے نہ دے سکونگی۔ پھر خیال آیا آپ کو تکلیف ہو۔ اس لئے روپئے کا انتظام کر لیا۔ آٹھ سو چاہیئے نہ؟

جالپا نے کنگن کے دام آٹھ سو بتائے تھے۔ رما چاہتا تو اتنے روپے لے سکتا تھا لیکن رتن کی سادگی اور بے تکلفی نے جیسے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بیوپاریوں سے دو دو چار چار آنے لیتے ذرا بھی نہ جھجکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب بھی گاہکوں کو مونڈ تے ہیں۔ رتن کے ساتھ اسے اپنے طرز عمل میں کسی طرح تامل نہ ہوتا تھا۔ لیکن اس شرافت اور اخلاق کی دیوی سے دغا کرنے کے لئے کسی پرانے پاپی کی ضرورت تھی۔ کچھ شرماتا ہوا بولا۔ کیا جالپا نے کنگن کے دام آٹھ سو بتلائے تھے۔ انہیں شاید یاد نہ رہی ہوگی۔ ان کے کنگن چھ سو کے ہیں۔ آپ چاہیں تو آٹھ سو کے بنوا دوں۔

رتن۔ نہیں! مجھے تو وہی پسند ہیں آپ چھ سو کا ہی بنوائیے۔

اس نے موٹر پر سے اپنی تھیلی اٹھا کر سو سو روپے کے چھ نوٹ نکالے۔ رما نے کہا ایسی جلدی کیا تھی چیز تیار ہو جاتی تو حساب ہو جاتا۔

رتن نے موٹر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میرے پاس خرچ ہو جاتے۔ اس لئے میں نے سوچا۔ آپ کے سر پر لاد دیں۔ میری عادت ہے کہ جو کام کرتی ہوں جلد سے جلد کر ڈالتی ہوں۔ تاخیر سے مجھے الجھن ہوتی ہے۔

موٹر چلی گئی۔ رما روپیہ لئے ہوئے اندر چلا گیا۔ تو دونوں بڈھوں میں باتیں ہونے لگیں۔

رمیش۔ دیکھا۔

دیاناتھ۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اب میرے گھر میں بھی یہی لہر آرہی ہے۔

رمیش۔ میں تو اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ آج کل ایسی ہی عورتوں کا کام ہے ضرورت پڑنے پر کچھ مدد تو کر سکتی ہیں۔ بیمار پڑ جاؤ تو ڈاکٹر کو تو بلا سکتی ہے۔ یہاں تو چاہے مر بھی جائیں۔ لیکن مجال کہ عورت گھر سے پاؤں نکالے۔

دیاناتھ۔ ہم سے تو بھائی یہ انگریزیت نہیں دیکھی جاتی۔ کیا کریں اولاد کی محبت ہے نہیں تو یہی جی چاہتا ہے کہ رما سے صاف کہہ دوں بھیا۔ اپنا گھر الگ لے کر رہ۔ آنکھ پھوٹی پیڑ گئی۔ دیکھو ایک دن یہ عورت وکیل صاحب کو دغا دے گی۔

رمیش۔ آپ یہ کیوں مان لیتے ہیں کہ جو عورت باہر آتی جاتی ہے وہ ضروری خراب ہے مگر رما تو کو مانتی بہت ہے روپے نہ جانے کیوں دیئے۔

دیاناتھ۔ مجھے تو کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔ رما کہیں اس سے کوئی چال نہ چل رہا ہو۔

رما اندر سے آرہا تھا۔ یہ آخری جملہ اس کے کان میں پڑ گیا۔ ترش ہو کر بولا — جی ہاں۔ ضرور چال چل رہا ہوں۔ اسے دھوکا دے کر روپے اینٹھ رہا ہوں۔ یہی تو میرا پیشہ ہے۔

دیاناتھ نے شرماتے ہوئے کہا۔ تو اتنا بگڑتے کیوں ہو۔ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی۔

رما۔ جعلساز بنا دیا اور زیادہ کیا کہتے۔ آخر آپ کے دل میں ایسا شبہ کیوں آیا۔ آپ نے مجھ میں کونسی ایسی برائی دیکھی جس سے یہ خیال پیدا ہوا۔ میں ذرا صاف ستھرے کپڑے پہنتا ہوں۔ ذرا نئی تہذیب کا پیرو ہوں۔ اس کے سوا آپ نے مجھ میں کون سی برائی دیکھی جس سے یہ خیال پیدا ہوا۔ میں ذرا صاف ستھرے کپڑے پہنتا ہوں۔ ذرا نئی تہذیب کا

پیرو ہوں۔ اس کے سوا آپ نے مجھ میں کون سی برائی دیکھی؟ میں جو کچھ خرچ کرتا ہوں ایمانداری کے ساتھ کما کر خرچ کرتا ہوں۔ جس دن دھوکے اور فریب کی نوبت آئے گی زہر کھا کر جان دے دونگا۔ ہاں یہ بات ہے کہ کسی کو خرچ کرنے کی تمیز ہوتی ہے کسی کو نہیں ہوتی۔ جب آپ کے دل میں میرے متعلق ایسے شبہے پیدا ہونے لگے تو میرے لئے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جاؤں۔ رمیش بابو یہاں موجود ہیں۔ آپ میری غیبت میں میرے متعلق جو کچھ چاہیں ان سے پوچھ سکتے ہیں۔ یہ میری خاطر جھوٹ نہ بولیں گے۔

رما نے یہ الفاظ کچھ اس صداقت انگیز جوش کے ساتھ کہے کہ منشی دیا ناتھ کے سارے شبہات حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ نادم ہو کر بولے۔ تمہارا بڑھتا ہوا خرچ دیکھ کر میرے دل میں شبہ ہوا تھا۔ میں اسے چھپاتا نہیں۔ لیکن جب تم کہہ رہے ہو کہ تمہاری نیت صاف ہے تو مجھے اطمینان ہے۔ میری صرف یہی منشا ہے کہ میرا لڑکا چاہے غریب رہے مگر نیت درست رکھے۔

رمیش نے مسکرا کر کہا۔ اچھا یہ قصّہ تو ہو چکا۔ اب یہ بتاؤ۔ اس نے تمہیں روپے کیوں دیئے۔

رما۔ ٹھگ لایا ہوں۔

رمیش۔ مجھ سے شرارت کرو گے تو کان پکڑ لونگا۔ اگر ٹھگ ہی لائے ہو تو بھی میں تمہاری پیٹھ ٹھونکوں گا۔ جیتے رہو۔ خوب ٹھگو۔ لیکن آبرو پر آنچ نہ آنے پائے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ایشور سے تو میں ڈرتا نہیں۔ وہ جو کچھ پوچھے گا اس کا جواب میرے پاس موجود ہے مگر آدمی سے ڈرتا ہوں۔ سچ بتاؤ کس لئے روپے دیئے کچھ دلالی ملنے والی ہو تو مجھے بھی شریک کر لینا۔

رما نے اس طرح منہ بنا کر کہا۔ گویا کوئی ناگوار فرض اس کے سر ڈال دیا

گیا ہے ایک کنگن بنوانے کو کہہ گئی ہیں۔

رمیش۔ تو میں ایک اچھے صراف سے بنوادوں۔ مگر یہ جھنجٹ تم نے بُرا مول لیا۔ عورتوں سے ایشور بچائے۔ تم چاہے دس پانچ روپے اپنے پاس ہی سے خرچ کرو، وہ یہی سمجھیں گی کہ مجھے لُوٹ لیا۔

ذرا دیر بعد رما اندر جاکر جالپا سے بولا۔ رتن دیوی کنگن کے روپے دے گئیں ہیں تم نے شاید آٹھ سو بتائے تھے میں نے چھ سو لے لئے۔

جالپا نے سر جھکا کر کہا۔ میں نے تو دل لگی کی تھی۔

جالپا نے اس طرح اپنی صفائی تو دے دی۔ لیکن بہت دیر تک اس کا دل اسے ملامت کرتا رہا۔ رما نے اگر آٹھ سو روپے لے لئے ہوتے تو شاید وہ اپنی کامیابی پر خوش ہوئی ہوتی۔ لیکن رما کی حق شناسی نے اس کے ضمیر کو بیدار کر دیا تھا۔ وہ پچھتا رہی تھی ناحق جھوٹ بولی۔ مجھے دل میں کتنا حقیر سمجھ رہے ہوں گے اور رتن نے تو دغاباز سمجھ ہی لیا۔

(۱۶)

چائے پارٹی میں کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ رتن کے ساتھ ان کی ایک رشتے کی بہن اور تھی۔ وکیل صاحب نہ آئے تھے۔ دیانا تھ نے اتنی دیر کے لئے وہاں سے ٹل جانے ہی مناسب سمجھا۔ ہاں رمیش بابو برآمدے میں برابر کھڑے رہے۔ جالپا کی موجودگی میں وہ پارٹی میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔

جالپا نے دونوں مہمانوں کو اپنی ساس سے ملا دیا۔ جاگیشری کو وہ دونوں ضرورت سے زیادہ بے تکلف معلوم ہوئیں۔ ان کے سارے گھر میں دوڑنا۔ دھم دھم کرکے کوٹھے پر جانا۔ چھت پر ادھر اُدھر اچکنا قہقہے مار مار کر ہنسنا انہیں ہر وگنگایں

معلوم ہوتا تھا ان کے آئین اخلاق میں بہو بیٹیوں کو متین اور شرمیلی ہو جانا چاہیئے تھا۔ تعجب یہ تھا کہ جالپا بھی آج انہیں میں گنی گئی۔

ابھی تک رما کو پارٹی کی تیاریوں میں سے اتنی فرصت نہیں ملی تھی کہ گنگو کی دکان تک جاتا۔ اس نے سمجھا تھا گنگو کو چھ سو روپے پچھلے حساب میں دے کر نئے کنگن بنوا لونگا اس طرح میرا وقار جم جائیگا۔

دوسرے دن رما خوش ہوتا ہوا گنگو کی دکان پر پہنچا اور رعب سے بولا۔ کیا رنگ ڈھنگ ہیں مہراج؟ کوئی نئی چیز بنوائی ہے؟

ادھر رما کے ٹال مٹول سے گنگو اتنا بے دل ہو رہا تھا کہ آج کچھ روپے ملنے کی امید بھی اسے خوش نہ کر سکی۔ شکوہ آمیز انداز سے بولا۔ بابو صاحب چیزیں کتنی بنیں بکیں۔ آپ نے تو دوکان پر آنا ہی چھوڑ دیا۔ اس طرح کی دکانداری ہم لوگ نہیں کرتے۔ آٹھ مہینے ہوئے آپ کے یہاں سے ایک پیسہ بھی نہ ملا۔

رما۔ بھائی خالی ہاتھ دکان پر آتے شرم آتی تھی۔ ہم اُن لوگوں میں نہیں ہیں جن سے تقاضہ کرنا پڑے۔ آج یہ چھ سو روپے جمع کر لو۔ اور ایک اچھا کنگن تیار کر دو۔

گنگو نے روپے لے کر صندوق میں رکھے اور بولا۔ بن جائیں گے تو باقی روپے کب ملیں گے۔

رما۔ بہت جلد۔

گنگو۔ ہاں بابو جی پچھلا حساب صاف کر دیجئے۔

گنگو نے وعدہ تو کر لیا لیکن ایک بار دھوکا کھا چکا تھا۔ وہ دوبارہ کسی علت میں پھنستے ہوئے ڈرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رما روز تقاضے کرتا اور گنگو روز حیلے کر کے ٹالتا۔ کبھی اس کا کاریگر بیمار پڑ جاتا۔ کبھی اس کے لڑکے بیمار پڑ جاتے۔ ایک مہینہ گزر گیا اور کنگن نہ بنے۔ اس کے تقاضوں کے ڈر سے رما نے پارک جانا چھوڑ دیا۔ مگر رتن نے

مگر تو دیکھ ہی لیا تھا۔ اس ایک مہینے میں کئی بار تقاضا کرنے آئی۔ آخر جب ساون کا مہینہ آگیا تو اس نے ایک دن رما سے کہا۔ جب وہ بدمعاش نہیں بنا کر دیتا تو تم کسی دوسرے کاریگر کو کیوں نہیں دیتے؟

رما نے کہا۔ اس پاجی نے ایسا دھوکا دیا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ اور آجکل کیا کرتا ہے میں نے بڑی غلطی کی جو اسے پیشگی روپے دے دیئے۔

رتن۔ آپ مجھے اس کی دوکان دکھا دیجئے۔ میں اس کے باپ سے وصول کر لوں گی۔ ایسے بے ایمان آدمی کو پولیس میں دینا چاہیئے۔ جالپا نے تائید کی۔ ہاں اور کیا۔ حیلے حوالے تو سبھی کرتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں کہ روپے ڈکار جائیں اور چیز کے لئے مہینوں دوڑائیں۔ رما نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔ آپ دس دن اور صبر کریں۔ میں آج ہی اس سے روپے لے کر کسی دوسرے صراف کو دے دونگا۔

رتن۔ آپ مجھے اس بدمعاش کی دکان کیوں نہیں دکھا دیتے۔ میں ہنٹر سے بات کروں گی۔

رما کہتا تو ہوں دس دن کے اندر آپ کو کنگن مل جائیں گے۔

رتن۔ آپ خود ہی ڈھیلے آدمی ہیں اس کے جھانسوں میں آجاتے ہیں۔ آپ ایک بار سخت پڑ جاتے تو مجال تھی یوں حیلے حوالے کرتا۔

آج رتن بڑی مشکل سے رخصت ہوئی۔ مگر گنگو نے صاف جواب دے دیا جب تک آدھے روپے پیشگی نہ مل جائیں۔ کنگن نہیں بن سکتے۔ اور پچھلے حساب کا بیباق ہونا لازمی تھا۔

رما کو جیسے گولی لگ گئی۔ بولا۔ مہاراج یہ تو شرافت نہیں ہے۔ یہ میرے ایک دوست کی فرمائش ہے میں نے ان سے دس دن کا وعدہ کیا تھا۔ سوچو میں انہیں کیا منہ دکھاؤں گا مجھ سے پرونوٹ لکھا لو رسٹامپ لکھا لو اور کیا کرو گے۔

گنگو۔ پرونوٹ کو شہد لگا کر چاٹوں گا؟ آٹھ مہینے کا ادھار نہیں ہوتا۔ آپ تو بڑے آدمی ہیں۔ آپ کے لئے پانچ چھ سو کی کونسی بات ہے۔ روپئے لائیے۔ کنگن لے جائیے۔

رمانے دانت پیس کر کہا۔ اگر یہ بات تھی تو تم نے ایک مہینہ پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا۔

گنگو۔ میں کیا جانتا تھا آپ اتنا بھی نہیں سمجھ رہے ہیں؟

رما مایوس ہو کر گھر لوٹ آیا۔ مگر اس وقت بھی اس نے سارا قصّہ جالپا سے صاف صاف کہہ دیا ہوتا تو اسے چاہے کتنا ہی صدمہ ہوتا۔ اپنا کنگن اس کے حوالے کر دیتی۔ لیکن رما اتنا صاف گو نہ تھا۔ اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کر کے وہ اسے تشویش میں ڈالنا چاہتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ رما کو سو روپے اوپر سے مل جاتے تھے اور وہ کفایت کرنا جانتا تو آٹھ مہینوں میں دونوں صرافوں کے آدھے آدھے روپے ادا کر دیتا۔ لیکن اُوپر کی آمدنی تھی تو اُوپر کا خرچ بھی۔ کوڑیوں سے روپے بنانا بیوپاریوں ہی کا کام ہے، بابو لوگ تو روپے کی کوڑیاں ہی بناتے ہیں۔

شام کو رمانے پھر ایک بار صرافے کا چکر لگایا۔ بہت چاہا کہ کسی صراف کو جھانسا دوں مگر کہیں دال نہ گلی، بازار میں تار کی خبریں چلا کرتی ہیں۔

رما کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ اگر آج کوئی مہاجن ایک ہزار کا اسٹامپ لکھا کر اسے پانچسو روپے دے دیتا تو وہ اپنے کو خوش نصیب سمجھتا۔ مگر ایسے کسی مہاجن سے اسکا لین دین نہ تھا۔ اپنے ملنے والوں میں اس نے سبھی سے ہوا باندھ رکھی تھی۔ ان کی تواضع اور تکریم میں بے دریغ روپے خرچ کرتا تھا۔ اب کس منہ سے اپنی داستان غم کہے، وہ پچھتا رہا تھا کہ ناحق گنگو کو روپے دبئے۔ گنگو نالش کرنے تو جاتا نہ تھا۔ اس وقت اگر رما کو کوئی عارضہ ہو جاتا تو وہ اس کا خیر مقدم کرتا۔ کم سے کم دس پانچ دن کی مہلت تو مل جاتی۔

مگر بلانے سے تو موت بھی نہیں آتی ۔ وہ تو اسی وقت آتی ہے جب ہم اس کے لئے تیار نہیں ہوتے ۔ ایسا کوئی دوست بھی نظر نہ آتا تھا جو اس کے نام کوئی فرضی تار بھیج دے اور وہ یہاں سے کچھ دنوں کے لئے چلا جائے ۔ وہ انہیں تردّدات میں کروٹیں بدل رہا تھا کہ جالپا کی آنکھ کھل گئی ۔ رما نے فوراً چادر تان لی ۔ گویا بے خبر سو رہا ہے ۔ جالپا نے چادر آہستہ سے اٹھا کر اس کا منہ دیکھا ۔ نیند اور بیداری کا فرق اس سے چھپا نہ رہا ۔ اسے ہلا کر بولی کیا ابھی تک جاگ رہے ہو ؟

رما ۔ نیند کا بہانہ نہ کر سکا ۔ نہ جانے کیوں نیند نہیں آ رہی ہے ۔ پڑے پڑے سوچتا تھا کچھ دنوں کے لئے کہیں باہر چلا جاؤں اور کچھ روپے کما لاؤں ۔

" مجھے بھی لیتے چلو گے نہ ؟ "

" تمہیں پردیس میں کہاں کہاں لئے لئے پھروں گا ۔ "

" تو میں اکیلی یہاں رہ چکی ۔ ایک منٹ نہ رہوں گی ۔ مگر جاؤ گے کہاں ؟ "

ابھی کچھ فیصلہ نہیں کر سکا ۔

" تو سچ مچ تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے ؟ مجھ سے تو ایک دن نہ رہا جائے گا ۔ میں سمجھ گئی تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے ۔ "

" تمہاری محبت کی زنجیر ہی نے مجھے باندھ رکھا ہے ۔ نہیں تو اب تک کبھی کا چلا گیا ہوتا ۔ "

" باتیں بنا رہے ہو ۔ اگر تمہیں میری محبت ہوتی تو مجھ سے کوئی پردہ نہ رکھتے تمہارے دل میں ضرور کوئی ایسی بات ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو ۔ میں تمہیں کئی دنوں سے ہمیشہ متفکر دیکھتی ہوں ۔ جہاں اعتبار نہیں ہے وہاں محبت کیسے رہ سکتی ہے ؟ "

" یہ تمہارا شبہ ہے جالپا ۔ میں نے تو تم سے کبھی پردہ نہیں کیا ۔ "

" تو تم مجھے سچ مچ دل سے چاہتے ہو ؟ "

" یہ کیا جب منہ سے کہونگا جب ہی "

" اچھا میں ایک سوال کرتی ہوں، تم مجھے کیوں چاہتے ہو؟ سچ بتانا "

" یہ تو بالکل مہمل سوال ہے، اگر میں تم سے یہی سوال پوچھتا تو تم مجھے کیا جواب دیتیں "

" میں تو جانتی ہوں "

" بتاؤ "

" پہلے تم بتلا دو "

" میں تو جانتا ہی نہیں، صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم میرے وجود کے ایک ایک ذرّے میں بسی ہوئی ہو "

سوچ کر بتاؤ، میں اپنے عیبوں سے واقف ہوں، میں نے اب تک تمہاری کوئی خدمت نہیں کی، خوش قسمتی سے اب تک مجھے تمہارے لئے کوئی قربانی کی ضرورت نہیں پڑی۔ گھر کے کام دھندے مجھے آتے نہیں جو کچھ سیکھا یہاں سیکھا، بات چیت کرنے کا مجھے سلیقہ نہیں۔ اتنی حسین بھی نہیں ہوں پھر تمہیں مجھ سے کیوں محبت ہے؟

رما نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ ایمان سے کہتا ہوں۔ تم میں کوئی عیب ہے یا کوئی خامی ہے، یہ بات آج تک میرے ذہن میں نہیں آئی۔ لیکن تم نے مجھ میں کونسی بات دیکھی؟ نہ میرے پاس دولت ہے نہ علم ہے نہ صورت ہے بتلاؤ تو بھلا"

جالپا نے محبت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ بتلا دوں؟ تم بہت نیک ہو۔ جب میں یہاں آئی تو کوئی بات کہتے یا کرتے وقت مجھے خوف ہوتا تھا کہ تم اسے پسند کرو گے یا نہیں۔ اب مجھے اس بات کا یقین رہتا ہے کہ تم مجھ سے ناراض نہ ہو گے اگر تمہارے عوض میری شادی کسی دوسرے آدمی سے ہوئی ہوتی تو میں اس کے ساتھ

بھی اسی طرح رہتی ہے تو شوہر اور بیوی کا رواجی رشتہ ہے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ رواجی رشتہ روحانی رشتہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب تو میں تمہیں گوہیوں کے کرشن سے بھی نہ بدلوں گی لیکن تمہیں اب بھی مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔

رما نے سر نیچا کر کے کہا۔ تمہارا الزام بے جا ہے۔ جالپا میں دوستوں سے بھی کوئی پردہ نہیں رکھتا۔ پھر تم سے کیا پردہ رکھونگا۔ رما کے جی میں ایک بار پھر آیا کہ اپنی پریشانیوں کی سرگزشت کہہ سنائے۔ لیکن جھوٹی خود داری نے پھر اس کی زبان بند کر دی۔

جالپا اس سے پوچھتی۔ صرافوں کو روپے دیئے جاتے ہو کہ نہیں۔ تو وہ برابر کہتا ہاں کچھ نہ کچھ ہر مہینے دیتا جاتا ہوں۔ لیکن آج رما کی فکر مندی نے اس کے دل میں ایک شبہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ اسی شبہ کو مٹانا چاہتی تھی۔ ذرا دیر بعد اس نے پوچھا۔ صرافوں کے روپے تو ابھی ادا نہ ہوئے ہونگے۔

"اب تھوڑے ہی باقی ہیں۔"

"کتنے ہی باقی ہونگے۔ کچھ حساب کتاب لکھتے ہو۔"

"ہاں لکھتا کیوں نہیں ہوں۔ سات سو سے کچھ کم ہی ہوں گے۔"

"تم نے کہیں رتن کے روپے تو صرافوں کو نہیں دے دیئے۔"

رما کا دل کانپ رہا تھا۔ کہیں جالپا رتن کے روپوں کا ذکر نہ کر بیٹھے۔ آخر وہ وار اس کے سر پر آ ہی گیا۔ اس وقت بھی اگر رما نے ہمت کر کے سارا واقعہ بیان کر دیا ہوتا تو اس کی پریشانیوں کا خاتمہ ہو جاتا۔ جالپا ایک منٹ تک ضرور سکتے میں آ جاتی۔ ممکن ہے غصہ اور مایوسی کے عالم میں اس کی زبان سے دو چار کڑی باتیں بھی نکل جاتیں۔ لیکن پھر دونوں مل کر کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتے۔ اگر مجبوری کی حالت میں جالپا اپنی سہیلی سے یہ واقعہ بیان کر دیتی۔ تو رتن وہ عورت نہ تھی جو غم و غصہ کا اظہار کرتی۔ پر اس جھوٹی

خود پروری کا برا ہو۔ رمانے اس سوال پر ایسا منہ بنایا گویا جالپا نے اس پر کوئی بے رحمانہ حملہ کیا ہے بولا۔ رتن کے روپے کیوں دیتا۔ آج چاہوں تو دو چار ہزار کا مال لا سکتا ہوں کاریگروں کی عادت دیر کرنے کی ہوتی ہے بس اور کوئی بات نہیں ہے۔ دس دن میں یا تو چیز ہی لادوں گا یا روپیہ واپس کر دوں گا۔ مگر تم نے یہ سوال کیوں کیا۔ پرائی رقم بھلا میں اپنے خرچ میں کیسے لاتا؟

جالپا نے معذرت کے لہجہ میں کہا۔ کچھ نہیں میں نے یونہی پوچھا تھا۔

جالپا کو تھوڑی دیر میں نیند آ گئی۔ لیکن رما پھر اسی ادھیڑ بن میں پڑا رہا۔ اگر وہ رمیش کو اپنا محرم راز بنا لیتا تو وہ کسی مہاجن سے روپوں کا انتظام کرا دیتے۔ لیکن وہ ان پر کسی طرح اپنی پریشانیوں کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے صبح کو ناشتہ کر کے دفتر کی راہ لی۔ شاید وہاں کچھ انتظام ہو جائے۔ کیوں انتظام کرے گا۔ اس کا اسے مطلق خیال نہ تھا۔ لیکن مایوسی کے عالم میں انسان کو کسی غیبی امداد کا گمان ہونے لگتا ہے۔ دفتر میں چپڑاسی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ رما دفتر کا رجسٹر کھول کر رقموں کی جانچ کرنے لگا۔ کئی دنوں سے میزان نہیں دیا گیا تھا۔ لیکن بڑے بابو کے دستخط موجود تھے اب میزان دیا تو ڈھائی ہزار نکلے۔ یکایک اسے ایک تدبیر سوجھی۔ کیوں نہ ڈھائی ہزار کے عوض میزان میں ڈیڑھ سو کر دے۔ ایک ہی صفر کا تو معاملہ ہے۔ رسید بہی کی جانچ پڑتال کون کرتا ہے۔ اگر چوری پکڑی بھی گئی تو کہہ دوں گا میزان میں غلطی ہوئی۔ مگر اس خیال کو اس نے دل میں جمنے نہ دیا۔

گاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مگر بیوپاریوں نے جب دیکھا کہ بابو صاحب آج موجود ہیں تو سوچا جلدی سے چنگی دے کر فراغت پالیں۔ رمانے اس عنایت کے لئے دستوری کی دگنی رقم وصول کی۔ اور گاڑی والوں نے شوق سے دی۔ کیونکہ یہی بازار کا وقت تھا اور بارہ ایک بجے تک چنگی گھر سے فرصت پانے کی حالت میں جو نہی

گھنٹے کا ہرج ہوتا تھا۔ بازار دس گیارہ بجے کے بعد بند ہوجاتا تھا اور دوسرے دن کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اگر بازار روپے میں آدھ پاؤ بھی گر گیا تو سینکڑوں کے وارے نیارے ہو گئے۔ دس پانچ روپے مل کھا جانے میں انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ رما کو آج یہ نئی بات معلوم ہوئی۔ سوچا آخر صبح کو میں گھر پر ہی تو بیٹھا رہتا ہوں۔ اگر یہاں آکر بیٹھ جاؤں تو روز دس پانچ ہاتھ آ جائیں۔ پھر تو چھ مہینے میں سارا قرضہ صاف ہو جائے گا۔ مانا روز یہ چاندی نہ ہوگی پندرہ نہ سہی دس ملیں گے۔ اگر صبح کو روز پانچ روپے مل جائیں اور اتنے ہی دن بھر میں اور مل جائیں تو پانچ چھ مہینہ میں قرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ اس نے دروازہ کھول کر پھر رجسٹر نکالا لیکن میزان لگا دینے کے بعد رجسٹر میں کسی قسم کا تغیر یا تبدّل کرنا اسے اتنا خوفناک نہ معلوم ہوا۔ نیا رنگروٹ جو پہلے بندوق کی آواز سے چونک پڑتا ہے مشاق ہو جانے پر گولیوں کی بارش میں نہیں گھبراتا۔

رما دفتر بند کر کے گھر چلنے والا ہی تھا کہ ایک بساطی کا ٹھیلہ آ پہنچا۔ رما نے کہا۔ لوٹ کر چنگی لوں گا۔ بساطی نے منتیں کرنی شروع کیں۔ اسے کوئی بہت ضروری کام تھا۔ آخر دس روپے پر معاملہ طے ہوا۔ رما نے چنگی کی روپے جیب میں رکھے اور گھر چلا پچیس روپے محض دو گھنٹے میں آ گئے۔ اگر ایک مہینہ بھی یہی اوسط رہے تو بیڑا پار ہے اسے اتنی خوشی ہوئی کہ وہ کھانا کھانے گھر نہ گیا۔ بازار سے بھی کچھ نہ منگوایا۔ روپیہ بھناتے ہوئے اسے ایک روپیہ کم ہو جانے کا اندیشہ ہوا۔ وہ شام تک بیٹھا کام کرتا رہا۔ چار روپے اور وصول کئے۔ چراغ جلے جب وہ گھر چلا تو اس کے دل پر سے فکر اور مایوسی کا بوجھ بہت کچھ اتر چکا تھا۔ اگر دس دن بھی تیزی رہی تو رتن سے منہ چرانے کی نوبت آئے گی۔

(۱۷)

نو دن گذر گئے۔ رما روز علے الصبح دفتر جاتا اور چراغ جلے لوٹتا۔ وہ روز یہی امید کرکے جاتا تھا کہ آج کوئی بڑا شکار پھنسے گا۔ مگر کبھی امید پوری نہ ہوئی۔ اتنا ہی نہیں پہلے دن کی سی شاندار کامیابی پھر نہ ہوئی۔ تاہم اس کے لئے کچھ کم فخر کی بات نہ تھی کہ ان دنوں میں اس نے سو روپے جمع کر لئے تھے۔ جالپا نے کئی بار سیر کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن رما نے اسے برابر باتوں میں ٹالا۔ بس کل کا دن اور باقی تھا کل رتن آکر کنگن مانگے گی تو وہ اسے کیا جواب دے گا۔ دفتر سے آکر وہ اسی فکر میں بیٹھا ہوا تھا۔ کیا وہ ایک مہینے کی مہلت اور نہ دے گی۔ اتنے دن وہ اور خاموش رہے تو شاید رما اس کے قرض سے سبکدوش ہو جائے۔

ساون کے دن تھے اندھیرا ہو چلا تھا۔ آسمان سیاہ چھتری کی طرح سر پر تنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ رما سوچ رہا تھا رمیش بابو کے پاس چل کر دو چار بازیاں کھیل آؤں مگر بادلوں کو دیکھ دیکھ کر رک جاتا تھا۔ دفعتہً رتن آپہنچی اس کا چہرہ تند تھا معلوم ہوتا تھا آج وہ لڑنے کے لئے تیار ہو کر آئی ہے اور ملاحظہ اور مروّت کے خیال کو بھی قریب نہیں آنے دینا چاہتی۔

جالپا نے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔ تم خوب آئیں بہن میں ذرا تمہارے ساتھ گھوم آؤں گی۔ انہیں کام کے بوجھ سے آجکل سر اٹھانے کی بھی فرصت نہیں ہے رتن نے بے اعتنائی سے کہا۔ "مجھے آج بہت جلد گھر واپس جانا ہے بابو جی کو کل کی یاد دلانے آئی ہوں۔

رما اس کا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر دل میں سہم رہا تھا۔ کسی طرح باتوں میں لگا کر خوش کرنا چاہتا تھا بڑے تپاک سے بولا۔ جی ہاں خوب یاد ہے۔ ابھی صراف کی دکان سے چلا آرہا ہوں۔ روز صبح شام گھنٹہ بھر حاضری دیتا ہوں۔ مگر ان چیزوں کی تیاری میں وقت بہت صرف ہوتا ہے دو آدمی لگے ہوئے ہیں۔ مگر ابھی شاید ایک مہینے سے

کم میں چیز تیار نہ ہو۔ ہاں ہوگی لاجواب! ان چیزوں میں دام تو کاریگری کے ہیں رمالیت چاہے کچھ ہو یا نہ ہو۔

رتن ذرا بھی نہ پگھلی۔ تنک کر بولی۔ اچھا ابھی مہینہ بھر اور لگے گا۔ ایسے کیا موتی پرو رہا ہے کہ تین مہینہ میں بھی ایک چیز نہ بنی؟ آپ اس سے کہہ دیجئے میرے روپے واپس کر دے۔ امید کے کنگن دیویاں پہنتی ہیں۔ مجھے ضرورت نہیں۔

رما۔ ایک مہینہ نہ لگے گا شاید اس سے پہلے ہی بن جائے۔ ایک مہینہ تو میں نے اندازاً کہہ دیا تھا اب تھوڑی ہی کسر اور رہ گئی ہے۔ کئی دن تو نگینے تراش کرنے میں لگ گئے۔

رتن۔ مجھے کنگن پہننا ہی نہیں صاحب! آپ میرے روپے واپس کر دیجئے۔ جوہری بہیں نے بہت دیکھے ہیں۔ آپ کی عنایت سے اس وقت بھی تین جوڑے کنگن میرے پاس ہوں گے مگر ایسی دھاندلی کہیں نہیں دیکھی۔

دھاندلی کے لفظ پر رما تلملا اٹھا۔ دھاندلی نہیں میری حماقت کہئے۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ مفت کی زحمت سر لیتا۔ میں نے تو پیشگی روپے اس لئے دیئے کہ صراف خوش ہو کر جلد تیار کر دے گا۔ اب آپ روپے واپس مانگ رہی ہیں۔ مجھے امید نہیں کہ صراف روپے لوٹا دے۔

رتن نے خشمگیں آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ روپے کیوں نہ لوٹا دے گا؟

رما۔ اس لئے کہ جو چیز آپ کی فرمائش سے بنائی جا رہی ہے اسے وہ کہاں بیچتا پھرے گا۔ ممکن ہے اس کے بکنے میں سال دو سال لگ جائیں۔ ہر ایک کی پسند ایک سی نہیں ہوتی۔

رتن نے تیوری چڑھا کر کہا۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ اس نے وعدہ خلافی کی ہے اس کا تاوان دے۔ مجھے کل یا تو کنگن لا دیجئے یا روپے۔ اگر صراف سے آپ

کا یارانہ ہے اور آپ ملاحظہ اور مروت کے باعث اس سے کچھ نہیں کہہ سکتے تو مجھے اس کی دکان دکھا دیجئے۔ اس میں بھی آپ کو شرم آتی ہے تو اس کا نام بتا دیجئے۔ میں پتہ لگا لوں گی۔ واہ اچھی دل لگی ہے، وہ ہے کس خیال میں۔ دکان نیلام کرا لونگی، جیل بھجوا دوں گی۔

رما کھسیا کر زمین کی طرف تاکنے لگا۔ وہ کتنی منحوس ساعت تھی جب اس نے رتن سے روپے لئے۔ بیٹھے بٹھائے دردِ سر خریدا۔

جالپا نے کہا۔ سچ تو ہے۔ انہیں کیوں نہیں صراف کی دکان پر لے جاتے چیز کو آنکھوں سے دیکھ کر انہیں تسلی ہو جائے گی۔

رتن۔ میں وہ چیز اب پہننا ہی نہیں چاہتی۔

رما۔ اچھی بات ہے۔ آپ کو روپے مل جائیں گے کل۔

رتن۔ کل کس وقت؟

رما۔ دفتر سے لوٹتے وقت لیتا آؤں گا۔

رتن۔ روپے پورے لوں گی۔ ایسا نہ ہو سو روپے دے کر ٹال دے۔

رما۔ کل آپ اپنے سب روپے لے جایئے گا۔

یہ کہتا ہوا وہ مردانے کمرے میں آیا۔ اور رمیش بابو کے نام ایک رقعہ لکھ کر گوپی سے بولا۔ اسے رمیش بابو کے پاس لے جا کر فوراً جواب لاؤ۔

پھر اس نے دوسرا رقعہ لکھ کر بشمبھر کو دیا۔ کہ مانک داس کو دکھا کر جواب لا دے۔

بشمبھر نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ پانی آ رہا ہے۔

رما۔ تو کیا ساری دنیا بہہ جائے گی۔ دوڑتے ہوئے جاؤ۔

بشمبھر۔ اور جو وہ گھر پر نہ ملیں۔

"ملیں گے وہ اس وقت کہیں نہیں جاتے۔"

آج زندگی میں پہلا موقع تھا کہ اس نے دوستوں سے روپے قرض مانگے ۔منت وسماجت، خوشامد و اصرار کے جتنے الفاظ اسے یاد آئے وہ اس نے سب صرف کر دیئے جیسے رقعے آج اس نے لکھے، ویسے ہی رقعے اس کے پاس کتنی بار آچکے تھے۔ ان رقعوں کو پڑھ کر اس کا دل کتنا بے قرار ہو جاتا تھا ، پر مجبوری کے باعث اسے بہانے کرنے پڑتے تھے۔ کیا رمیش بھی بہانہ کر جائیں گے۔ وہ نہی دستی کا بہانہ نہیں کر سکتے۔ کیا میرے ساتھ اتنا سلوک بھی نہ کریں گے۔ آدھ گھنٹہ ہو گیا اور اب تک دو میں سے ایک بھی نہیں آیا۔ وہ دروازے پر ٹہلنے لگا۔ اس اضطراب کی حالت میں بیٹھنا مشکل تھا۔ رتن کی موٹر اب تک کھڑی تھی۔ اتنے میں رتن باہر آئی مگر اسے ٹہلتے دیکھ کر بھی نہ بولی۔

موٹر روانہ ہو گئی۔

رمانے راستہ کی طرف نگاہیں دوڑا کر سوچا دونوں کہاں رہ گئے۔ کہیں کھیلنے لگے ہوں گے، شیطان تو ہیں ہی۔ کہیں رمیش روپے دے دیں تو چاندی ہے۔ میں نے دو سو ناحق مانگے شاید اتنے روپے اس وقت ان کے پاس نہ ہوں۔ مانک چاہے تو ہزار پانچسو دے سکتا ہے۔ آج دونوں کی آزمائش ہے۔ اگر آج انہوں نے انکار کیا تو دوستی کا خاتمہ ہے کسی کا نوکر نہیں ہوں کہ جب وہ شطرنج کھیلنے کے لئے بلائیں تو دوڑا چلا جائے۔

بشمبھر نے لوٹ کر مانک داس کا رقعہ دیا۔ اس نے لکھا تھا میں آجکل بہت تنگدست ہوں ، میں تو تمہیں سے مانگنے والا تھا۔

رمانے پرزہ پھاڑ کر پھینک دیا۔ خود غرض کہیں کا۔ اگر کسی سب انسپکٹر نے روپے مانگے ہوتے تو پرزہ دیکھتے ہی لے کر دوڑے جاتے۔ خیر دیکھا جائے گا۔ چنگی کے لئے

مال تو آئے گا ہی۔ اس کی کسر نکل جائے گی۔

اتنے میں گوپی بھی لوٹا۔ رمیش نے لکھا تھا میں نے اپنی زندگی کے دو چار اصول بنا لئے ہیں اور ان کی بڑی سختی سے پابندی کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ دوستوں سے لین دین کا تعلق نہ پیدا کرونگا۔ ابھی تمہیں تجربہ نہیں ہوا ہے۔ لیکن میں بھوگ چکا ہوں تم میرے پیارے دوست ہو میں نہیں چاہتا کہ میرے اور تمہارے ارتباط میں خلل پیدا ہو۔ اس لئے مجھے معاف کرو۔

رمانے اس خط کو بھی پڑھ کر پھینک دیا۔ اور کرسی پر بیٹھ کر چراغ کی طرف محویت کے عالم میں دیکھنے لگا۔ اس چراغ کی لو کے اندر رمیش اور مانک اور رتن تینوں بیٹھے نظر آتے تھے پھر وہ چراغ اس کی نظروں سے غائب ہو گیا۔

دل کی حالت وہ بھی ہوتی ہے جب آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اور کچھ نظر نہیں آتا۔ جب کان کھلے ہوتے ہیں اور کچھ سنائی نہیں پڑتا۔

(۱۸)

شام ہو گئی تھی میونسپلٹی کے احاطے میں سناٹا چھا گیا تھا عملے ایک ایک کر کے جا رہے تھے۔ مہتر کمروں میں جھاڑو لگا رہا تھا۔ خوانچہ والے دن بھر کی بکری کے پیسے گن رہے تھے مگر رما ناتھ اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا رجسٹر لکھ رہا تھا۔

آج بھی وہ صبح ہی آیا تھا۔ مگر کوئی برتا انتکار نہ بیٹھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اب اپنی آبرو کیسے بچائے۔ آخر اس نے رتن کو جھانسا دینے کی ٹھانی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ رتن کی یہ بے صبری محض اس لئے ہے کہ وہ سمجھتی ہے کہ میں نے اس کے روپے خرچ کر ڈالے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ اس کے روپے عندالطلب مل سکتے ہیں تو اسے تسکین ہو جائے گی۔ رما اسے روپیہ سے بھری تھیلی دکھا کر اس کا شبہ مٹا دینا چاہتا تھا۔

وہ خزانچی صاحب کے چلے جانے کی راہ دیکھ رہا تھا۔ اسی لئے آج اس نے دیر کی تھی۔ آج کی آمدنی کے ڈیڑھ سو روپے اس کے پاس تھے اسے وہ اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا خزانچی صاحب ٹھیک پانچ بجے اٹھے انہیں کیا غرض تھی کہ رما سے آج کی آمدنی طلب کرتے۔ روپے گننے ہی سے چھٹی نہ ملی۔ دن بھر روپے گنتے گنتے اور لکھتے لکھتے بے چارے کی کمر دُکھ رہی تھی۔ رما کو جب معلوم ہو گیا کہ خزانچی صاحب دور نکل گئے تو اس نے رجسٹر بند کیا اور چپڑاسی سے بولا۔ تھیلی اٹھاؤ چل کر جمع کراؤ۔

چپڑاسی نے کہا۔ خزانچی صاحب تو بہت دور چلے گئے۔

رما نے آنکھیں پھاڑ کر کہا خزانچی صاحب چلے گئے۔ تم نے مجھ سے کہا کیوں نہیں۔ ابھی کتنی دور گئے ہوں گے۔

سڑک کی نکڑ تک پہنچے ہوں گے۔

"تو یہ آمدنی کیسے جمع ہو گی"

"حکم ہو تو بلا لاؤں"

رما نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ اجی جاؤ بھی اب تک تو کہا نہیں۔ اب انہیں آدھے راستے سے بلانے جاؤ گے۔ کیا آج زیادہ چھان گئے تھے۔ خیر روپے اسی دراز میں رکھ دو۔ تمہاری نگرانی رہے گی۔

چپڑاسی نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ نہیں بابو صاحب میں یہاں روپے نہیں رکھنے دوں گا۔ سب دن برابر نہیں جاتے۔ کہیں روپے اٹھ جائیں تو میں بے گناہ مارا جاؤں

رما نے پوچھا۔ تو پھر یہ روپے کہاں رکھوں؟

چپڑاسی۔ حضور اپنے ساتھ لیتے جائیں۔

رما تو یہ چاہتا ہی تھا۔ ایک یکہ منگوایا اس پر روپوں کی تھیلی رکھی اور گھر چلا۔ سوچتا جاتا تھا اگر رتن بھبکی میں آگئی تو کیا پوچھنا۔

جالپا نے تھیلی دیکھ کر پوچھا۔ کیا کنگن نہ ملا۔

ابھی تیار نہ تھا۔ بیس روپے اٹھا لایا۔

رتن بھی آتی ہوگی، اسے چین کہاں۔

جب چراغ جلے تک رتن نہ آئی۔ تو رما نے سمجھا اب نہ آئے گی۔ روپے الماری میں رکھ دیئے اور گھومنے چل دیا۔ مگر ابھی اسے گئے دس منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ رتن آپہنچی۔ اور آتے ہی آتے بولی۔ کنگن تو آگئے ہوں گے۔

جالپا نے تمسخر کے انداز سے کہا۔ ہاں آگئے ہیں بہن لو۔ بیچارے کئی دفعہ صراف کے پاس گئے۔ ظالم دیتا ہی نہیں، حیلے حوالے کرتا ہے۔

رتن بے گمان ہو کر بولی۔ کیسا صراف ہے کہ اتنے دنوں سے حیلے حوالے کر رہا ہے۔ میں جانتی کہ روپے ایسے جھمیلے میں پڑجائیں گے تو دیتی ہی کیوں۔ نہ روپے ملتے ہیں نہ کنگن ملتا ہے۔

رتن نے یہ الفاظ کچھ ایسے دل دوز طریقے سے کہے کہ جالپا بھڑ اٹھی۔ بولی آپ کے روپے رکھے ہوئے ہیں، جب چاہیے لے جائیے۔ اپنے بس کی بات ہے نہیں۔ آخر جب صراف دیگا بھی تو لائیں گے۔

کچھ وعدہ کرتا ہے کب تک دے گا؟

"اس کے وعدوں کا کیا اعتبار؟ سینکڑوں وعدے تو کر چکا ہے۔"

"تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کنگن نہ بنائے گا۔"

"جو چاہے سمجھ لو۔"

"تو لاؤ روپے ہی دے دو۔ باز آئی ایسے کنگن سے۔"

جالپا جھمک کر اٹھی۔ الماری سے تھیلی نکالی اور رتن کے سامنے پٹک کر بولی۔ آپ کے روپے رکھے ہیں۔ لے جائیے۔

فی الواقعہ رتن کی بے صبری کا وہی سبب تھا جو رملا نے سمجھا تھا۔ اُسے گمان ہو رہا تھا کہ ان لوگوں نے میرے روپے خرچ کر ڈالے۔ روپے سامنے دیکھ کر اس کے شکوک کا ازالہ ہو گیا۔ شرمندہ ہو کر بولی۔ اگر دو چار دن میں دینے کا وعدہ کرتا ہو تو روپے رہنے دو۔

جالپا نے بے اعتنائی سے کہا۔ مجھے تو امید نہیں کہ اتنی جلدی دے۔ چیز تیار ہونے پر روپے مانگ لئے جائیں گے۔

رتن نے بہت اصرار کیا کہ جالپا روپے رکھ لے۔ موقع پر روپے نہ مل سکے تو شرمندگی ہو۔ لیکن جالپا راضی نہ ہوئی۔ بولی۔ پرائی رقم گھر میں رکھنا خطرہ کی بات ہے۔ کوئی گول مال ہو جائے تو مفت میں تاوان دینا پڑے۔ میری شادی کے چوتھے ہی دن میرے سارے گہنے چوری میں چلے گئے۔ ہم لوگ جاگتے ہی رہے۔ مگر نہ جانے کب آنکھ لگ گئی اور چوروں نے اپنا کام کر لیا۔ دس ہزار کی چپت پڑ گئی کہیں وہی حادثہ پھر ہو جائے تو کہیں کے نہ رہیں۔

رتن نے مایوس ہو کر روپے موٹر میں رکھے اور چلی گئی۔ جالپا خوش تھی کہ سر سے بوجھ ٹلا۔ رتن کو افسوس تھا کہ ناحق روپے واپس مانگے۔ کہیں لوگوں نے میری بدگمانی بھانپ نہ لی ہو۔

رما نو بجے گھوم کر لوٹا۔ جالپا اسے دیکھتے ہی بولی۔ رتن آئی تھی میں نے اس کے سب روپے دے دیئے۔

رما کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ آنکھیں پھیل کر پیشانی پر جا پہنچیں۔ گھبرا کر بولا۔ کیا کہا۔ رتن کے روپے دے دیئے۔ یہ تم سے کس نے کہا تھا

جالپا بولی۔ اسی کے روپے تو تم نے لا کر رکھے تھے۔ تم خود اس کا انتظار کرتے رہے۔ تمہارے جاتے ہی وہ آئی۔ اور کنگن مانگنے لگی۔ میں نے جھلا کر اس

کے روپے پھینک دیئے۔

رمانے غصہ کو ضبط کر کے کہا۔ اس نے روپے مانگے تو نہ تھے۔

جالپا۔ مانگے کیوں نہیں۔ ہاں جب میں نے دے دیئے تو البتہ کہنے لگی اسے کیوں لوٹاتی ہو۔ میں نے کہا کہ ایسے تنگی مزاج والوں کے روپے میں نہیں رکھتی۔

رما کو ایسا تکان معلوم ہوا کہ اس سے کھڑا نہ رہا گیا۔ توکل کے انداز سے بولا۔ ایشور کے لئے تم مجھ سے بغیر پوچھے ایسے کام مت کیا کرو۔

جالپا یہ معمہ کیا سمجھے۔ بولی۔ تو ابھی کیا ہوا۔ اس کے پاس جا کر روپے مانگ لاؤ۔

رما چارپائی پر بیٹھ کر سر پر ہاتھ رکھے ہوئے صورت حال پر غور کرنے لگا۔ جالپا پر ناراض ہونا بے انصافی تھی۔ جب اس نے صاف کہہ دیا کہ یہ روپے رتن کے ہیں۔ اور یہ اشارہ تک نہ کیا کہ مجھ سے پوچھے بغیر روپے رتن کو مت دینا۔ تو جالپا کی کوئی خطا نہیں۔ رتن سے کس طرح روپے واپس لینے چاہئیں جس وقت وہ یہاں آئی تھی کاش وہ خود موجود ہوتا۔ تو کتنی خوبصورتی سے ساری مشکل آسان ہو جاتی۔ آخر اس نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ آج رتن آنے کی تھیں۔ ایک دن گھومنے نہ جاتا تو کون مرا جاتا تھا۔ ضرور کوئی غیبی طاقت اس کی تباہی کے سامان جمع کر رہی ہے۔ دس منٹ کی غیر حاضری نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ روپے رکھ لیجئے۔ جالپا نے ذرا دانائی سے کام لیا ہوتا۔ نہیں! اس نے کوئی دانائی نہیں کی۔ اس جگہ رما خود وہی کرتا۔ سوال یہ ہے کہ رتن سے روپے واپس کیسے لئے جائیں۔ کیوں نہ جا کر رتن سے کہے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ روپے لوٹانے سے ناراض ہو گئی ہیں۔ دراصل میں روپے واپس دینے کو نہ لایا تھا۔ اس لئے مانگ لایا تھا کہ صراف خوب تندہی سے کام کرے۔ رما نے سوچا۔ شاید رتن شرمندہ ہو کر خود ہی معافی مانگے اور روپے دے دے۔ اس

نے گھڑی پر نظر ڈالی ۔ ساڑھے آٹھ بجے تھے ۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا ۔ رتن ضرور گھر پہ ہوگی
رما نے سائیکل اٹھائی اور اس سے ملنے چلا ۔

رتن کے بنگلے پر آج بڑی بہار تھی ۔ یہاں ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی دعوت کوئی نہ کوئی جشن ہوتا رہتا ۔ رتن کی طبیعت اس خلوت اور تنہائی سے تنگ آکر ان دلچسپیوں کی طرف اسی طرح لپکتی تھی جیسے پیاسا پانی کی طرف لپکتا ہے ۔ اس وقت وہاں بچوں کا جمگھٹ تھا ۔ ایک آم کے درخت میں جھولا پڑا ہوا تھا ۔ بجلی کی بتیاں جل رہی تھیں ۔ بچے جھولا جھول رہے تھے اور رتن جھلا رہی تھی ۔ ہڑبونگ مچا ہوا تھا ۔ وکیل صاحب اس موسم میں بھی اونی اور کوٹ پہنے برآمدے میں بیٹھے سگار پی رہے تھے ۔

رما کا جی چاہا کہ جھولے کے پاس جاکر رتن سے باتیں کرے ۔ مگر وکیل کو کھڑے دیکھ کر مارے لحاظ کے ادھر نہ جا سکا ۔

وکیل صاحب نے اسے دیکھتے ہی ہاتھ بڑھا دیا اور بولے ۔ اور رما بابو کہو ۔ تمہارے میونسپل بورڈ کی کیا خبریں ہیں ۔

رما نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ۔ کوئی نئی بات تو نہیں ہے ۔

وکیل ۔ آپ کے بورڈ میں لڑکیوں کی لازمی تعلیم کی قرارداد کب پاس ہوگی ؟ اور کئی بورڈوں نے تو پاس کر دیا ۔ جب تک عورتوں کی تعلیم کا رواج نہ ہوگا ملکی ترقی غیر ممکن ہے ۔ آپ تو یورپ نہ گئے ہوں گے ۔ واہ ! کیا آزادی ہے ۔ کیا دولت ہے کیا زندگی ہے کیا جوش ہے ۔ بس معلوم ہوتا ہے کہ یہی جنت ہے اور عورتیں بھی سچ مچ دیویاں ہیں ۔ اتنی خوش مزاج ۔ اتنی آزاد ! یہ سب عورتوں کی تعلیم کی برکت ہے ۔

رما نے اخباروں میں ان ملکوں کا تھوڑا بہت حال پڑھا تھا ۔ اسی اعتبار سے بولا ۔ وہاں عورتوں کے اطوار تو بہت اچھے نہیں ہیں ۔

وکیل ۔ نان سنس ۔ اپنے اپنے ملک کا رواج ہے ۔ آپ ایک حسینہ کو کسی کے ساتھ

تنہا دیکھ کر دانتوں میں انگلی دباتے ہیں۔ ہم اتنے بدگمان ہو گئے ہیں کہ عورت اور مرد کو یکجا دیکھ کر شبہ کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ لیکن جہاں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتی ہیں وہاں جنسی اختلاف کا وجود ہی نہیں رہتا۔ آپس میں شوق اور دلچسپی کی اتنی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ جنسیت کے لئے بہت تھوڑی گنجائش رہ جاتی ہے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ جس ملک میں عورتوں کو جتنی ہی آزادی حاصل ہے وہ ملک اتنا ہی مہذب ہے۔ عورتوں کو قید میں پردہ میں یا مردوں سے کوسوں دور رکھنے کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ آپ کے یہاں لوگ اتنے بداطوار ہیں کہ عورتوں کی توہین کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ نوجوانوں کے لئے ملکیات، مذہب، فنونِ لطیفہ، ادبیات، فلسفہ تاریخ نظریات اور ہزاروں ہی ایسے مضامین ہیں جن کی بنا پر آپس میں گہرے تعلقات پیدا ہو سکتے ہیں۔ میں سال بھر امریکہ اور یورپ میں رہ چکا ہوں، کتنی ہی عورتوں کے ساتھ میرا ربط ضبط تھا۔ ان کے ساتھ سیر کی ہیں، مباحثے کئے ہیں، لیکن کسی نوجوان کو ایسے چرچے کرتے نہیں سنا جس پر کوئی عورت شرم سے سر جھکائے اور پھر اچھے اور بُرے کہاں نہیں ہیں۔

رما کو اس وقت اس موضوع میں کوئی لطف نہ آیا۔ وہ تو دوسری ہی فکر میں پریشان تھا۔

مگر وکیل صاحب کی طبیعت روانی پر تھی، پھر بولے جب تک ہم مردوں اور عورتوں کو آزادی کے ساتھ اپنا اپنا ذہنی نشو و نما نہ کرنے دیں گے، ہم زوال کی طرف گرتے جائیں گے، بندشوں سے سماج کا پیرنہ باندھئے، اس کے گلے میں قیدوں کی زنجیر نہ ڈالئے، بیواؤں کی شادی کیجئے، خوب زوروں سے، لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ جب کوئی ادھیڑ آدمی کسی جوان عورت سے شادی کر لیتا ہے، تو کیوں اتنا کہرام مچ جاتا ہے۔ یورپ میں اسّی اسّی سال کے بوڑھے جوان عورتوں سے شادی

کرتے ہیں۔ مسز سالی کی بوڑھیاں جوان مردوں سے کرتی ہیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی ہم بوڑھوں کو موت آنے سے پہلے ہی مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ انسان کو اگر کبھی رفیق کی ضرورت ہوتی ہے تو بڑھاپے میں جب اسے ہمیشہ کسی دستگیر کی خواہش ہوتی ہے جب وہ دوسروں کا دست نگر ہو جاتا ہے۔

رما کا دھیان جھولے کی طرف تھا۔ کسی طرح رتن سے دو دو باتیں کرنے کا موقع ملے۔ اس وقت اسے یہی دھن لگی ہوئی تھی۔ مگر اس کا وہاں جانا آداب مجلس کے خلاف تھا۔ آخر اس نے وکیل صاحب سے پوچھا۔ آج اتنے لڑکے یہاں کیسے آ گئے۔

وکیل صاحب نے محبت آمیز لہجہ میں کہا۔ آج کچھ نہ پوچھئے۔ رتن بائی کو بچوں سے بڑی محبت ہے۔ نہ جانے کہاں سے اتنے لڑکے جمع ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کو جھولے سے کچھ شوق ہے تو جائیے۔

رما تو یہ چاہتا ہی تھا۔ چٹ پٹ جھولے کے پاس جا پہنچا۔ رتن اُسے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ ان شیطانوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ جھولے سے ان کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ آئیے ذرا آپ بھی بیگار کیجئے۔ میں تو تھک گئی۔ یہ کہہ کر وہ پکے چبوترے پر بیٹھ گئی۔ رما جھونکے دینے لگا۔ بچوں نے نیا آدمی دیکھا تو سب کے سب اپنی باری کے لئے بیقرار ہو گئے۔ رتن کے ہاتھوں وہ دو باریاں آ چکی تھیں۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ کچھ لڑکے تو تیسری بار جھولیں اور باقی بیٹھے منہ تاکتے رہیں۔ دو اترے تو چار بیٹھے۔ رما کو بچوں سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ مگر اس وقت پھنس گیا تھا کیا کرتا۔

آخر آدھ گھنٹہ بیگار کے بعد اس کا جی اوب گیا۔ گھڑی میں ساڑھے نو بج رہے تھے۔ مطلب کی بات کیسے چھیڑے۔ رتن تو جھولے میں اتنی مگن تھی گویا اسے روپیوں کی یاد ہی نہیں ہے۔ یکایک اس نے رما سے کہا۔ بابو جی میں جھولے پر بیٹھتی ہوں۔ آپ مجھے جھلائیے۔ مگر نیچے سے نہیں۔ جھولے پر کھڑے ہو کر پینگ ماریئے۔

رما بچپن ہی سے جھولے پر بیٹھتے ڈرتا تھا۔ ایک بار دوستوں نے زبردستی جھولے پر آنے کے لئے مجبور کر دیا۔ مگر اپنی مجبوری کا اظہار کیونکر کرتا۔ رتن دو بچوں کو لے کر بیٹھ گئی اور یہ گیت گانے لگی۔

کدم کی ڈریاں جھولا پڑ گیو ری

رادھا رانی جھولن آئی

رما جھولے پر کھڑا ہو کر پینگ مارنے لگا۔ لیکن اس کے پاؤں کانپ رہے تھے اور دل بیٹھا جاتا تھا۔ جب جھولا اوپر سے گرتا تھا تو اسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی رقیق شے اس کے سینے کے اندر کھنچتی چلی جا رہی ہے اور رتن بچوں کے ساتھ گا رہی تھی۔

کدم کی ڈریاں جھولا پڑ گیو ری

ایک لمحہ کے بعد رتن نے کہا۔ ذرا اوپر بڑھائیے صاحب، آپ سے تو جھولا بڑھتا نہیں۔

رما نے شرمندہ ہو کر اور زور لگایا مگر جھولا نہ بڑھا۔ رما کے سر میں چکر آنے لگے۔

رتن۔ آپ کو پینگ مارنا نہیں آتا۔ کبھی جھولا نہیں جھولے۔

رما نے جھکتے ہوئے کہا۔ ہاں ادھر تو برسوں سے نہیں جھولا۔

رتن۔ تو آپ بچوں کو سنبھال کر بیٹھئے۔ میں آپ کو جھولاؤں گی۔ اگر جھولا اس ڈال کو چھو لے تو کہنا۔

رما کی روح فنا ہو گئی۔ بولا۔ آج بہت دیر ہو رہی ہے پھر کبھی آؤں گا۔

رتن۔ ابھی کیا دیر ہو گئی ہے۔ دس بھی تو نہیں بجے۔ گھبرائیے نہیں۔ ابھی بہت رات پڑی ہے خوب جھول کر جائیے گا۔ کل جالپا دیوی کو بھی لائیے گا۔ ہم دونوں

جھولیں گے۔

رما جھولے پر سے اتر آیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ سر میں ایسا چکر آ رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا اب گرا۔ اب گرا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا سائیکل کی طرف چلا۔ اور اس پر بیٹھ کر بھاگا۔

کچھ دور تک اسے ہوش نہ رہا۔ پاؤں آپ ہی آپ پیڈل گھماتے جا رہے تھے۔ آدھی دور جانے کے بعد اسے ہوش آیا۔ اس نے سائیکل گھما دی۔ کچھ دور چلا۔ پھر اتر کر سوچنے لگا۔ اب کیا کرے۔ آج ملاحظہ میں پڑ کر اس نے کتنا چرکا کھایا۔ کیوں اس کے منہ سے آواز نہیں نکلی۔ رتن کوئی ہوّا تو نہیں جو اسے کھا جاتی۔

دفعتاً اسے یاد آیا۔ اس تھیلی میں آٹھ سو روپے تھے۔ شاید رتن نے روپے گنے نہیں۔ ورنہ ضرور ذکر کرتی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تھیلی کسی کو دیدے یا اسے اور روپوں کے ساتھ ملا دے۔ پھر تو غضب ہی ہو جائے گا کہیں کا نہیں رہوں۔ کیوں نہ اسی وقت چل کر بقیہ روپیہ مانگ لاؤں۔ لیکن اب تو دیر بہت ہو گئی۔ سویرے پھر آنا پڑیگا

اس نے پھر سوچا۔ مگر یہ دو سو روپے مل بھی گئے پھر بھی تو پانچسو روپیوں کی کمی رہے گی۔ اس کا کیا انتظام ہوگا۔ اب تو ایشور ہی بیڑا پار لگائے تو لگے گا۔ صبح تک کوئی انتظام نہ ہو سکا تو مصیبت کا سامنا ہوگا۔

زندگی میں ایسے موقع بھی آتے ہیں جب مایوسی میں بھی ہمارا شنہ امید نہیں ٹوٹتا رمانے سوچا۔ ایک بار پھر گنگو کے پاس چلوں۔ اس کے ہاتھ پاؤں پڑوں۔ ممکن ہے اسے کچھ رحم آ جائے۔ وہ فوراً صرافہ جا پہنچا۔ مگر گنگو کی دکان بند تھی۔ وہ پیچھے پھرا ہی تھا کہ چرنداس آتا ہوا نظر آیا۔ رما کو دیکھتے ہی بولا۔ بابوجی آپ نے تو ادھر کا راستہ ہی چھوڑ دیا۔ کہئے روپے کب تک ملیں گے۔

رمانے عاجزی کے ساتھ کہا۔ اب بہت جلد ملے جاتے ہیں دیر نہیں ہے گنگو کے روپے ادا کر چکا ہوں۔ اب تمہاری باری ہے۔

چرنداس۔ راجی وہ سب قصہ معلوم ہے۔ گنگو نے ہوشیاری سے روپے وصول نہ کر لئے ہوتے تو بہاری طرح بیٹھے تکتے۔ سال گزر رہا ہے۔ روپیہ سینکڑہ سود بھی لگایئے تو چوراسی روپئے ہوتے ہیں۔ کل دوکان پر آکر حساب کر جایئے پورا نہیں تو آدھا تہائی کچھ تو دیجئے۔ لین دین جاری رہنے سے مہاجن کی تسلی رہتی ہے۔ کان میں تیل ڈالے سے بیٹھے رہنے سے اسے شبہ ہونے لگتا ہے کہ اس کی نیت خراب ہے۔ تو کل کب آیئے گا۔

رما۔ بھائی کل میں روپئے دے کر تو نہ آ سکوں گا۔ یوں جب کہو تب چلا آؤں۔

کیوں؟ اس وقت اپنے سیٹھ جی سے چار پانچسو روپے کا بندوبست نہ کرا دو گے تمہاری مٹھی بھی گرم کر دوں گا۔

چرنداس۔ کہاں کی بات لئے پھرتے ہو بابو جی۔ انہوں نے یہی بڑا سلوک کیا کہ نالش نہیں کر دی۔ آپ کے پیچھے مجھے باتیں سننی پڑتی ہیں۔ کیا بڑے منشی جی سے کہنا پڑے گا۔

رما نے جھلا کر کہا۔ تمہارا دیندار میں ہوں۔ بڑے منشی جی نہیں ہیں۔ میں مر نہیں گیا ہوں گھر چھوڑ کر بھاگا نہیں جاتا۔ اتنے بے صبر کیوں ہو جاتے ہو۔

چرنداس۔ سال بھر ہوا ایک کوڑی تک نہیں ملی۔ کہاں تک صبر کریں۔ کل کم سے کم دو سو کی فکر رکھئے گا۔

رما۔ میں نے کہہ دیا۔ میرے پاس ابھی روپے نہیں ہیں۔

چرنداس۔ یہ روز رقمیں مارتے ہو۔ وہ کہاں جاتی ہیں۔ گھر میں کوئی ایسا لمبا خرچ بھی تو نہیں ہے۔

رما نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ سائیکل بڑھا دی۔ ادھر آیا تھا کہ شاید نجات کی کوئی صورت نکلے۔ الٹے تقاضا سہنا پڑا۔ کہیں یہ شیطان سچ مچ بابو جی کے پاس

تقاضا نہ بھیجے ۔ آگ ہی ہو جائیں گے ۔ جالپا بھی سمجھے گی کیسا لباڑیا آدمی ہے ۔ اسوقت رما کی آنکھوں سے آنسو تو نہ نکلے تھے مگر اس کا دل رواں رواں رو رہا تھا ۔ جالپا سے اپنی اصلی حالت چھپا کر اس نے کتنی بڑی غلطی کی ، وہ سمجھدار عورت ہے ۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں اتنا تنگ دست ہوں تو وہ مجھے کبھی زیر بار نہ کرتی ۔ اس نے تو کبھی اپنی زبان سے کچھ کہا ہی نہیں ۔ میں ہی اپنی شان دکھانے کے لئے مرا جا رہا تھا ۔ قرض کا اتنا بھاری بوجھ سر پر رکھ کر بھی اس نے کیوں نہ کفایت سے کام لیا ۔ اسے ایک ایک پیسہ دانتوں سے پکڑنا چاہیئے تھا ۔

اس دوران میں اس کی آمدنی ایک ہزار سے کم نہ ہوئی ہوگی ۔ اگر اس نے سختی کی ہوتی تو ان دونوں مہاجنوں کے آدھے آدھے روپے ضرور ادا ہو جاتے ۔ مگر وہاں تو سر پر شیطان سوار تھا ۔ اس کی کیا ضرورت تھی کہ جالپا محلہ بھر کی عورتوں کو جمع کر کے روز سیر کرنے جائے ۔ سینکڑوں روپے تو تانگہ والا ہی لے گیا ہوگا ۔ پر اسے تو بیوی پر رُعب جمانے کی دھن سوار تھی ۔ سارا بازار جان جائے کہ لالہ نرے لفنگے ہیں لیکن اپنی رفیق بیوی سے پردہ کیا جائے ۔

وہ گھر پہنچا تو جالپا نے پوچھا کہاں چلے گئے تھے بڑی دیر لگا دی ۔

رما ۔ تمہارے کارن رتن کے بنگلے تک جانا پڑا ۔ تم نے پوری تھیلی اٹھا کر دیدی اس میں دو سو روپے میرے بھی تھے ۔

جالپا ۔ تو مجھے کیا معلوم تھا ۔ تم نے کہا بھی تو نہیں ۔ لیکن اس کے پاس سے روپے جا نہیں سکتے آپ ہی بھیج دیں گی ۔

رما ۔ مانا مگر سرکاری رقم تو کل داخل کرنی پڑے گی ۔

جالپا ۔ مجھ سے دو سو روپے لے لینا میرے پاس ہیں ۔

رما کو یقین نہ آیا بولا ۔ کہیں ہوں نہ تمہارے پاس اتنے روپے کہاں سے

آئے۔

جالپا: نہیں اس سے کیا مطلب میں تو دو سو دینے کو کہتی ہوں۔

رما کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ دو سو روپے یہ دیدے۔ دو سو روپے رتن سے مل جائیں۔ سو روپے اس کے پاس ہیں ہی تو کل تین سو روپے کی کمی رہ جائے گی۔ مگر وہ تین سو روپے کہاں سے آئیں گے۔ ایسا کوئی نظر نہ آتا تھا جس سے اتنے روپے ملنے کی اُمید کی جا سکے۔ جب وہ کھانا کھا کر لیٹا، تو جالپا نے کہا۔ آج کس سوچ میں پڑے ہو؟

رما: سوچ کس بات کا کیا میں متفکر ہوں۔

جالپا: ہاں کسی فکر میں پڑے ہوئے ہو۔ مگر مجھ سے چھپا رہے ہو۔

رما: میں نے تو تم سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔

جالپا: واہ تم اپنے دل کی بات مجھ سے کیوں کہنے لگے۔ رشیوں کا حکم نہیں ہے

رما: میں ان رشیوں کا معتقد نہیں ہوں۔

جالپا: وہ تو جب معلوم ہوتا جب میں تمہارے دل میں بیٹھ کر دیکھتی۔

رات کو جالپا نے ایک خوفناک خواب دیکھا۔ اور چلا پڑی۔ رما نے چونک کر پوچھا کیا ہے جالپا، کیا خواب دیکھ رہی ہو۔ جالپا نے ادھر ادھر سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ بڑے عذاب میں جان پڑی ہے۔ بُرا بُرا خواب دیکھا۔

رما: کیا دیکھا۔

جالپا: کیا بتاؤں۔ کچھ کہا نہیں جاتا۔ دیکھتی تھی کہ تمہیں کئی سپاہی پکڑے لئے جا رہے ہیں۔ کتنی ڈراؤنی صورت تھی ان کی۔

رما کا خون خشک ہو گیا۔ دو چار دن قبل اس خواب کو اس نے ہنسی سے اڑا دیا ہوتا۔ اس وقت خواہ مخواہ ایک تشویش پیدا ہو گئی۔ مگر باہر سے ہنس کر بولا۔ تم نے سپاہیوں سے پوچھا نہیں، انہیں کیوں پکڑے لئے جاتے ہو۔

جالپا نہیں ہنسی سوجھ رہی ہے اور میرا دل کانپ رہا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد رما نے نیند میں بکنا شروع کیا۔ اماں کہے دیتا ہوں، پھر میرا منہ نہ دیکھو گی۔ میں ڈوب مروں گا۔

جالپا کو ابھی نیند نہ آئی تھی۔ وہ ڈر گئی۔ رما کو زور سے ہلا کر بولی مجھ سے تو ہنستے تھے اور خود بکنے لگے۔ سن کر روئیں کھڑے ہو گئے۔ خواب دیکھتے تھے کیا؟

رما نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ہاں جی نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا کچھ یاد نہیں۔

جالپا نے پوچھا۔ اماں جی کو کیوں دھمکا رہے تھے۔ سچ بتاؤ کیا دیکھتے تھے۔

رما نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔ کچھ یاد نہیں آتا۔ یونہی بکنے لگا ہونگا۔

جالپا۔ اچھا تو کروٹ سونا۔ چت سونے سے آدمی بکنے لگتا ہے۔

رما کروٹ سے لیٹ گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا گویا۔ فکر اور خوف آنکھوں میں بیٹھے ہوئے نیند کے حملوں سے ان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ جاگتے جاگتے دو بج گئے۔ دفعتہً جالپا اٹھ بیٹھی اور صراحی سے پانی انڈیلتی ہوئی بولی۔ بڑی پیاس لگی تھی کیا تم ابھی تک جاگ رہے ہو۔

رما۔ ہاں جی نیند اچٹ گئی ہے۔ میں سوچ رہا تھا تمہارے پاس دو سو روپے کہاں سے آ گئے۔

جالپا۔ یہ روپے میں اپنے گھر سے لائی تھی۔ کچھ بدائی میں ملے تھے کچھ منہ دکھائی میں۔

رما۔ تب تو تم روپے جمع کرنے میں بڑی ہوشیار ہو۔ یہاں کیوں نہیں کچھ جمع کیا؟

جالپا نے مسکرا کر کہا۔ تمہیں پا کر اب روپے کی پرواہ نہیں رہی۔

رما۔ اپنی تقدیر کو کوستی ہو گی۔

جالپا۔ تقدیر کو کیوں کوسوں۔ تقدیر کو وہ روئے جس کا شوہر نکھٹو ہو۔

شرابی ہو، بدچلن ہو، مریض ہو، طعنوں سے عورت کا دل چھید تا رہے، بات بات پر بگڑے آدمی اپنی مرضی کا ہو تو عورت اس کے ساتھ فاقہ کرکے بھی خوش رہے گی۔

رما نے تمسخر کرکے پوچھا۔ تو میں تمہارے من کا ہوں۔

جالپا نے محبت آمیز غرور سے کہا۔ میری جو امید تھی اس سے تم کہیں بڑھ کر نکلے میری تین سہیلیاں ہیں مگر ایک کا شوہر تم جیسا نہیں۔ ایک ایم اے پاس ہے، مگر دائم المریض دوسرا تعلیم یافتہ بھی ہے اور مالدار بھی مگر عیاش۔ تیسرا بالکل نکھٹو ہے۔

رما غمگین ہو گیا۔ ایسی وفادار اور خلوص کی دیوی کے ساتھ اس نے کتنا دغا کی۔ جب اتنا پردہ رکھنے پر بھی جالپا کو اس پر اتنا اعتماد ہے تو ان ظاہرداریوں کو مٹا کر اس کی زندگی کتنی پر عافیت ہوتی۔

(۱۹)

علی الصبح رما نے رتن کے پاس اپنا آدمی بھیجا۔ خط میں لکھا تھا مجھے بڑا افسوس ہے کہ کل جالپا نے آپ کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جو اسے لازم نہ تھا۔ میری منشا ہرگز نہ تھی کہ آپ کو روپے واپس کردوں۔ میں نے صراف کو تنبیہ کرنے کے لئے اس سے روپے لے لئے تھے۔ کنگن دو چار روز میں ضرور مل جائیں گے۔ آپ روپے بھیج دیں اس تھیلی میں دو سو روپے میرے بھی تھے۔ اس کا خیال رکھئے گا۔ غرض اپنی خودداری کا لحاظ رکھتے ہوئے جتنا انکسار ممکن تھا وہ اس نے ظاہر کر دیا۔ جب تک آدمی لوٹ کر نہ آیا وہ بڑی بے صبری سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ سوچ رہا تھا کہیں بہانہ نہ کر دے یا گھر پر ملے ہی نہیں، یا دو چار دن بعد دینے کا وعدہ کرے۔ سارا دارومدار رتن کے روپیوں پر تھا اگر اس نے صاف جواب دے دیا تو پھر خدا ہی حافظ ہے۔ اس کے انکار کرنا خیال کرکے ہی اس کی روح فنا ہو رہی تھی۔ آخر نو بجے آدمی لوٹا۔ رتن نے دو سو روپے تو دے

دیئے تھے مگر خط کا جواب نہ دیا تھا۔

رما نے مایوس آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا۔ رتن نے خط کا جواب کیوں نہیں دیا۔ کیا اتنی کج خلق ہے۔ کتنی مکار عورت ہے۔ رات کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شرافت اور اخلاق کی پتلی ہے۔ مگر دن میں یہ خیال کبھرا ہوا تھا۔ باقی روپوں کی فکر میں رما کو نہانے کھانے کی بھی یاد نہ رہی۔

کہار اندر گیا تو جالپا نے پوچھا۔ تمہیں کچھ دھندے کی بھی فکر ہے کہ سیر گشتی ہی کرتے رہو گے۔ دس بج رہے ہیں اور ابھی تک ساگ بھاجی کا کہیں پتہ نہیں۔

کہار نے تیور بدل کر کہا۔ تو کیا چار ہاتھ پیر کر لوں۔ کام ہی سے تو گیا تھا۔ بابو نے میم صاحب کے پاس روپیہ لینے کو بھیجا تھا۔

جالپا۔ میم صاحب کون؟

کہار۔ وہی جو موٹر پر چڑھ کر آتی ہیں۔

جالپا۔ تو لائے روپے؟

کہار۔ لایا کیوں نہیں۔ سوکوس پر تو رہتی ہیں۔ دوڑتے دوڑتے پاؤں ٹوٹ گئے

جالپا۔ اچھا جھٹ پٹ جا کر ترکاری لاؤ۔

کہار تو ادھر گیا۔ رما روپے لیے ہوئے اندر پہنچا تو جالپا نے پوچھا۔ تم نے اپنے روپے رتن سے منگوا لئے نا؟ اب تو مجھ سے نہ لوگے؟

رما نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ مت دو۔

جالپا۔ میں نے تو کہہ دیا تھا کہ روپے دے دوں گی۔ پھر آدمی کیوں دوڑا دیا سمجھی ہوں گی نا نہیں میرا اتنا اعتبار بھی نہیں۔

رما۔ میں نے روپے نہیں مانگے تھے۔ صرف اتنا لکھ دیا تھا کہ تھیلی میں دو سو روپے زیادہ ہیں۔

جالپا ہنسکر بولی۔ میرے روپے بڑے بھاگوان ہیں دکھاؤں ۔ جن چن کر نئے روپئے رکھے ہیں ۔ سب چماچم ۔ دیکھو تو آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں ۔

یکایک کسی نے نیچے سے آواز دی۔ بابوجی سیٹھ نے روپے کے لئے بھیجا ہے!

منشی دیانا تھ کسی کام سے اندر آرہے تھے ۔ سیٹھ کے پیادے کو دیکھ کر پوچھا۔ کون سیٹھ ؟ کیسے روپئے ؟ میرے یہاں کسی کے روپئے نہیں آتے ۔

پیادہ بولا۔ چھوٹے بابو نے کچھ مال لیا تھا سال بھر ہو گیا۔ ابھی تک ایک پیسہ نہیں نہیں دیا۔ سیٹھ جی نے کہا ہے بات بگڑنے پر دیئے تو کیا دیئے آج کچھ ضرور دلوا دیجئے

دیانا تھ نے رما کو پکارا اور بولے ۔ دیکھو کس سیٹھ کا آدمی آیا ہے اس کا کچھ حساب باقی ہے۔ صاف کیوں نہیں کر دیتے کتنا باقی ہے ۔

رما کچھ جواب نہ دے پایا تھا کہ پیادہ بول اٹھا۔ پورے ساڑھ سو بابوجی! ؁

منشی دیانا تھ کی آنکھیں پھیل کر پیشانی تک جا پہنچیں ۔ سات سو کیوں جی یہ تو سات سو کہتا ہے۔

رما نے ٹالنے کے ارادے سے کہا۔ مجھے ٹھیک معلوم نہیں۔

پیادہ۔ معلوم نہیں، پرزہ تو میرے پاس ہے۔ تب سے کچھ دیا ہی نہیں۔ رکم کہاں سے ہو گئے؟

رما۔ تم چلو دکان پر میں خود آتا ہوں۔

پیادہ۔ ہم بغیر روپے لئے نہ جائیں گے صاحب! آپ یونہی ٹال دیا کرتے ہیں اور باتیں ہم کو سننی پڑتی ہیں۔

رما کو ساری دنیا کے سامنے ذلیل ہونا گوارا تھا لیکن باپ کے سامنے اسی طرح کی ذلت اس کے لئے موت سے کم نہ تھی۔ جس آدمی نے اپنی زندگی میں کبھی حرام کا ایک پیسہ نہ چھوا ہو جس نے قرض لے کر کھانے کے بدلے بھوکوں سو رہنا منظور کیا جو اس کا

لڑکا اتنا بے شرم اور بے غیرت ہو رہا! اپنے والد کی روح کو اور زیادہ صدمہ نہ پہنچانا چاہتا تھا۔ تند لہجے میں پیادہ سے بولا۔ تم ابھی یہیں کھڑے ہو۔ ہٹ جاؤ نہیں تو دھکے دے کر نکال دیئے جاؤ گے۔

پیادہ۔ ہمارے روپے دلوا دیجئے ہم چلے جائیں۔ ہمیں آپ کے دروازے پر کیا مٹھائی ملتا ہے۔

رما۔ جا کر لالہ سے کہہ دو نالش کر دیں۔

منشی دیا ناتھ نے ڈانٹ کر کہا۔ کیا بے شرمی کی باتیں کرتے ہو جی۔ جب گرہ میں روپے نہ تھے تو چیز لائے ہی کیوں؟ اور جب لائے تب ادا کرو۔ کہہ دیا نالش کر دو۔ نالش کر دے گا تو آبرو رہ جائے گی تمہاری۔ اور نہیں یہ سوچی کیا کہ اتنا بڑا بوجھ سر پر لاد لیا۔ کوئی شادی بیاہ کا موقع ہوتا تو ایک بات بھی تھی۔ یہ عورت کیسی ہے جو شوہر کو ایسی بیہودگی کرتے دیکھتی ہے اور منع نہیں کرتی۔

رما کو یہ تنبیہہ بہت ہی بُری معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے خیال میں منشی جی کو اس معاملہ میں کچھ بولنے کا حق نہ تھا۔ گستاخی سے بولا۔ آپ ناحق اتنا بگڑ رہے ہو۔ آپ سے روپے مانگنے جاؤں تو کہیئے گا۔

اپنے دل میں اس نے کہا۔ ذلت آپ ہی کی بدولت ہو رہی ہے آپ ہی کی کرنی کا پھل بھوگ رہا ہوں۔

پیادہ نے باپ بیٹے میں تکرار ہوتی دیکھی تو چپکے سے راہ لی۔ منشی جی بھناتے ہوئے نہانے چلے گئے۔ رما اوپر گیا تو چہرہ پر خفت چھائی ہوئی تھی۔ جس بے عزتی سے بچنے کے لئے وہ ٹال ڈال بات بات بھاگتا پھرتا تھا وہ آج ہو ہی گئی۔ اس ذلت کے سامنے سرکاری روپیوں کی فکر بھی غائب ہو گئی۔ رما بھی عام قرض خوروں کی طرح بے غیرت نہیں ہوا تھا اگر موت کا فرشتہ اس کی جان لینے آتا تو وہ دوڑ کر اس کا خیر مقدم کرتا

جالپا نے پوچھا۔ تم نے کہا تھا اس کے اب تھوڑے ہی روپے باقی ہیں۔
رما نے سر جھکا کر کہا۔ بد معاش جھوٹ بول رہا ہے۔
جالپا۔ دیئے ہوتے تو کیوں روپوں کا تقاضا کرتا۔ جب تمہاری آمدنی اتنی کم تھی تو گہنے لئے ہی کیوں۔ میں نے تو کبھی ضد نہ کی تھی اور مان لو میں ضد بھی کرتی تو تمہیں سمجھ بوجھ کر کام کرنا تھا۔ اپنے ساتھ مجھے بھی چار گالی سنوا دیں۔ آدمی ساری دنیا سے پردہ رکھتا ہے لیکن اپنی بیوی سے تو پردہ نہیں رکھتا۔ اگر میں جانتی تمہاری آمدنی اتنی تھوڑی ہے تو مجھے کیا کتے نے کاٹا تھا کہ سارے محلے کی عورتوں کو تانگے میں بٹھا بٹھا کر سیر کرانے لے جاتی۔ کہیں نالش کر دے تو سات سو کے ایک ہزار ہو جائیں۔ مجھے نہ معلوم تھا کہ تم مجھ سے یہ فریب کر رہے ہو۔ کوئی بازاری عورت تو تھی نہیں کہ تمہیں نوچ کھسوٹ کر اپنا گھر بھر لیتی۔ میں تو بھلے برے دونوں ہی کی ساتھی ہوں۔ بھلے میں تم چاہے میری بات نہ پوچھو۔ لیکن برے میں تو تمہارے گلے پڑوں گی ہی۔
رما کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ دفتر کا وقت آ گیا تھا۔ کھانا کھانے کی مہلت نہ تھی۔ کپڑے پہنے اور دفتر چلا۔ ابھی گھر سے نکلا ہی چاہتا تھا کہ جالپا لپک کر نیچے آئی اور بولی۔ میرے پاس جو دو سو روپے ہیں وہ کیوں نہیں صراف کو دے دیتے۔ رما نے چلتے وقت عمداً جالپا سے روپے نہ مانگے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جالپا مانگتے ہی دیدے گی۔ لیکن باتیں سننے کے بعد روپے کے لئے اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے اُسے شرم آتی تھی۔ جالپا کی آواز سن کر ٹھٹک گیا اور بولا۔ اچھی بات ہے لاؤ دے دو۔ وہ باہر کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ جالپا دوڑ کر اوپر سے روپے لائی اور گن گر اس نے اس کی تھیلی میں ڈال دیئے۔ اس نے سمجھا تھا رما روپے پا کر پھولا نہ سمائے گا مگر اس کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔ اسے ابھی تین سو روپوں کی فکر اور کرنی تھی، وہ کہاں سے آئیں گے۔
سڑک پر آ کر رما نے ایک تانگہ لیا اور رتن کے بنگلے پر جا پہنچا شاید رتن سے

ملاقات ہو جائے۔ وہ چاہے تو تین سو روپوں کا بڑی آسانی سے انتظام کر سکتی ہے رات میں وہ سوچتا جاتا تھا آج ذرا بھی تکلیف نہ کرونگا۔ ذرا دیر میں رتن کا بنگلہ آ گیا، وہ سامنے ہی برآمدے میں بیٹھی تھی۔ رمانے اسے دیکھ کر ہاتھ اٹھایا۔ اس نے بھی ہاتھ اٹھایا تانگہ سامنے سے نکل گیا وہ بنگلہ کے اندر نہ جا سکا۔ رتن بلاتی تو وہ چلا جاتا۔ وہ برآمدے میں نہ بیٹھی ہوتی تب بھی شاید وہ اندر چلا جاتا۔ لیکن اسے بیٹھی دیکھ کر وہ محجوب ہو گیا

جب تانگہ اور آگے پہنچا تو رمانے اسے چنگی کے دفتر چلنے کو کہا اور گیارہ بجتے بجتے وہاں جا پہنچا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ چھاتی دھڑک رہی تھی۔ رمیش بابو نے اس کو ضرور پوچھا ہو گا جاتے ہی بلائیں گے دفتر کے کاموں میں وہ ذرا بھی رعایت نہیں کرتے تانگہ سے اترتے ہی اس نے پہلے اپنے کمرے کی طرف نگاہ ڈالی۔ دیکھا۔ کئی آدمی اس کی راہ دیکھ رہے تھے۔ وہ ادھر نہ جا کر رمیش بابو کے یہاں پہنچا۔ یہ انتشار اب اس کی برداشت سے باہر تھا۔

رمیش بابو نے پوچھا۔ تم اب تک کہاں تھے جی۔ خزانچی صاحب تمہیں تلاش کرتے پھرتے ہیں، چپڑاسی ملا تھا۔

رمانے اٹک اٹک کر کہا۔ میں گھر پر نہ تھا۔ ذرا وکیل صاحب کے یہاں چلا گیا تھا ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔

رمیش۔ کیسی مصیبت! گھر میں تو خیریت ہے۔

رما۔ جی ہاں خیر و عافیت تو ہے۔ کل شام کو یہاں کام بہت تھا میں اس میں ایسا پھنسا کہ وقت کی یاد نہ رہی۔ جب کام ختم کر کے اٹھا تو خزانچی صاحب چلے گئے تھے میرے پاس آمدنی کے آٹھ سو روپے تھے سوچنے لگا اسے کہاں رکھوں گا میرے کمرے میں کوئی صندوق تو ہے نہیں۔ یہی فیصلہ کیا کہ ساتھ لیتا جاؤں۔ پانچ سو روپے نقد تھے وہ تو میں نے تھیلی میں رکھے تین سو کے نوٹ جیب میں رکھ لئے۔ اور گھر چلا

چوک میں دو ایک چیزیں لینی تھیں ادھر سے ہوتا ہوا گھر پہنچا تو نوٹ غائب تھے۔

رمیش نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ تین سو روپے کے نوٹ غائب ہو گئے۔

رما۔ جی ہاں۔ کوٹ کے اوپر کی جیب میں تھے کسی نے نکال لئے۔

رمیش۔ اور تم کو مار کر تھیلی نہیں چھین لی۔

رما۔ کیا بتاؤں بابوجی۔ تب سے ایسے خلجان میں پڑا ہوا ہوں کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ صبح سے اسی فکر میں دوڑ رہا ہوں لیکن کوئی بند و بست نہ ہو سکا۔

رمیش۔ منشی جی سے تو تم نے کہا ہی نہ ہوگا۔

رما۔ ان کی عادت سے تو آپ واقف ہیں۔ روپے تو کیا دیتے الٹی ڈانٹ سناتے

رمیش۔ تو پھر کیا کرو گے۔

رما۔ آج شام تک کی مہلت دیجئے کچھ نہ کچھ کروں گا ہی۔

رمیش نے ترش ہو کر کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم سے اتنی لاپرواہی کیونکر ہوئی۔ میری جیب سے تو آج تک ایک پیسہ بھی نہ گرا۔ آنکھیں بند کر لیں تھیں یا نشہ میں تھے۔ مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں آتا۔ سچ سچ بتلا دو۔ کہیں اناپ شناپ تو نہیں خرچ کر ڈالے۔ اس دن تم نے مجھ سے روپے کیوں مانگے تھے۔

رما کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ رمیش کا قیاس اصلیت کے بہت قریب جا پہنچا تھا۔ بولا۔ کیا سرکاری روپے خرچ کر ڈالونگا۔ اس دن آپ سے روپے اس لئے مانگے تھے کہ بابوجی کو ایک ضرورت آپڑی تھی۔ میں نے آپ کا خط انہیں سنا دیا۔ بہت نوٹوں کے غائب ہونے کا تو مجھے خود بھی تعجب ہے۔

رمیش۔ تمہیں منشی جی سے مانگتے ہوئے شرم آتی ہو تو میں لکھ کر منگوا لوں۔

رما نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے آپ مجھے گولی مار دیں

رمیش نے ذرا تامل کر کے کہا۔ تمہیں یقین ہے شام تک روپے مل جائیں

گئے۔

رما۔ جی ہاں اُمید تو ہے۔

رمیش۔ پھر یہ پانچسو روپے جمع کر دو۔ مگر دیکھو بھائی میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں اگر کل دس بجے تک روپیہ نہ لائے تو مجھے الزام نہ دینا۔ قائدہ تو یہی کہتا ہے کہ میں اسی وقت تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں۔ لیکن تم ابھی لڑکے ہو۔ اس لئے رعایت کرتا ہوں۔ ورنہ تمہیں معلوم ہے کہ میں سرکاری کاموں میں کسی قسم کی رعایت نہیں کرتا۔ تمہاری جگہ اگر میرا لڑکا یا بھائی ہوتا تو میں اس کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کرتا۔ بلکہ شاید اس سے سخت۔ میرے پاس روپے ہوتے تو تمہیں دے دیتا۔ لیکن میری حالت تم جانتے ہو۔ نہ کسی کو قرض دیتا ہوں نہ کسی سے لیتا ہوں۔ کل روپے نہ آئے تو برا ہوگا۔ میری دوستی بھی تمہیں پولیس کے پنجہ سے نہ بچا سکے گی۔ میری دوستی نے تو آج اپنا حق ادا کر دیا۔ ورنہ اس وقت تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوتیں۔

ہتھکڑیاں!! رما سر سے پیر تک کانپ اٹھا۔ اس ذلت اور رسوائی کا خیال کر کے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ سزا یافتہ قیدی کی طرح اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مگر وہ لفظ رہ رہ کر اس کے دل کو مسوس لیتا تھا۔

(۲۰)

رما شام کو دفتر سے چلنے لگا تو رمیش بابو دوڑے ہوئے آئے اور کل روپے لانے کی سخت تاکید کی۔ رما دل میں جھنجلا اٹھا۔ آپ بڑے ایماندار کی دم بنتے ہیں مکار کہیں کا۔ اگر اپنی ضرورت آ پڑے تو دوسروں کے تلوے سہلاتے پھریں گے۔ مگر میرا کام ہے تو آپ اصول پرور بن بیٹھے۔ یہ سب دکھانے کے دانت ہیں مرنے کے وقت اس کی جان بھی جلد نہ نکلے گی۔

کچھ دُور جاکر اس نے سوچا ایک بار پھر رتن کے پاس چلوں۔ وہ جب اس کے بنگلے پر پہنچا تو وہ اپنے باغیچہ میں چبوترے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک گھونی جوہری بیٹھا ہوا تھا صندوق سے گہنے نکال نکال کر دکھا رہا تھا۔ رما کو دیکھ کر وہ بہت ہی خوش ہوئی۔ بولی۔ آیئے بابو جی دیکھئے سیٹھ جی کیسی اچھی اچھی چیزیں لائے ہیں۔ اس ہار کے دام بارہ سو روپے بتلاتے ہیں۔

رما نے ہار کو ہاتھ میں لے کر دیکھا اور کہا۔ ہاں چیز تو اچھی معلوم ہوتی ہے۔

رتن۔ دام بہت کہتے ہیں۔

جوہری۔ بائی جی ایسا ہار اگر کوئی دو ہزار میں لا دے تو جو جرمانہ کہئے دوں۔ میں نے تو لاگت بتلائی ہے۔

رما نے مسکرا کر کہا۔ ایسا نہ کہئے سیٹھ جی جرمانہ دینا پڑے گا۔

جوہری۔ بابو جی جب ہار نو سو روپیہ میں آجائیگا اور بالکل ایسا ہی بلکہ چمک دمک میں اس سے بھی بڑھ کر۔ مگر مال پرکھنا چاہیئے۔ میں نے خود ہی آپ سے مول تول کر بات نہیں کی۔ مول تول اناڑیوں سے کیا جاتا ہے۔ آپ سے کیا مول تول۔ ہم لوگ نرے روزگاری نہیں ہیں بابو صاحب۔ آدمی کا مزاج دیکھتے ہیں۔ شریمتی جی نے کیا امیرانہ مزاج پایا ہے کہ واہ!

رتن نے ہار کو للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ کچھ تو کم کیجئے سیٹھ جی۔ آپ نے تو جیسے قسم کھالی۔

جوہری۔ کمی کا نام نہ لیجئے حضور! یہ چیز آپ کی نذر ہے۔

رتن۔ اچھا تو ایک بات بتلا دیجئے رکم سے کم آپ اس کا کیا لیں گے۔

جوہری نے کچھ رنجیدہ ہو کر بارہ سو روپے اور بارہ کوڑیاں ہونگی۔ حضور اسی شہر میں پندرہ سو کا بیچونگا اور آپ سے کہہ جاؤنگا کس نے لیا۔

جوہری نے ہار کو رکھنے کے لئے کیس نکالا۔ رتن کو یقین آ گیا کہ یہ کچھ کم نہ کرے گا بچوں کی طرح بے صبر ہو کر بولی۔ آپ تو ایسا سمیٹے لیتے ہیں گویا ہار کو نظر لگ جائے گی

جوہری۔ کیا کروں صاحب۔ جب ایسے دربار میں چیز کی قدر نہیں ہوتی تو رنج ہوتا ہے۔

رتن نے کمرے میں جا کر رما کو بلایا۔ اور بولی۔ آپ کے خیال میں یہ کچھ اور نیچے اترے گا۔

رما۔ میرے خیال میں تو چیز ایک ہزار سے زیادہ کی نہیں ہے۔

رتن۔ اونہہ ہوگا۔ میرے پاس تو چھ سو روپے ہیں۔ آپ چار سو روپے کا انتظام کر دیں تو لے لوں۔ یہ اسی گاڑی سے کاشی جا رہا ہے ادھار نہ مانے گا۔ وکیل صاحب کسی جلسے میں گئے ہوئے ہیں۔ تو دس بجے سے پہلے نہ لوٹیں گے۔ میں آپ کو کل روپیہ لوٹا دوں گی۔

رما نے بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ یقین مانیئے۔ میں اس وقت بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ میں تو آپ سے روپے مانگنے آیا تھا وہ روپے مجھے دیدیجئے۔ میں آپ کے لئے یہیں سے کوئی اچھا سا ہار لاؤں گا۔ سات آٹھ سو سے زیادہ نہیں لگیں گے۔

رتن۔ پہلے ہی آپ کی باتوں میں نہیں آتی۔ چھ مہینے میں ایک کنگن تو بنوا نہ سکے اب ہار کیا لایئے گا۔ میں یہاں کئی دوکانیں دیکھ چکی ہوں۔ ایسی چیز شاید ہی کہیں نکلے اور نکلے گی بھی تو اس کے ڈیوڑھے دام دینے پڑیں گے۔

رما۔ تو اسے کل کیوں نہ بلایئے۔ سودا بیچنے کی غرض ہو گی تو آپ ٹھہرے گا۔

رتن۔ اچھا کہئے دیکھئے کیا کہتا ہے۔

دونوں کمرے سے باہر نکلے۔ رما نے جوہری سے کہا۔ تم کل آٹھ بجے کیوں نہیں آ جاتے۔

جوہری۔ نہیں حضور کل کاشی میں دو چار بڑے رئیسوں سے ملنا ہے۔ آج نہ جانے سے بڑا نقصان ہو جائیگا۔

رتن۔ میرے پاس تو اس وقت چھ سو روپے ہیں۔ باقی روپے کل لینے ہوں تو ہار دے دیجئے۔

جوہری۔ روپے کی تو کوئی بات نہیں۔ مہینہ دو مہینہ میں لے لیتا۔ لیکن ہم پردیسیوں کا کیا ٹھکانا۔ کون جانے یہاں پھر کب آنا ہو۔ آپ، اس وقت ایک ہزار دے دیں۔ دو سو پھر دے دیجئے گا۔

دفعتہً موٹر کی آواز سن کر رتن نے پھاٹک کی طرف دیکھا وکیل صاحب چلے آرہے تھے۔ رتن نے آگے بڑھ کر کہا۔ آپ تو نو بجے آنے کو کہہ گئے تھے۔

وکیل۔ وہاں کورم ہی پورا نہ ہوا۔ بیٹھ کر کیا کرتا۔ کوئی دل سے تو کام کرنا نہیں چاہتا۔ سب مفت میں نام کمانا چاہتے ہیں۔ یہ کیا کوئی جوہری ہے۔

جوہری نے اٹھ کر سلام کیا۔

وکیل صاحب رتن سے بولے۔ کیوں تم نے کوئی چیز پسند کی۔

رتن۔ ہاں ایک ہار پسند کیا ہے۔ بارہ سو مانگتے ہیں۔

وکیل۔ بس! اور کوئی چیز پسند کرو۔

رتن۔ اس وقت تو مجھے اور کوئی چیز کی ضرورت نہیں۔

وکیل صاحب کو رتن سے شوہر کی سی محبت نہیں۔ باپ کی سی تھی جیسے کوئی محبتی باپ لڑکیوں سے پوچھ کر کھلونے لیتا ہے وہ بھی رتن سے پوچھ پوچھ کر آرائش کے کھلونے لیتے تھے۔ ان کے پاس اسے خوش کرنے کے لئے دولت کے سوا اور چیز ہی کیا تھی۔ انہیں اپنی زندگی میں ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ ایک مجسم سہارے کی۔ جس کی قوت سے وہ اس عالم ضعیفی میں بھی کارزار ہستی میں کھڑے رہ سکیں۔

جیسے کسی بڈھے کو لاٹھی کی ضرورت ہوتی ہے یا کسی اُپاسک کو مُورتی کی۔ بغیر مورتی کے وہ کس پر پھول چڑھائے۔ کسے گنگا جل سے نہلائے۔ کیسے لذیذ چیزوں کا بھوگ لگائے۔

رتن نے کیس میں سے ہار نکال کر دکھایا اور بولی۔ اس کے بارہ سو مانگتے ہیں وکیل صاحب کی نگاہ میں روپے کی قیمت اس سے پیدا ہونے والی خوشی تھی۔ اگر ہار رتن کی پسند ہے تو انہیں اس کی پرواہ نہیں کہ اس کے کیا دینے پڑیں گے۔ اُنہوں نے چیک بک نکال کر جوہری کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ سچ سچ بولو کتنا لکھوں اور اگر فرق پڑا تو تم جانوگے۔

جوہری نے ہار کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا۔ ساڑھے گیارہ سو کر دیجئے

وکیل صاحب نے چیک لکھ کر اس کو دیا اور سلام کر کے رخصت ہوا۔

رما کچھ دیر تو بیٹھا وکیل صاحب کے سیاحتِ یورپ کے تذکرے سنتا رہا۔ آخر مایوس ہو کر چلا آیا۔

(۲۱)

اگر اس وقت کسی کو دنیا میں سب سے زیادہ فکرمند مصیبت زدہ اور زندگی سے بیزار انسان کی صورت دیکھنی ہو تو اس نوجوان کو دیکھئے جو سائیکل پر بیٹھا ہوا الفریڈ پارک کے سامنے چلا آرہا ہے۔ اس وقت اگر کوئی کالا سانپ نظر آئے تو وہ غالباً دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے گلے سے لگالے گا۔ اور اس کے زہر کو امرت کی طرح پیئے گا۔ اس کی نجات اب امرت میں نہیں زہر ہی میں ہے۔ موت ہی اب اس کی فکروں کا خاتمہ کر سکتی ہے لیکن کیا موت اسے زندگی سے بھی بچا سکتی ہے اگر رما نانھ اس وقت پھی جا کر جالپا سے سارا واقعہ بے کم و کاست

کہہ سناتا تو وہ اس کے ساتھ ضرور ہمدردی کرتی۔ یقیناً وہ اپنے سارے زیور اس کے سپرد کر دیتی۔ ان زیوروں کو گروی رکھ کر سرکاری روپے ادا کر دیتا۔

دل میں یہی فیصلہ کر کے رما گھر کی طرف چلا لیکن گھر پہنچ کر اس نے سوچا جب یہی کرنا ہے تو جلدی کیا ہے۔ جب جالپا سے مانگ لوں گا۔ کچھ دیر گپ شپ کرتا رہا تب کھانا کھا کر لیٹا دفعتہً اس کے جی میں آیا کیوں نہ چپکے سے کوئی چیز اٹھا لے جاؤں خاندانی وقار کی حفاظت کرنے کے لئے اس نے ایک بار یہ چال چلی تھی۔ اسی نسخہ سے کیا وہ اپنی جان کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ اپنی زبان سے تو شاید وہ کبھی اپنا پردہ فاش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ششں و پنج میں پڑے سویرا ہو جائے گا اور تب اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملے گا۔

مگر اندیشہ ہوا کہیں جالپا کی آنکھ نہ کھل جائے۔ پھر تو اس کے لئے ترببینی کے سوا اور کوئی جگہ ہی نہ رہے گی۔ جو کچھ بھی ہو ایک بار کوشش کرنا شرط ہے اس نے آہستہ آہستہ جالپا کا ہاتھ اپنے سینے پر سے ہٹایا اور چارپائی سے اتر کر فرش پر کھڑا ہو گیا۔ اسے ایسا شبہ ہوا کہ جالپا ہاتھ اٹھاتے ہی چونکی۔ لیکن پھر معلوم ہوا یہ محض شبہ تھا۔ اب اسے جالپا کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکالنا تھا۔ دیر کرنے کا موقع نہ تھا لیکن نیند میں بھی حواس ثانی قائم رہتے ہیں۔ بچہ کتنا ہی غافل سویا ہو، ماں کے چارپائی سے اٹھتے ہی جاگ پڑتا ہے۔ جب وہ چابی نکالنے کے لئے جھکا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ جالپا مسکرا رہی ہے اس نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور لیمپ کی ہلکی روشنی میں جالپا کے منہ کی طرف تاکنے لگا۔ جالپا کا رہ رہ کر مسکرانا بتلا رہا تھا کہ وہ کوئی دلیرانہ خواب دیکھ رہی ہے۔ اس تبسم نے گویا رما کے دل کو منور کر دیا۔ اس محبت اور وفا کی دیوی کے ساتھ وہ کتنا کمینہ پن کر رہا ہے۔ جس وقت اسے معلوم ہو گا کہ اس کے گہنے پھر چوری ہو گئے اس

کی کیا حالت ہو گی، وہ کن آنکھوں سے اُسے چھاتی پیٹتے اور سر کے بال نوچتے دیکھے گا۔

وہ پھر چارپائی پر لیٹ رہا۔ اسی وقت جالپا کی آنکھیں کھل گئیں اس کے منہ کی طرف دیکھ کر بولی۔ تم کہاں گئے تھے؟ میں بڑا اچھا خواب دیکھ رہی تھی ایک بڑا سا باغ ہے ہم تم دونوں اس میں ٹہل رہے ہیں۔ اتنے میں تم نہ جانے کہاں جاتے ہو اور ایک سادھو آکر میرے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی صورت بالکل دیوتاؤں جیسی ہے وہ مجھ سے کہتا ہے بیٹی! میں تم سے بہت خوش ہوں مجھ سے جو چاہے مانگ لے، میں تمہیں اِدھر اُدھر ڈھونڈ رہی ہوں کہ تم سے پوچھ کر کچھ مانگوں۔ پر تم کہیں دکھائی نہیں دیتے، میں سارا باغ چھان آئی درختوں کی آڑ میں دیکھا تم نہ جانے کہاں چلے گئے ہو۔ ہاں اتنے میں نیند کھل گئی کچھ مانگنے نہ پائی۔

رما نے مسکرا کر کہا۔ کیا مانگتیں۔

جالپا۔ مانگتی جو جی میں آتا۔ تمہیں کیوں بتاؤں۔

رما۔ میں سمجھ گیا۔ تم بہت سی دولت مانگتیں۔

جالپا۔ دولت کو تو تم بہت بڑی چیز سمجھتے ہو گے میں تو کچھ نہیں سمجھتی۔

رما۔ ہاں میں تو سمجھتا ہوں۔ مفلس رہ کر جینا مرنے سے بھی زیادہ بدتر ہے میں تو اگر کسی دیوتا کو پکڑ پاؤں تو بغیر کافی روپے لئے نہ چھوڑوں۔ میں سونے کی دیوار نہیں کھڑی کرنا چاہتا۔ نہ راک فیلر اور کارنیگی بننے کی مجھے ہوس ہے۔ میں صرف اتنی دولت چاہتا ہوں کہ روزمرہ کی ضرورتوں کے لئے ترسنا نہ پڑے۔ بس کوئی دیوتا مجھے پانچ لاکھ روپے دے دے تو میں پھر اس سے کچھ نہ مانگوں گا۔ ہمارے غریب ملک میں ایسے کتنے ہی رئیس ہیں جو پانچ لاکھ سالانہ خرچ کرتے ہیں۔

میں تو اتنے میں ساری عمر کی غلامی لکھنے کو تیار ہوں، مگر مجھے کوئی اتنا بھی نہیں دیتا۔

جالپا۔ مجھے تو اتنے روپے ملیں تو میں یہی سوچتی ہوں کہ اسے خرچ کیسے کروں

رما۔ تو پھر تم کیا مانگتیں۔ اچھے اچھے گہنے۔

جالپا نے ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ کیوں چڑھاتے ہو مجھے کیا میں گہنوں پر اور عورتوں سے زیادہ جان دیتی ہوں۔ میں نے تو کبھی تم سے ضد نہیں کی۔ تمہیں ضرورت ہو تو آج اٹھا لے جاؤ۔ مجھے مطلق ملال نہ ہوگا۔

رما نے جھینپ مٹاتے ہوئے کہا تو پھر بتاتی کیوں نہیں۔

جالپا نے شرماتے ہوئے کہا۔ میں یہی مانگتی کہ تم ہمیشہ مجھ سے محبت کرتے رہو تمہارا دل مجھ سے کبھی برگشتہ نہ ہو۔

رما نے ہنس کر کہا۔ اچھا تو کیا تمہیں یہ خوف بھی ہے۔

جالپا۔ اوروں کی حالت دیکھ کر مجھے بھی کبھی یہ خوف ہونے لگتا ہے۔ مجھے تو کوئی ایسی عورت نہ ملی جس نے اپنے شوہر کی بے مہری اور بے التفاتی کا قصہ نہ کہا ہو۔

یہ کہتے ہوئے جالپا نے رما کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور پیار میں ڈوبی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ سچ بتانا تم اب بھی مجھے اتنا ہی چاہتے ہو جتنا پہلے چاہتے تھے۔

رما نے جالپا کو گلے سے لگا کر کہا۔ اس سے کہیں زیادہ لاکھ گنا۔

جالپا نے ہنس کر کہا۔ بالکل جھوٹ سولہوں آنہ جھوٹ۔

رما۔ یہ تمہاری زبردستی ہے۔ آخر یہ تمہیں کیونکر معلوم ہوا۔

جالپا۔ کیوں میری آنکھیں نہیں ہیں۔ تم نے میرے پاس بیٹھنے کی قسم کھا لی ہے جب دیکھو گم سم بیٹھے رہتے ہو۔ مجھ سے محبت ہوتی تو مجھ پر اعتبار کیا ہوتا جس سے تم اپنے دل کی بری بات نہ کہہ سکو۔ اس سے تمہیں محبت نہیں ہو سکتی تم

اس کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھا سکتے ہو۔ عیش کر سکتے ہو۔ اسی طرح جیسے کوئی بازاری عورتوں کے پاس جاتا ہے وہاں آدمی زندگی کا لطف اٹھانے کے لئے ہی جاتا ہے۔ اپنے دل کا دکھ کہنے نہیں جاتا۔ میرے ساتھ تمہارا یہی سلوک ہے بولو ہے یا نہیں! کیا میں دیکھتی نہیں کہ تم باہر سے کچھ پریشان آتے ہو، باتیں کرتے ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے دل کہیں اڑا ہوا ہے کھانا بھی اسی طرح کھاتے ہو، جیسے بیگار ٹالتے ہو۔ کیا میں یہ ساری باتیں نہیں دیکھتی، تمہارے خیال سے مجھے دیکھنا نہ چاہیئے، تم صرف میرے حسن کے شیدا ہو۔ میرا کام ہے سیر و تفریح کرنا۔ آرائش میں مصروف رہنا۔ مجھے تمہاری فکروں سے کوئی سروکار نہیں ہے مگر کیا کروں مجھے ایشور نے وہ دل نہیں دیا ہے۔

وہ سر جھکائے سنتا رہا، جالپا نے اس کی فطرت کا اتنا صحیح مطالعہ کیا ہے اُس کا اُسے گمان بھی نہیں ہے۔ فی الواقعہ وہ اس کے حسن کا شیدائی تھا کبھی اس کا حسنِ باطن دیکھنے کی کوشش نہ کی۔

اگر اس کی صورت اتنی دلکش نہ ہوتی تو شاید وہ اس سے بولنا پسند نہ کرتا، اس کی ساری کشش، اس کی ساری مسرت جالپا کے حسن میں مرکوز تھی۔ وہ سمجھتا تھا جالپا اسی میں خوش ہے۔ اپنے فکروں کے بوجھ سے وہ اسے دبانا نہیں چاہتا تھا، مگر آج اس پر روشن ہوا کہ اس کی حسن پرستی جالپا کو آسودہ نہیں کر سکتی، وہ اس کی شریک درد ہونے کے لئے بے قرار ہے۔ اس وقت اسے اپنا درد دل کہہ ڈالنے کا اچھا موقعہ تھا لیکن شرم نے پھر اسکی زبان بند کر دی۔ جو باتیں وہ اتنے دنوں سے چھپائے ہوئے تھا، وہ اب کیسے کہے، کیا ایسا کرنا جالپا کے الزاموں کو صحیح تسلیم کرنا نہ ہوگا۔

رما انہیں خیالوں میں پڑا پڑا سو گیا۔ آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سویا تو اس ارادے سے تھا کہ بہت سویرے اٹھ جاؤں گا لیکن نیند کھلی تو کمرے میں روشنی پھیل چکی تھی، وہ گھبرا کر اٹھا۔ اور بغیر ہاتھ منہ دھوئے کپڑے پہن کر رمیش بابو کے یہاں

جانے کو تیار ہو گیا۔ انہیں اب محرم راز بنانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جالپا اس وقت کھانا بنانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ رما کو اس طرح جاتے دیکھ کر اس کے چہرہ کی طرف پرسوال نظروں سے دیکھا۔ رما کے چہرہ پر اضطراب اور کلفت اور خوف کی کیفیت نمایاں تھی۔ ان کی یہ کیا حالت ہے؟ اس سے وہ کچھ کہتے کیوں نہیں۔ وہ اور کچھ نہ کر سکے ہمدردی تو کر ہی سکتی ہے۔ تسکین تو دے ہی سکتی ہے۔ اس کے جی میں آیا رما کو پکار کر پوچھے کیا بات ہے۔ اٹھ کر دروازے تک آئی بھی لیکن رما نا تھ سڑک پر دور نکل گیا تھا۔ اس نے دیکھا وہ بڑی تیزی سے چلا جا رہا ہے جیسے سنک گیا ہو۔ نہ داہنی طرف تاکتا ہے نہ بائیں طرف، صرف سر جھکائے راہ گیروں سے ٹکراتا۔ تانگہ اور موٹر کی پرواہ نہ کرتا ہوا بھاگا چلا جا رہا تھا وہ ایک محویت کے عالم میں کئی منٹ تک دروازے پر کھڑی رہی پھر اندر آ کر کھانا بنانے لگی۔ لیکن اسی فکر میں غلطان و پیچاں تھی کہ کیا بات ہے، وہ اس سے کیوں اتنا چھپاتے ہیں۔

رما رمیش کے گھر پہنچا تو آٹھ بج گئے تھے۔ بابو صاحب چوکی پر بیٹھے سندھیا کر رہے تھے انہیں دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد سندھیا سے فارغ ہو کر بولے۔ کیا ابھی تک ہاتھ منہ نہیں دھو یا۔ یہی لیچڑ پن مجھے ناپسند ہے اور کچھ نہ کرو جسم کی صفائی کا تو خیال رکھو۔ کیا ہوا روپیہ کا کچھ انتظام ہوا۔

رما نے دل پر جبر کر کے کہا۔ اسی فکر میں تو آپ کے پاس آیا ہوں۔

رمیش۔ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ آخر منشی جی سے کہتے کیوں شرم آتی ہے یہی تو ہو گا کچھ سخت سست کہیں گے۔ لیکن اس بلا سے تو نجات مل جائے گی۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے ایسے حادثے زندگی میں ہوتے رہتے ہیں۔ انہیں چلو میں کہے دیتا ہوں۔

رما۔ ان سے کہنا ہوتا تو کبھی کا کہہ چکا ہوتا۔ کیا آپ کوئی بندوبست نہیں

کر سکتے۔

رمیش۔ کر کیوں نہیں سکتا۔ مگر کرنا نہیں چاہتا۔ ایسے آدمی کے ساتھ مجھے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ جو بات تم مجھ سے کہہ سکتے ہو، کیا ان سے نہیں کہہ سکتے۔ پہلے ان سے کہو اگر روپے نہ دیں تب میرے پاس آنا۔ اس بے التفاتی نے رما کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اتنی یگانگت کے باوجود یہ بیدردی! اس کے منہ سے کوئی دوسرا لفظ نہ نکلا۔ وہاں سے اُٹھ کر چلا۔ مگر کچھ سود نہ پڑتا تھا۔ جودائی میں آسمان سے گرتے ہوئے پانی کے قطروں کی جو حالت ہوتی ہے وہی حالت اس رما کی تھی۔ دس قدم تیزی سے آگے چلتا تو پھر کچھ سوچکر رک جاتا۔ اور دس پانچ قدم پیچھے لوٹ جاتا۔ کبھی اس گلی میں گھس جاتا۔ کبھی اس گلی میں۔ دفعتہً ایک ترکیب سوجھی۔ کیوں نہ جالپا کو ایک رقعہ لکھ کر سارا ماجرا کہہ سنائے۔ زبان سے تو وہ کچھ نہ کہہ سکتا تھا مگر قلم سے لکھنے میں اسے مشکل نہ ہوتی تھی۔ اس نے سوچا رقعہ لکھکر جالپا کو دے دونگا اور باہر کے کمرے میں آبیٹھوں گا۔ زبانی گفتگو کا موقعہ ہی نہ آنے دونگا۔ وہ بھاگا ہوا گھر آیا اور فوراً یہ رقعہ لکھا۔

جانِ من کیا کہوں۔ کس مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اگر ایک گھنٹہ کے اندر تین سو روپے کا انتظام نہ ہو سکا تو ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑجائیں گی۔ میں نے بہت ہاتھ پیر مارے کہ کسی سے قرض لے لونگا۔ مگر کوئی صورت نہ نکلی۔ اگر تم اپنے دو ایک زیور دیدو تو میں گرو رکھ کر کام نکالوں۔ جیوں ہی روپے ہاتھ آجائیں گے چھڑا دونگا اگر مجبوری نہ آپڑتی تو تمہیں تکلیف نہ دیتا۔ ایشور کے لئے ناراض نہ ہونا۔ میں نے تم سے اب تک راز کو چھپایا اس کا مجھے افسوس ہے۔

ابھی یہ خط پورا نہ ہوا تھا کہ رمیش بابو مسکراتے ہوئے آکر بیٹھ گئے اور بولے کہا ان سے تم نے؟

رما نے سر کھجلا کر کہا۔ ابھی تو موقعہ نہیں ملا۔

رمیش۔ تو کیا دو چار دن میں موقعہ ملے گا؟ میں ڈرتا ہوں کہ آج بھی کہیں خالی ہاتھ نہ چلے جاؤ۔ نہیں تو غضب ہی ہو جائے گا۔

رما۔ جب ایک بات دل میں طے کر لی تو اب کیا فکر؟

رمیش۔ آج موقعہ ملے تو ذرا رتن کے پاس چلے جانا۔ اس دن میں نے کتنا زور دیکر کہا تھا لیکن شاید تم بھول گئے۔

رما۔ بھول تو نہیں گیا تھا۔ ان سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔

رمیش۔ واہ رے آپ کی شرم۔ ذلیل تو وہ سمجھیں گی تمہیں کا ہے کو شرم۔ آج دفتر سے لوٹ کر ضرور چلے جانا۔ ذرا زبان ہلا دینے سے کسی غریب کا کام نکلتا ہو تو ہمیں دریغ نہ کرنا چاہیئے۔

رمیش بابو چلے گئے تو رما نے رقعہ اٹھا کر جیب میں ڈالا اور اندر داخل ہوا۔ جالپا آج کسی سہیلی کے گھر جانے کو تیار تھی۔ تھوڑی دیر ہوئی بلا وا آیا تھا اپنی بہترین ساڑھی پہنے تھی۔ ہاتھوں میں جڑاؤ کنگن زیب دے رہے تھے۔ گلے میں چندن ہار کھلا ہوا تھا آئینہ سامنے رکھے کانوں میں جھومک پہن رہی تھی۔ کچھ روکھے پن سے بولی۔ آج سویرے کہاں چلے گئے تھے ہاتھ منہ تک نہ دھویا۔ دن بھر تو باہر رہتے ہی ہو۔ شام سویرے تو گھر پر رہا کرو۔ تم نہیں رہتے تو گھر سُونا سُونا لگتا ہے۔ میں ابھی سوچ رہی تھی مجھے میکے جانا پڑے تو میں جاؤں یا نہ جاؤں۔ میرا جی تو وہاں بالکل نہ لگے۔

رما۔ تم تو کہیں جانے کو تیار بیٹھی ہو؟

جالپا۔ سیٹھانی جی نے بلا بھیجا ہے۔ دوپہر تک چلی آؤں گی۔

اس وقت رما کی حالت اس شکاری کی سی تھی جو ہرنی کو اپنے بچوں کے

ساتھ کلیلیں کرتے دیکھ کرتنی ہوئی بندوق اپنے کندھوں پر رکھ لیتا ہے اور بہ بادرانہ محبت کا نظارہ دیکھنے میں محو ہوجاتا۔

اسے اپنی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ کر جالیا نے کہا۔ دیکھو مجھے نظر نہ لگا دینا۔ میں تمہاری آنکھوں سے بہت ڈرتی ہوں۔

رما ایک ہی پرواز میں موجودات کی دنیا سے شعر اور تخیل کی دنیا میں جا پہنچا۔ ایسے موقعہ پر جب جالیا کا دل خوشی سے ناچ رہا تھا۔ کیا وہ اپنا خط دے کر اس کی حسرتناک سرگرمیوں کو خاک میں ملائے گا۔ وہ کونسا بے رحم صیاد ہے جو چہکتی ہوئی چڑیا کی گردن پر چھری چلا دیگا۔ وہ کونسا مردہ دِل آدمی ہے جو کسی گل نورس کو توڑ کر پیروں میں کچل دے گا۔ رما اتنا بے رحم اور مردہ دل نہیں ہے وہ کتنی ہی بڑی مصیبت میں کیوں نہ گرفتار ہوجائے اس کی کتنی ہی رسوائی ہو۔ اس کی زندگی ہی کیوں نہ تباہ ہوجائے مگر وہ اتنا بے حس نہیں ہوسکتا۔ اس نے مدہوش ہوکر کہا۔ نظر تو نہ لگاؤں گا۔ ہاں سینے سے لگا لونگا۔ اسی ایک جملہ میں اس کی ساری پریشانیاں اور ساری مشکلیں نظر ہوگئیں۔ وہ اس نادان بچے کی طرح تھا جو پھوڑے پر نشتر کی عارضی تکلیف کو نہ برداشت کرکے اس کے پھوٹنے ناصور پڑنے مہینوں چارپائی پر پڑے رہنے کی تکلیف منظور کرلیتا ہے۔

جالیا نیچے جانے لگی تو رمانے فرطِ محبت سے اسے گلے لگا لیا اور اس طرح کھینچ کھینچ کر پیار کرنے لگا گویا محبت کے خزانے کو آج ہی لٹا دیگا۔ کون جانتا ہے یہی اس کی آخری ملاقات ہے۔

دفعتہً جالیا بولی۔ مجھے کچھ روپے تو دیدو۔ شاید وہیں ضرورت پڑے۔

رمانے چونک کر کہا۔ روپے۔ روپے تو اس وقت نہیں ہیں۔

جالیا۔ نہیں ہیں۔ مجھ سے بہانہ کررہے ہو۔ بس مجھے دو سو روپیہ دیدو۔

زیادہ نہیں چاہتی!

یہ کہہ کر اس نے رما کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا اور کچھ پیسوں کے ساتھ وہ رقعہ بھی نکال لیا۔

رما نے ہاتھ بڑھا کر رقعہ کو جالپا کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کر کے کہا۔ کاغذ مجھے دے دو سرکاری کاغذ ہے۔

جالپا۔ کس کا خط ہے بتا دو!

پھر اس نے تہ کئے ہوئے پرزے کو کھول کر کہا۔ یہ سرکاری کاغذ ہے۔ جھوٹے کہیں کے تمہارا ہی لکھا۔ ۔۔۔۔۔

رما۔ دے دو۔

رما نے پھر کاغذ چھین لینا چاہا۔ مگر جالپا نے ہاتھ پیچھے کر کے کہا۔ میں بغیر پڑھے نہ دوں گی۔ زیادہ ضد کرو گے تو پھاڑ ڈالوں گی۔

رما۔ اچھا پھاڑ ڈالو۔

جالپا۔ تب تو میں ضرور پڑھوں گی۔

اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر پھر پرزہ کو کھولا اور پڑھنے لگی۔

رما نے دوبارہ اس کے ہاتھ سے رقعہ چھیننے کی کوشش کی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا آسمان پھٹ پڑا ہے گویا کوئی خوفناک جانور اسے نگلنے چلا آرہا ہے۔ وہ دھم دھم کرتے ہوئے اوپر سے اترا اور باہر چلا گیا۔ کہاں اپنا منہ چھپائے کہاں روپوش ہو جائے کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ اس کی حالت کسی برہنہ تن آدمی کی سی تھی۔ افسوس سارا پردہ کھل گیا اس کی ساری دروغ بافیوں کا پردہ فاش ہو گیا۔ جن باتوں کو جالپا سے اس نے چھپانے کی کوشش کی۔ ایسی ایسی مصیبتیں جھیلیں وہ آج اس کے منہ پر سیاہ داغ بن کر اس کی تشہیر کر رہی تھیں۔ وہ اب یہاں رہ کر اپنی ذلت اپنی

آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ جالپا کی سسکیاں، منشی جی کی جھڑکیاں، ہمسایوں کی چٹکیاں۔ سننے سے مرجانا کہیں آسان تر تھا۔ جب وہ اس دنیا میں نہ رہے گا تو اسے اس کی کیا پروا ہوگی کہ کوئی اسے کیا کہہ رہا ہے۔ ہائے! محض تین سو روپوں کے لئے اس کا ستیاناس ہوا جا رہا ہے۔

جالپا اسے کتنا بدنیت، کتنا مکار، کتنا فتنہ ساز سمجھ رہی ہوگی۔ کیا وہ اسے اپنا منہ دکھا سکتا ہے؟ کیا دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں وہ ایک نئی زندگی کا نقشہ بنائے۔ جہاں وہ دنیا سے الگ تھلگ سب سے منہ موڑ کر اپنی زندگی کے دن کاٹ سکے جہاں وہ اس طرح چھپ جائے کہ پولیس اس کا پتہ نہ پا سکے۔ گنگا کی گود کے سوا ایسی جگہ اور کہاں ہے اگر زندہ رہا تو مہینہ دو مہینہ میں ضرور ہی پکڑ لیا جائے گا۔ اس وقت اس کی کیا حالت ہوگی۔ وہ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے ہوئے عدالت میں کھڑا ہوگا سپاہیوں کی ایک فوج اسے گھیرے میں لئے کھڑی ہوگی۔ سارے شہر کے آدمی اس کا تماشہ دیکھ رہے ہونگے۔ انہیں میں جالپا بھی ہوگی۔ رتن بھی ہوگی۔ اس کے ماں باپ، عزیز و اقارب دوست آشنا سبھی مختلف انداز سے اس کی ذلت کا تماشہ دیکھیں گے۔ نہیں وہ اپنی مٹی یوں خراب نہ کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ ڈوب مرے۔ مگر پھر خیال آیا کہ جالپا کا کیا حشر ہوگا۔ ماں باپ تو رو دھو کر صبر کر لیں گے مگر اس کا دستگیر کون ہوگا کیا وہ چھپ کر کہیں نہیں رہ سکتا۔ کیا شہر سے دور چھوٹے گاؤں میں وہ روپوش نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کبھی جالپا کو اس پر رحم آجائے اس کی خطائیں معاف کر دے۔ کیا عجب ہے کبھی اس کے دن پھریں۔ لیکن یہ غیر ممکن ہے کہ وہ اس کے سامنے آنکھیں سیدھی کر سکے۔ نہ جانے اس وقت جالپا کی کیا حالت ہوگی۔ شاید اس رقعہ کا مطلب سمجھ گئی ہو۔ شاید صورت کا اس نے صحیح اندازہ کر لیا ہو۔ شاید اس نے جاگیشری کو وہ رقعہ دکھایا ہو اور دونوں گھرائی ہوئی اسے تلاش کر رہی ہوں۔

شاید منشی جی کو بلانے کے لئے لڑکوں کو بھیجا ہو۔ چاروں طرف اس کی تلاش ہو رہی ہوگی اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی ادھر بھی نہ آتا ہو۔ شاید موت کو بھی سامنے دیکھ کر وہ اتنا بدحواس نہ ہوتا جتنا کسی صورت آشنا کو دیکھ کر۔ آگے پیچھے چوکنی نگاہوں سے تاکتا ہوا وہ اس جلتی دھوپ میں چلا جا رہا تھا کچھ خبر نہیں کہاں۔ دفعتہً ریل کی سیٹی سن کر وہ چونک پڑا۔ ارے میں اتنی دور نکل آیا۔ ریل گاڑی سامنے کھڑی تھی گاڑی نے گویا زبردستی اسے اپنی طرف کھینچ لیا جیسے اس میں بیٹھتے ہی اس کی ساری پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔ مگر جیب میں روپے نہ تھے صرف انگلی میں ایک انگوٹھی پڑی ہوئی تھی اس نے قلی کو بلا کر کہا۔ کیوں بھائی یہ انگوٹھی بیچ کر لا سکتے ہو۔ ایک روپیہ تمہیں دونگا مجھے گاڑی میں جانا ہے گھر سے روپے لے کر چلا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہیں گر گئے۔ روپے لینے کے لئے گھر جاؤں تو گاڑی نہ ملے گی اور بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔

قلی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا سمجھ گیا کوئی مفرور ملزم ہے۔ انگوٹھی لی اور اسٹیشن کے اندر چلا گیا۔ رما ٹکٹ گھر کے سامنے ٹہلنے لگا آنکھیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ مگر دس منٹ گزر گئے قلی کا کہیں پتہ نہیں۔ کہاں چلا گیا کم بخت! انگوٹھی لے کر غائب تو نہ ہو جائے گا۔ اسٹیشن کے اندر جا کر اسے تلاش کرنے لگا۔ گھبراہٹ میں قلی کا نمبر تک نہ دیکھا تھا۔ ادھر گاڑی چھوٹی جا رہی تھی۔ رما سے صبر نہ ہو سکا سمجھ گیا قلی نے چرکا دیا۔ بغیر ٹکٹ لئے ہوئے گاڑی میں جا بیٹھا۔ دل میں طے کر لیا صاف کہہ دونگا کہ میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ اگر اترنا بھی پڑا تو یہاں سے دس پانچ کوس تو چلا ہی جاؤں گا۔

جب گاڑی روانہ ہو گئی تو رما کو اپنی خستہ حالی پر رونا آ گیا۔ نہ جانے اُسے کبھی لوٹنا نصیب بھی ہو گا یا نہیں۔ یہ رنگ ریلیوں کے دن گئے۔ ہمیشہ کے لئے اسی طرح

دنیا سے منہ چھپائے گوشہ گمنامی میں چھپا ہوا وہ ایک دن مر جائے گا۔ کوئی اسکی میت پر آنسو بہانے والا بھی نہ ہوگا۔ گھر والے بھی رو دھو کر خاموش ہو جائیں گے۔ اور اس کی یہ حالت کیوں ہوئی۔ محض اپنی حماقت سے اس نے شروع ہی سے خالہ کو اپنا محرم راز بنا لیا ہوتا تو آج اُسے منہ میں کالکھ لگا کر کیوں بھاگنا پڑتا۔

ابھی گاڑی کو چلے دس منٹ بھی نہ گزرے ہونگے کہ گاڑی کا دروازہ کھلا اور ٹکٹ بابو اندر آیا۔ رما کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ایک لمحہ میں یہ مردود اس کے پاس آجائے گا۔ اتنے آدمیوں کے سامنے اسے کتنی ندامت ہوگی اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ جیوں جیوں ٹکٹ بابو اس کے قریب آتا تھا اس کے نفس کی حرکت تیز ہوتی جاتی تھی۔ آخر بلا سر پر آہی گئی۔ ٹکٹ بابو نے پوچھا۔ آپ کا ٹکٹ؟

رما نے مصنوعی اطمینان سے کہا۔ میرا ٹکٹ تو قلی کے پاس ہی رہ گیا۔ اس کو ٹکٹ لانے کے لئے روپیہ دیا تھا نہ جانے کدھر نکل بھاگا۔

ٹکٹ بابو کو یقین نہ آیا۔ بولا۔ میں یہ کچھ نہیں جانتا۔ آپ کو اگلے اسٹیشن پر اترنا ہوگا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں۔

رما۔ سفر تو بڑی دور کا ہے۔ کلکتہ تک جانا ہے۔

ٹکٹ بابو۔ اگلے اسٹیشن پر ٹکٹ لے لیجئے گا۔

رما۔ یہی تو مشکل ہے۔ میرے پاس ۲۵ روپے کا نوٹ تھا۔ کھڑکی پر بھیڑ تھی۔ میں نے نوٹ ایک قلی کو ٹکٹ لانے کے لئے دیدیا۔ مگر وہ ایسا غائب ہوا کہ لوٹا ہی نہیں شاید آپ اسے پہچانتے ہوں۔ لمبا لمبا چیچک رو آدمی ہے۔

ٹکٹ بابو۔ اس کے متعلق آپ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ مگر بلا ٹکٹ سفر نہیں کر سکتے۔

رما نے انکسار کے ساتھ کہا۔ بھائی صاحب آپ سے کیا چھپاؤں میرے پاس

اور روپے نہیں ہیں۔

ٹکٹ بابو۔ مجھے افسوس ہے بابو صاحب ہم قاعدہ سے مجبور ہیں۔

کمرے کے سارے مسافر آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے۔ تیسرا درجہ زیادہ تر مزدور بیٹھے ہوئے تھے، وہ ایک بابو طبقے کے مخلوق کو ذلیل ہوتے دیکھ رہے تھے شاید ٹکٹ بابو رما کو دھکے دے کر نیچے گرا دیتا تو وہ اور خوش ہوتے، رما کو کبھی اپنی زندگی میں اتنی ذلت نہ ہوئی تھی، چپ چاپ سر جھکائے کھڑا تھا۔ ابھی زندگی کے اس نئے سفر کا آغاز ہوا ہے کون جانے آگے کیا کیا مصیبتیں جھیلنی پڑیں گی۔ کس کس کے ہاتھوں دھوکا کھانا پڑے گا۔ اس کے جی میں آیا گاڑی سے کود پڑوں۔ اس بے عزتی سے تو مر جانا کہیں اچھا تھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں، کھڑکی سے باہر سر نکال کر رونے لگا۔

دفعتہً ایک بوڑھے آدمی نے جو اس کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا پوچھا، کلکتہ میں کہاں جاؤگے بابو جی!

رما نے سمجھا یہ گنوار مجھے بنا رہا ہے جھنجھلا کر بولا، تم سے مطلب میں کہاں جاؤں گا۔

بوڑھے نے اس کی بدمزاجی پر دھیان نہ دیا۔ بولا۔ میں بھی وہیں چلوں گا بابو جی! ہمارا تمہارا ساتھ ہو جائے گا۔ پھر آہستہ سے بولا، کرائے کے لئے روپے مجھ سے لے لو، پھر وہاں دے دینا۔

اب رما کو اس پر کچھ اعتبار ہوا۔ اس کی طرف غور سے دیکھا کوئی ساٹھ ستر سال کا بوڑھا گھلا ہوا آدمی تھا، گوشت تو کیا ہڈیاں تک گل گئی تھیں، مونچھ اور سر کے بال منڈے ہوئے تھے ایک چھوٹی سی تسبیح کے سوا اس کے پاس اور کوئی اثاثہ بھی نہ تھا۔

رما کو اپنی طرف تاکتے ہوئے دیکھ کر بولا۔ آپ ہوڑے ہی اتریں گے یا کہیں

اور جائیں گے؟

رمانے احسان مندانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ بابا! میں اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤنگا روپے کا کوئی انتظام کرکے پھر آؤں گا۔

بوڑھا۔ تمہیں کتنے روپے چاہئیں مجھ سے لے لو۔ میں بھی تو وہیں چل رہا ہوں جب چاہے دے دینا۔ کیا میرے دس پانچ روپے لے کر بھاگ جاؤ گے۔ گھر کہاں ہے

رما۔ میں الٰہ آباد میں رہتا ہوں۔

بوڑھے نے عقیدت کے جوش سے کہا۔ پراگ راج کی کیا بات ہے۔ میں بھی تربینی کا اشنان کرکے آ رہا ہوں۔ سچ سچ دیوتاؤں کی پُوری ہے تو کتنے روپے نکالوں

رمانے شرماتے ہوئے کہا۔ میں چلتے ہی چلتے روپے نہ دے سکونگا۔ یہ سمجھ لو۔

بوڑھا مسکرا کر بولا۔ بھیا میرے دس پانچ روپے لے کر تم بھاگ تھوڑے ہی جاؤ گے؟ میں نے تو دیکھا پراگ کے پنڈے جاتریوں کو بنا لکھا پڑھی کے روپے دے دیتے ہیں دس روپے میں تمہارا کام چل جائے گا۔

رمانے سر جھکا کر کہا۔ ہاں اتنے کافی ہیں۔

ٹکٹ بابو کو کرایہ دے کر رما سوچنے لگا۔ یہ بوڑھا کتنا صاف دل، کتنا بے لوث کتنا نیک نیت واقع ہوا ہے۔ جو لوگ مہذب کہلاتے ہیں ان میں کتنے آدمی ایسے نکلیں گے جو اتنی فراخدلی سے کسی مسافر کی مدد کر سکیں!

دورانِ گفتگو میں رما کو معلوم ہوا کہ بوڑھا ذات کا کھٹک ہے، کلکتہ میں اس کی سبزی کی دکان ہے۔ اس کا وطن تو بہار ہے، مگر چالیس سال سے کلکتے ہی میں دکان کر رہا ہے۔ دیبی دین نام ہے اس وقت بدری ناتھ کی یاترا کرکے لوٹا جا رہا ہے۔

رمانے تعجب سے پوچھا۔ تم بدری ناتھ کی یاترا کر آئے۔ وہاں تو پہاڑوں کی بڑی پڑھائیاں ہیں۔

دیبی۔ بھگوان کی مرضی ہوتی ہے تو سب کچھ ہو جاتا ہے بابوجی۔ انکی نگاہ چاہیئے۔
رما۔ تمہارے بال بچے تو کلکتہ ہی میں ہونگے۔

دیبی دین نے دردناک تبسم سے کہا۔ بال بچے تو سب بھگوان کے گھر چلے گئے۔ چار بیٹے تھے دو لڑکوں کا تو بیاہ ہوچکا تھا سب چل دیئے۔ میں بیٹھا ہوا ہوں۔ اتنے پوئے ہوئے بیج کو کسان ہی کاٹتا ہے۔

یہ کہہ کر وہ پھر ہنسا اور بولا۔ بڑھیا ابھی جیتی ہے۔ دیکھیں ہم دونوں میں پہلے کون چلتا ہے وہ کہتی ہے پہلے میں جاؤں گی۔ میں کہتا ہوں پہلے میں جاؤں گا۔ دیکھیں دونوں میں کس کی ٹیک رہتی ہے۔ تم کبھی آنا تو دکھاؤں گا اب بھی اسے گہنوں کا شوق ہے۔ سونے کی بالیاں اور سونے کی ہنسلی پہنے دکان پر بیٹھی رہتی ہے۔ جب کہا تیرتھ کر آویں تو بولی۔ تمہارے تیرتھ کے لئے کیا اپنی دکان مٹی میں ملا دیں آدمی کی ہوس ایسی ہوتی ہے۔ "آج مرے کل دوسرا دن" مگر دوکان نہ چھوڑے گی۔ نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے۔ نہ کوئی رونے والا نہ کوئی ہنسنے والا۔ مگر ہوس نہیں جاتی۔ اب بھی کوئی نہ کوئی گہنہ بنوا تی رہتی ہے نہ جانے کب اس کا پیٹ بھرے گا۔ گھر گھر یہی حال ہے جہاں دیکھو ہائے گہنے! ہائے گہنے! گہنے کے پیچھے جان دے دیں۔ گھر کے آدمیوں کو بھوکا ماریں۔ گھر کی چیزوں کو کوڑا کر دیں اور کہاں تک کہوں۔ اپنی آبرو تک بیچ دیں۔ چھوٹے بڑے امیر وغریب سب کو یہی روگ لگا ہوا ہے۔ کلکتہ میں کہاں کام کرتے ہو بھیّا۔

رما۔ ابھی تو جا رہا ہوں قسمت آزمانے۔ دیکھوں کوئی نوکری چاکری ملتی ہے یا نہیں!

دیبی۔ تو پھر میرے ہی یہاں ٹھہرنا۔ نیچے دو کوٹھریاں ہیں اور ایک دالان۔ اوپر ایک کوٹھری اور چھت ہے آج بیچ دوں تو دس ہزار ملیں۔ اوپر والی کوٹھری

نہیں دے دونگا۔ جب کہیں کام مل جائے اپنا گھر لے لینا۔ پچاس سال ہوئے گھر سے بھاگ کر ہوڑے گیا تھا دانے دانے کو محتاج تھا تب سے سکھ بھی دیکھے دکھ بھی دیکھے اب تو یہی کہتا ہوں بھگوان سے چلو۔ بڑھیا جیتی رہے۔ نہیں اس کی دکان کون لے گا گھر کون لے گا اور گہنے کون لے گا۔

یہ کہہ کر دیبی دین پھر ہنسا۔ وہ اتنا زندہ دل اتنا خوش مزاج تھا کہ رما کو تعجب ہو رہا تھا۔ بے بات کی بات پر ہنستا تھا جس بات پر اور لوگ روتے ہیں اس پر اُسے ہنسی آتی تھی۔ اتنی ہی دیر میں اس نے اپنی زندگی کی ساری داستان کہہ سنائی۔ کتنے ہی لطیفے یاد تھے۔ بات بات پر لطیفہ کہتا تھا۔ گویا رما سے برسوں کی ملاقات ہے رما کو بھی اپنے متعلق ایک فرضی قصہ کہنا پڑا۔

دیبی دین۔ تو یہ کہو تم بھی گھر سے بھاگ کر آئے ہو۔ سمجھ گیا گھر میں جھگڑا ہوا ہوگا بہو کہتی ہوگی میرے پاس گہنے نہیں ہیں۔ میرے نصیب جل گئے۔ ساس بہو میں ٹھنی رہتی ہوگی۔ تم نہ ادھر سے بول سکتے ہوگے نہ ادھر سے۔ جب نہ برداشت ہوئی بھاگ کھڑے ہوئے۔

رما۔ ہاں بابا۔ بالکل یہی کیفیت ہے۔ مگر تم نے کیسے تاڑا؟

دیبی دین ہنس کر بولا۔ یہ بھی ایک علم ہے بھائی۔ بڑی محنت سے آتا ہے ابھی لڑکے بالے تو نہ ہوں گے۔

رما۔ نہیں ابھی تو نہیں ہیں۔

دیبی۔ چھوٹے بھائی ہوں گے۔

رما حیرت میں آکر بولا۔ ہاں دادا ٹھیک کہتے ہو۔ تم نے کیسے جانا۔

دیبی دین پھر قہقہہ مار کر بولا۔ یہ سب منتروں کا کھیل ہے سسرال مالدار ہے۔

کیوں؟

رما۔ہاں ہے تو۔

دینی۔مگر ہمت نہ ہوگی۔

رما۔بہت ٹھیک کہتے ہو دادا۔جب سے شادی ہوئی اپنی لڑکی تک کو تو بلایا نہیں!

دینی۔سمجھ گیا بھیّا۔یہی دنیا کا دستور ہے۔بیٹے کے لئے کھو چوری کریں بھیک مانگیں۔بیٹی کے نام گھر میں کچھ ہے ہی نہیں۔

تین دن سے رما کو نیند نہ آئی تھی۔دن بھر روپیوں کی فکر میں مارا مارا پھرتا۔رات بھر تارے گنا کرتا۔اس وقت باتیں سنتے سنتے اسے نیند آگئی۔گردن جھپکی لینے لگا۔دینی دین نے فوراً اپنی تھیلی کھولی۔اس میں سے ایک دری نکالی اور تختہ پر بچھا کر بولا۔اس پر لیٹ رہو بھیّا۔میں تمہاری جگہ بیٹھا جاتا ہوں۔

رما لیٹ رہا۔دینی دین بار بار محبت آمیز نگاہوں سے دیکھتا تھا گویا اس کا اپنا لڑکا کہیں سے لوٹا ہو۔

(۲۲)

جب رما نیچے اوپر سے نیچے آنر رہا تھا اس وقت جالپا کو اس کا ذرا بھی اندیشہ نہ تھا کہ وہ گھر سے بھاگا جا رہا ہے اس نے وہ رقعہ پڑھ لیا تھا۔اسے ایسا اشتعال ہو رہا تھا کہ جا کر رما کو خوب کھری کھری سنائے۔مجھ سے یہ دغا۔مگر ایک ہی لمحہ میں اس کا غصہ فرو ہو گیا۔خیال آیا کہیں ایسا تو نہیں ہوا ہے کہ سرکاری روپے خرچ کر ڈالے ہوں۔ضرور یہی بات ہے رتن کے روپے صراف کو دے دیئے ہونگے۔اس دن رتن کو دکھلانے کے لئے شاید وہ سرکاری روپے اٹھا لائے تھے اسی کو پورا کرنے کے لئے روپیوں کی ضرورت ہوگی۔یہ سوچکر اُسے رما پر غصہ آیا۔یہ مجھ سے کیوں اتنا پردہ کرتے ہیں کیوں

مجھ سے بڑھ بڑھ کر باتیں کرتے تھے۔ کیا میں اتنا بھی نہیں جانتی کہ دنیا میں امیر وغریب دونوں ہی ہوتے ہیں۔ کیا سبھی عورتیں زیوروں سے لدی ہوئی ہوتی ہیں۔ جب ضروری کاموں سے روپے بچتے تب زیور بھی بن جاتے ہیں۔ پیٹ اور تن کاٹ کر چوری یا بے ایمانی کر کے تو زیور نہیں بنوائے جاتے۔ کیا انہوں نے مجھے اتنا خودغرض سمجھ لیا ہے۔

اس نے سوچا۔ رما اپنے کمرے میں ہوں گے۔ چل کر پوچھوں کون کون سے زیور چاہتے ہیں صورت حال کتنی خطرناک ہے اس کا خیال کر کے اس کے دل پر غصے کے بجائے خوف طاری ہو گیا۔ وہ بڑی تیزی سے نیچے اتری۔ اسے یقین تھا کہ رما نیچے بیٹھے ہوئے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مگر کمرے میں آئی تو ان کا پتہ نہ تھا۔ سائیکل رکھی ہوئی تھی فوراً دروازے سے جھانکا سڑک پر بھی نہیں۔ کہاں چلے گئے دونوں لڑکے اسکول گئے تھے کس کو بھیجے کہ جا کر انہیں بلا لاوے۔ اس کے دل پر موہوم دہشت کا غلبہ ہوا۔ فوراً اوپر گئی گلے کے ہار اور ہاتھ کے کنگن رومال میں باندھے پھر نیچے اتری۔ سڑک پر آ کر ایک تانگا لیا اور کوچوان سے بولی۔ چنگی کچہری چلو۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اتنی دیر پس و پیش میں کیوں پڑی رہی کیوں نہ فوراً زیور اتار کر انہیں دیدیئے۔

راستہ میں وہ دونوں طرف غور سے دیکھتی جاتی تھی کیا اتنی جلدی دور نکل آئے شاید دیر ہو جانے کے باعث وہ بھی آج تانگے پر ہی گئے ہیں نہیں تو اب تک ضرور مل گئے ہوتے۔ تانگے والے سے بولی۔ کیوں جی تم نے ابھی کسی بابو جی کو تانگے پر جاتے دیکھا ہے تانگے والے نے کہا۔ ہاں ہو جی ابھی ادھر سے تو گئے ہیں۔

جالپا کو کچھ تسکین ہوئی۔ رما کے پہنچتے پہنچتے وہ بھی پہنچ جائے گی۔ کوچوان سے بار بار گھوڑا بڑھانے کو کہتی تھی جب وہ دفتر پہنچی تو گیارہ بج گئے تھے سینکڑوں آدمی ادھر ادھر دوڑتے نظر آتے تھے۔ کس سے پوچھے۔ کس کے پاس جائے۔ وہ نہ جانے کہاں بیٹھتے ہیں۔

دفتر کا چپڑاسی دکھائی دیا۔ جالیانے اسے بلا کر کہا۔ سنو جی۔ ذرا بابو رما ناتھ کو تو بلا لاؤ۔

چپڑاسی بولا۔ انہیں کو تو بلانے جا رہا ہوں۔ بڑے بابو نے بھیجا ہے آپ کیا اُن کے گھر ہی سے آ رہی ہیں۔

جالیا۔ ہاں میں تو گھر ہی سے آ رہی ہوں۔ ابھی دس منٹ ہوئے وہ گھر سے چلے گئے ہیں۔

چپڑاسی۔ یہاں تو نہیں آئے۔

جالیا کو بڑی تشویش ہوئی۔ وہ یہاں بھی نہیں آئے۔ راستہ میں بھی نہیں ملے۔ تو پھر گئے کہاں۔ کسی سانحہ کے خیال سے اس کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ آنکھیں بھر بھر آنے لگیں۔ وہاں بڑے بابو کے سوا اور کسی کو نہ جانتی تھی۔ ان سے ہمکلام ہونے کا اسے کبھی کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔ مگر اس وقت اس کا حجاب رخصت ہو گیا۔ خوف دل کے سارے جذبات پر حاوی ہو جاتا ہے۔

چپڑاسی سے بولی۔ ذرا بڑے بابو سے کہہ دو۔ نہیں چلو میں ہی چلتی ہوں۔

جالیا کی وضع قطع دیکھ کر چپڑاسی رعب میں آ گیا۔ الٹے پاؤں بڑے بابو کے کمرے کی طرف چلا۔ جالیا اس کے پیچھے پیچھے ہولی۔ بڑے بابو خبر پاتے ہی باہر نکل آئے۔

جالیا نے بڑے بابو کو سلام کر کے کہا۔ معاف کیجئے گا۔ بابو جی آپ کو تکلیف ہوئی۔ انہیں گھر سے چلے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہوئے مگر ابھی یہاں تک نہیں پہنچے آپ سے کچھ کہا تو نہیں۔

رمیش۔ آپ مسز رما ناتھ ہیں؟ مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔ وہ تو وقت کے بڑے پابند ہیں۔ تعجب ہے کہاں رہ گئے۔

جالیا نے چپڑاسی کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتی

ہوں۔

ریش۔ ہاں ہاں! میرے کمرے میں آجاؤ۔ کہیں بیٹھے شطرنج کھیل رہے ہونگے۔

جا لیا۔ نہیں بابوجی! مجھے اندیشہ ہے کہ وہ کہیں اور نہ چلے گئے ہوں۔ ابھی آدھ گھنٹہ ہوا انہوں نے میرے نام ایک پرزہ لکھا تھا (جیب سے پرزہ نکال کر) دیکھئے وہ پرزہ موجود ہے۔ آپ ان پر شفقت کی نگاہ رکھتے ہیں۔ آپ سے کیا پردہ۔ ان کے ذمہ کوئی سرکاری رقم تو نہیں آتی۔

ریش نے متعجب ہو کر کہا۔ کیوں انہوں نے تم سے کچھ ذکر نہیں کیا؟

جا لیا۔ بالکل نہیں!

ریش۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آج انہیں تین سو روپے جمع کرنے ہیں۔ پرسوں کی آمدنی انہوں نے جمع نہیں کی تھی۔ روپے تھیلی میں رکھے اور نوٹ جیب میں رکھ کر گھر چلے گئے۔ بازار میں کسی نے جیب سے نوٹ نکال لئے۔ (مسکرا کر) چال چلن کے بارے میں تو مجھے کبھی شک کرنے کا موقع نہیں ملا۔ مگر جوانی کے جنون میں اگر طبیعت بہک گئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔

جا لیا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی۔ آپ بزرگ ہیں۔ آپ سے کیا عرض کروں مگر جیب سے نوٹوں کا نکل جانا تو کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں۔ ایسے واقعہ آئے دن ہوتے رہتے ہیں کسی نے نکال لئے ہونگے۔ مارے شرم کے انہوں نے مجھ سے کہا نہ ہوگا۔ ذرا سا بھی اشارہ کرتے تو فوراً روپے نکال کر دے دیتی۔ اس میں بات ہی کیا تھی۔

ریش۔ کیا گھر میں روپے ہیں۔

جا لیا نے بیباکانہ انداز سے کہا۔ تین سو چاہیئے نہ۔ میں ابھی لئے آتی ہوں۔

ریش۔ اگر وہ گھر پر آگئے ہوں تو بھیج دینا۔

جا لپا آکر تانگے پر بیٹھی اور کوچوان سے چوک چلنے کو کہا۔ اس نے اپنا ہار بیچ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ یوں اس کی کئی سہیلیاں تھیں جن سے اس کو روپے مل سکتے تھے عورتوں میں باہم بڑا خلوص ہوتا ہے۔ مردوں کی طرح ان کی دوستی محض پان بیتوں ہی تک ختم نہیں ہو جاتی مگر اس وقت موقع نہ تھا صرافہ میں پہنچ کر وہ سوچنے لگی کس دوکان پر جاؤں خوف ہو رہا تھا ٹھگی نہ جاؤں۔ اس سرے سے اس سرے تک ایک چکر لگا آئی کسی دکان پر جانے کی ہمت نہ پڑی۔ ادھر وقت بھی گزرا جاتا تھا۔ آخر ایک دوکان پر ایک بوڑھے صراف کو دیکھ کر اس کا حجاب کچھ کم ہوا۔ صراف بڑا گھاگ تھا جالپا کو جھجکتے اور ہچکچاتے دیکھ کر سمجھ گیا۔ اچھا شکار پھنسا۔

جالپا نے ہار دکھا کر کہا۔ میں اسے بیچنا چاہتی ہوں۔

صراف نے ہار کو ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا اور بولا۔ ہاں تو چوکھا نہیں ہے آپ نے کہاں بنوایا تھا؟

جالپا۔ اس سے تمہیں کیا مطلب؟ تمہیں لینا ہو تو بتلاؤ۔ کیا دو گے۔

صراف نے ساڑھے تین سو دام لگائے اور بڑھتے بڑھتے چار سو تک پہنچا چھ سو کی چیز چار سو میں دیتے قلق تو ہو رہا تھا لیکن مجبوری تھی۔ مارے لالچ کے ہار کو بڑی احتیاط سے پہنا تھا۔ مفت میں دو سو کا نقصان ہو رہا تھا مگر کوئی علاج نہ تھا روپے لئے اور چل کھڑی ہوئی۔ جس ہار کو اس نے اتنے ارمانوں سے خریدا تھا۔ اُسے آج آدھے داموں بیچ کر اُسے ذرا بھی رنج نہ ہوا۔ بلکہ ایک غرور آمیز مسرت ہو رہی تھی جس وقت رما کو معلوم ہو گا کہ اس نے روپے ادا کر دیئے ہیں انہیں کتنی خوشی ہو گی، کہیں دفتر پہنچ گئے ہوں وہ روپے لئے پہنچے تو بڑا لطف آئے۔

رتن بابو اسے دیکھ کر بولے۔ کیا ہوا گھر پر ملے۔

جالپا۔ کیا ابھی تک یہاں نہیں آئے۔ گھر پر تو نہیں ملے۔ یہ کہہ کر اس نے

نوٹوں کا پلندہ رشیں بابو کی طرف بڑھا دیا۔ بڑے بابو نے نوٹوں کو گن کر کہا۔ ٹھیک ہیں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اب تک ہیں کہاں۔ اگر نہ آنا تھا تو کم سے کم ایک خط تو لکھ دیتے مجھے تو بڑا تردد ہو رہا ہے تم بڑے موقعہ سے آ گئیں۔ اس وقت تمہاری دور اندیشی اور ذہانت دیکھ کر جی خوش ہو گیا شریف عورتوں کا یہی وطیرہ ہے۔

جالپا جب گھر چلی تو اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ قد میں کچھ اونچی ہو گئی ہے اس کے جسم میں خون کی حرکت زیادہ تیز ہو گئی تھی اسے یقین تھا رما اگر مکان پر متفکر بیٹھے ہونگے وہ جا کر پہلے انہیں خوب آڑے ہاتھوں لے گی اور خوب شرمندہ کرنے کے بعد یہ خبر سنائے گی۔ لیکن جب گھر پہنچی تو رما ناتھ کا کہیں نشان نہ تھا۔

جاگیشوری نے پوچھا۔ کہاں چلی گئی تھیں دھوپ میں بہو۔

جالپا۔ ایک کام سے چلی گئی تھی۔ آج انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔

جاگیشوری۔ دفتر گئے ہونگے۔

جالپا۔ نہیں دفتر نہیں گئے۔ وہاں سے ایک چپڑاسی پوچھنے آیا تھا۔

یہ کہتی ہوئی وہ اوپر چلی گئی۔ بچے ہوئے روپے صندوق میں رکھے اور پنکھا جھلنے لگی۔ مگر گرمی سے جسم پھنکا جا رہا تھا۔ اس کے کان دروازہ کی طرف لگے ہوئے تھے۔ ابھی تک اسے اس کا ذرا بھی اندیشہ نہ تھا کہ رما نے پردیس کی راہ لی ہے چار بجے تک تو جالپا کو بہت زیادہ تردد نہ ہوا۔ لیکن جیوں جیوں دن ڈھلنے لگا۔ اس کا انتشار بڑھنے لگا۔ آخر وہ سب سے اونچی چھت پر چڑھ گئی۔ حالانکہ وہ چھت مخدوش ہونے کے باعث کوئی اوپر نہیں جاتا تھا اور وہاں سے چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن رما کسی طرف سے آتا نہ دکھائی دیا۔

جب شام ہو گئی اور رما گھر نہ آیا تو جالپا کی طبیعت گھبرانے لگی۔ آخر کہاں چلے

گئے۔ اگر کسی دوست کے گھر ہوتے تو کیا اب تک نہ لوٹتے۔ معلوم نہیں جیب میں کچھ ہے یا نہیں۔ بیچارے دن بھر سے نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہے ہونگے۔ وہ پھر پچھتانے لگی ان کا خط پڑھتے ہی اس نے کیوں نہ باہر نکال کر دے دیا۔ کیوں نہ پس و پیش میں پڑ گئی۔ وہ بیچارے مارے شرم کے گھر نہ آتے ہونگے۔

چراغ جل گئے تو اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ سوچا شاید رتن سے کچھ پتہ چلے۔ لیکن اس کے بنگلہ پر گئی تو معلوم ہوا آج تو وہ ادھر آئے ہی نہیں۔

تب جالپا نے ان سبھی میدانوں اور پارکوں کو چھان ڈالا۔ جہاں رما کے ساتھ وہ اکثر گھومنے جایا کرتی تھی اور نو بجتے بجتے مایوس گھر واپس آئی۔ اب تک اس نے اپنے آنسوؤں کو روکا تھا۔ شاید کچھ اُمید تھی کہ گھر پر آ گئے ہوں۔ لیکن جب گھر میں قدم رکھتے ہی اسے معلوم ہو گیا کہ وہ اب تک نہیں آئے تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یہ شبہ اب مضبوط ہو گیا کہ وہ کہیں چلے گئے۔ ایک موہوم سی اُمید تھی کہ شاید میرے پیچھے آئے ہوں اور پھر چلے گئے ہوں۔ جاکر جاگیشوری سے پوچھا۔ کیا وہ آئے ہی نہیں یا آکر کہیں چلے گئے۔

جاگیشوری۔ آئے ہی نہیں۔ یار دوستوں میں بیٹھے بیٹھے غپ شپ کر رہے ہونگے۔ گھر تو سرائے ہے۔ دس بجے گھر سے نکلے تھے ابھی تک پتہ نہیں۔

جالپا۔ وہ دفتر سے گھر آکر تب کہیں جاتے تھے۔ آج تو آئے ہی نہیں۔ دفتر بھی نہیں گئے۔ کہئے تو گوپی بابو کو بھیج دوں۔ جاکر دیکھیں کہاں رہ گئے۔

جاگیشوری۔ لڑکے اس وقت کہاں جائیں گے۔ ان کا کیا ٹھیک ہے۔ کہیں شطرنج ہو رہی ہوگی۔ تھوڑی دیر اور دیکھ لو۔ پھر کھانا اٹھا کر رکھ دینا۔ کوئی کہاں تک انتظار کرے۔

جالپا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ دفتر کی کوئی بات اس سے نہ کہی ——

جاگیشوری سُن کر گھبرا جاتی اور اسی وقت رونا پیٹنا شروع کر دیتی۔ وہ اوپر جا کر لیٹ گئی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رہ رہ کر ایسی بے قرار ہو جاتی تھی کہ اس کا سانس تیز چلنے لگتا تھا۔ بار بار خیال آتا اگر رات بھر نہ آئے تو کیا کرنا ہوگا۔ جب تک کچھ پتہ نہ چلے کہ وہ کدھر گئے تب تک کوئی جائے تو کہاں جائے۔ آج اس کے ضمیر نے پہلی بار تسلیم کیا کہ یہ سب اس کی کرنی کا پھل ہے۔ مانا کہ اس نے زیوروں کے لئے کبھی ضد نہیں کی۔ لیکن اس نے کبھی صاف طور سے منع بھی تو نہیں کیا۔ اگر چوری ہو جانے کے بعد اس نے کہرام نہ مچایا ہوتا تو آج یہ نوبت کیوں آتی۔ مایوسی کی حالت میں جالپا اپنے ہی کو ملعون کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی۔ رما رشوت لیتا ہے اس کا خرچ آمدنی سے زیادہ ہے پھر بھی اس نے کبھی منع نہیں کیا۔ اس نے خود کیوں اپنی کملی کے باہر پاؤں پھیلایا۔ کیوں اسے روز سیر و تفریح کی سوجھتی تھی۔ جب رما اسے تحفہ لا لا کر دیتا ہے تو کیوں پھولی نہ سماتی تھی۔ اس ذمہ داری کو بھی جالپا اس وقت اپنے اوپر ہی لے رہی تھی۔ کیوں اسے یہ سمجھ نہ آئی کہ آمدنی سے زیادہ خرچ کرنے کی سزا ایک دن بھگتنی پڑے گی۔ اب اسے ایسی کتنی ہی باتیں یاد آ رہی تھیں جن سے رما کی پریشانی اور بے اطمینانی کا اظہار ہوتا تھا۔ مگر اس نے کبھی ان معاملات کی طرف دھیان نہ دیا۔

جالپا اُنہیں افسوسناک خیالات میں ڈوبی نہ جانے کب تک بیٹھی رہی۔ جب چوکیداروں کی سیٹیوں کی آواز اس کے کانوں میں آئی تو وہ نیچے جا کر جاگیشوری سے بولی۔ وہ ابتک نہیں آئے۔ آپ چل کر کھانا کھا لیجئے۔

جاگیشوری بیٹھے بیٹھے جھپکیاں لے رہی تھی۔ چونک کر بولی۔ کہاں چلے گئے تھے جالپا۔ وہ تو اب تک نہیں آئے۔

جاگیشوری۔ اب تک نہیں آئے۔ آدھی رات تو ہو گئی ہو گی۔ جاتے وقت تم سے کچھ کہا بھی نہیں!

جالپا۔ کچھ بھی نہیں۔

جاگیشوری۔ تم نے تو کچھ نہیں کہا۔

جالپا۔ میں بھلا کیا کہتی۔

جاگیشوری۔ تو میں تمہارے دادا جی کو جا کر جگاؤں۔

جالپا۔ اس وقت جگا کر کیا کیجئے گا۔ آپ چل کر کچھ کھا لیجئے۔

جاگیشوری۔ مجھ سے اب کچھ نہ کھایا جائے گا۔ ایسا من موجی لڑکا ہے کہ کچھ کہا نہ سُنا نہ جانے کہاں بیٹھ رہا۔ کم سے کم کہلا تو دیتا کہ میں اس وقت نہ آؤں گا۔

جاگیشوری پھر لیٹ رہی۔ مگر جالپا اسی طرح بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ ساری رات گزر گئی۔ پہاڑ سی رات جس کا ایک ایک پل ایک ایک برس کی طرح کٹ رہا تھا

(۲۳)

ایک ہفتہ گذر گیا رما کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ بیچارے رمیش بابو دن میں کئی کئی بار آ کر پوچھ جاتے ہیں۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں، صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ رما ناتھ گیارہ بجے اسٹیشن کی طرف گئے تھے۔ منشی دیا ناتھ کا خیال ہے اگرچہ وہ اسے برملا ظاہر نہیں کرتے کہ رما نے خودکشی کر لی۔ ایسی حالتوں میں یہی ہوا کرتا ہے اس کی مثالیں انہوں نے خود آنکھوں دیکھی ہیں۔ ساس اور سُسر دونوں ہی جالپا پر سارا الزام تھوپ رہے ہیں۔ صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ یہی اس کی جان کی گاہک ہوئی۔ اس نے ان کا ناک میں دم کر دیا۔ پوچھو تھوڑی سی تو آپ کی آمدنی پھر نہیں روز سیر سپاٹے، دعوت تماشے کی کیوں سوجھتی تھی۔ جالپا پر کسی کو رحم نہیں آتا۔ کوئی اس کے آنسو نہیں پونچھتا۔ صرف رمیش بابو اس کی دور اندیشی اور مستعدی کی تعریف کرتے ہیں لیکن منشی دیا ناتھ کی آنکھوں میں ان فعلوں کی کوئی وقعت نہیں۔ آگ لگا کر پانی کے

لیئے دوڑنے سے کوئی بری الذمہ نہیں ہو جاتا۔

ایک دن دیا ناتھ کتب خانے سے لوٹے تو منہ لٹکا ہوا تھا۔ ایک تو ان کی صورت یونہی محرمی تھی۔ اس پر منہ لٹکا لیتے تھے تو کوئی بچہ بھی کہہ سکتا تھا کہ ان کا مزاج برہم ہے جا گیشوری نے پوچھا کیا ہے۔ کیا کسی سے بحث ہو گئی کیا۔

دیا ناتھ۔ نہیں جی ان تقاضوں کے مارے حیران ہو گیا۔ جدھر جاؤ ادھر نوچنے دوڑتے ہیں۔ نہ جانے کتنا قرض لے رکھا ہے آج تو میں نے صاف کہہ دیا میں کچھ نہیں جانتا میں کسی کا دیندار نہیں جا کر میم صاحب سے مانگو۔

اسی وقت جالپا آپڑی۔ یہ الفاظ اس کے کانوں میں پڑ گئے۔ ان سات دنوں میں اس کی صورت ایسی بدل گئی تھی کہ پہچاننا مشکل تھا۔ روتے روتے آنکھیں سوجھ آئی تھیں۔ منشی جی کے یہ بے رحمانہ الفاظ سن کر جیسے زخم پر نمک پڑ گیا۔ بولی۔ ہاں آپ انہیں سیدھے میرے پاس بھیج دیجئے۔ میں تو انہیں سمجھا دوں گی یا ان کے دام چکا دوں گی۔

دیا ناتھ نے برہم ہو کر کہا۔ کیا دے دو گی تم۔ سات سو تو ایک ہی صراف کے ہیں۔ ابھی کے پیسے دیئے ہیں تم نے۔

جالپا۔ اس کے گہنے موجود ہیں۔ مشکل سے دو چار بار پہنے ہیں۔ وہ آئے تو میرے پاس بھیج دیجئے۔ میں اس کی چیزیں واپس کر دونگی۔ بہت ہو گا دو چار روپے تاوان کے لے لیگا۔

یہ کہتی ہوئی وہ اوپر جا رہی تھی کہ رتن آ گئی اور گلے سے لگاتی ہوئی بولی۔ کیا اب تک کوئی خبر نہیں ملی۔

جالپا پر ان الفاظ میں ہمدردی اور محبت کا تسلی بخش اثر ہوا۔ یہ غیر ہو کر اتنی دلگیر ہے اور یہاں اپنے ہی ساس اور سسر ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہیں۔ ان اپنوں سے

توغیر ہی اچھے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ابھی تو کچھ خبر نہیں بہن!

رتن۔ یہ بات کیا ہوئی۔ تم سے کچھ تکرار تو نہیں ہو گئی۔

جالپا۔ ذرا بھی نہیں۔ قسم کھاتی ہوں۔ انہوں نے نوٹوں کے چوری ہونے کا مجھ سے ذکر ہی نہیں کیا۔ اگر اشارہ کر دیتے تو میں روپے دے دیتی۔ جب وہ دوپہر تک نہیں آئے اور میں ان کی تلاش میں دفتر گئی۔ تب یہ حقیقت کھلی۔ میں نے اسی وقت روپے جمع کر دیئے۔

رتن۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ کسی سے آنکھیں لڑ گئیں۔ دس پانچ دن میں آپ ہی پتہ لگ جائیگا۔ بات سچ نہ نکلے تو جرمانہ دوں۔

جالپا نے ہک بکا کر پوچھا۔ کیا تم نے کچھ سنا ہے؟

رتن۔ نہیں سنا تو نہیں۔ لیکن میرا قیاس ہے۔

جالپا۔ تو تمہارے قیاس بالکل غلط ہیں۔ مجھے اس پر رتی بھر بھی اعتبار نہیں۔ ان میں اور چاہے جتنی برائیاں ہوں۔ یہ عیب نہیں۔

رتن نے ہنس کر کہا۔ اس فن میں یہ لوگ بڑے استاد ہوتے ہیں تم بیچاری کیا جانو۔

جالپا۔ اگر وہ اس فن میں استاد ہوتے ہیں تو ہم بھی مزاج شناسی کے فن میں کچھ دخل رکھتے ہیں۔ میں اسے نہیں مان سکتی۔

رتن۔ اچھا چلو کہیں گھومنے چلتی ہو۔

جالپا۔ نہیں اس وقت تو مجھے فرصت نہیں ہے۔ پھر گھر والے یونہی در پے ہو رہے ہیں۔ تب تو زندہ ہی نہیں چھوڑیں گے۔ کدھر جانے کا ارادہ ہے

رتن۔ کہیں نہیں ذرا بازار جانے کا ارادہ ہے۔

جالپا۔ کیا لینا ہے؟

رتن۔ جوہریوں کی دکان پر دو ایک چیز دیکھونگی۔ بس میں تمہارے جیسا کنگن

چاہتی ہوں۔ بابو جی نے کبھی کئی مہینے کے بعد روپے لوٹا دیئے۔ اب خود تلاش کروں گی۔

جالپا۔ میرے کنگن میں ایسے کونسے روپے لگے ہیں، بازار میں اس سے بہت اچھے مل سکتے ہیں۔

رتن۔ میں تو اسی نمونے کے چاہتی ہوں۔

جالپا۔ اس نمونے کا تو بنا بنایا بہت مشکل سے ملے گا۔ اور بنوانے میں مہینوں کا جھنجھٹ۔ اگر صبر نہ آتا ہو تو میرا ہی کنگن لے لو۔ میں پھر بنوالونگی۔

رتن نے اچھل کر کہا، واہ تم اپنا کنگن دے دو تو کیا کہنا ہے موسلوں ڈھول بجاؤں چھ سو کا تھا نہ؟

جالپا۔ ہاں تھا تو چھ سو کا۔ مگر مہینوں صراف کی دکان کی خاک چھاننی پڑی تھی جڑائی تو خود بیٹھ کر کروائی تھی تمہاری خاطر دیدونگی۔

جالپا نے کنگن نکال کر رتن کے ہاتھ میں پہنا دیئے۔ رتن کا چہرہ ایسا شگفتہ ہوگیا گویا کسی کنگلے کو پارس مل گیا ہو۔ احسان مندانہ انداز سے بولی۔ تم جتنا کہو اتنا دے دوں۔ تمہیں دبانا نہیں چاہتی۔ تمہارے لئے یہی کیا کم ہے کہ تم میری اتنی خاطر کررہی ہو۔ مگر ایک بات ہے ابھی سب روپے نہ دے سکوں گی۔ اگر دو سو روپے پھر دیدوں تو کچھ ہرج ہے۔

جالپا نے فراخدلی سے کہا، کچھ بھی ہرج نہیں، کچھ بھی مت دو!

رتن۔ نہیں اس وقت میرے پاس چار سو روپے ہیں یہ میں دئے جاتی ہوں۔ میرے پاس رہیں گے تو کسی کام میں خرچ ہوجائیں گے۔ میرے ہاتھ میں تو روپے ٹکتے ہی نہیں کیا کروں۔ جب تک خرچ نہ ہوجائیں میرے سر پر ایک بوجھ سوار رہتا ہے۔

جالپا کا دل اس وقت مسوس اٹھا۔ اس کی کلائی پر یہ کنگن دیکھ کر رماناتھ کیسے خوش ہوتے تھے۔ آج وہ ہوتے تو کیا یہ چیز اس طرح جالپا کے ہاتھ سے نکل جاتی۔ پھر

کون جانے کنگن پہننا اُسے نصیب بھی ہوگا یا نہیں۔ اس نے بہت ضبط کیا مگر آنسو نکل ہی آئے۔ رتن اس کے آنسو دیکھ کر بولی۔ اس وقت رکھ لو بہن! پھر لے لونگی جلدی ہی کیا ہے
جالپا نے کنگن کی ڈبیا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ کیوں کیا میرے آنسو کو تمہاری خاطر سے دے رہی ہوں۔ نہیں تو یہ چیز جان سے زیادہ مجھے عزیز تھی تمہارے ہاتھ میں دیکھ کر مجھے اتنی ہی خوشی ہوگی جتنی اپنے ہاتھوں میں دیکھ کر۔ ہاں اتنی مہربانی کرنا کہ کسی دوسرے کو مت دے دینا۔

رتن۔ کسی دوسرے کو کیوں دینے لگی۔ میں اسے تمہاری نشانی سمجھونگی۔ آج بہت دنوں کے بعد میری دلی تمنا پوری ہوئی۔ رنج اتنا ہی ہے کہ بابوجی اس وقت نہیں ہیں۔ میرا دل تو کہتا ہے وہ جلد ہی آجائیں گے مارے شرم کے کہیں چلے گئے ہیں اور کوئی بات نہیں۔ وکیل صاحب کو بھی بڑا رنج ہوا۔ لوگ کہتے ہیں وکیل بڑے کٹھ کلیجے ہوتے ہیں مگر ان کی تو یہ حالت ہے کہ کوئی دردناک بات سنی اور تڑپ اٹھے۔

جالپا نے مسکرا کر کہا۔ ایک بات پوچھوں بُرا تو نہ مانو گی۔ وکیل صاحب سے تمہارا دل تو نہ ملتا ہوگا۔

رتن کا شگفتہ بشاش چہرہ ذرا دیر کے لئے تاریک ہوگیا۔ گویا کسی نے ایک ایسے دوست کی یاد دلا دی ہو جس کے نام کو وہ بہت پہلے رو چکی تھی۔ بولی۔ بہن! مجھے تو کبھی خیال بھی نہیں آیا کہ میں جوان ہوں اور یہ بوڑھے۔ میرے دل میں جتنی محبت جتنا ایثار ہے وہ سب میں نے ان کے اوپر قربان کر دیا ہے۔ محبت جوانی یا دولت یا شکل صورت سے نہیں پیدا ہوتی ہے۔ میرے لئے ہی وہ اس عمر میں اتنی محبت کرتے ہیں اور دوسرا ہے ہی کون۔ کیا چھوٹی بات ہے۔ کل کہیں گھومنے چلو گی تھوڑی شام کو آجاؤں۔

جالپا۔ جاؤنگی تو میں کہیں نہیں مگر تم آنا ضرور۔ دو گھڑی دل بہلے گا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ بُرے بُرے خیال آتے رہتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا انہیں مجھ سے اتنا حجاب کیوں

تھا۔ شاید یہ بھی میری ہی خطا ہے۔ مجھ میں ضرور انہوں نے کوئی ایسی برائی دیکھی ہوگی جس کے باعث وہ مجھ پر اعتبار نہ کر سکتے تھے۔ مجھے اگر رنج ہے تو یہی کہ وہ مجھے غیر سمجھتے رہے جس سے ہمیں محبت ہوتی ہے اس سے پردہ نہیں رکھتے۔

رتن اٹھ کر چلی تو جالپا نے دیکھا کنگن کا بکس میز پڑا ہے بولی۔ اسے لیتے جاؤ بہن کیوں چھوڑے جاتی ہو۔

رتن۔ لے جاؤں گی ابھی کیا جلدی پڑی ہے۔ ابھی پورے روپے تو نہیں دیئے۔

جالپا۔ نہیں نہیں لیتی جاؤ۔ میں نہ مانوں گی۔

مگر رتن سیڑھی سے نیچے اتر گئی۔ جالپا ہاتھ میں کنگن لئے کھڑی رہ گئی۔

تھوڑی دیر بعد جالپا نے صندوق سے پانچسو روپے نکالے اور دیانا تھ کے پاس جا کر بولی۔ یہ روپے چرنداس کے پاس بھجوا دیجئے۔ باقی روپے بھی دو چار دن میں دے دوں گی۔

دیاناتھ نے خفیف ہو کر کہا۔ روپے کہاں سے مل گئے۔

جالپا بیباکانہ لہجے میں بولی۔ رتن کے ہاتھ اپنا کنگن بیچ دیا۔

دیاناتھ اس کا منہ تاکنے لگے۔

(۲۴)

ایک مہینہ گزر گیا۔ الہ آباد کے سب سے کثیر الاشاعت روزانہ اخبار میں ایک نوٹس نکل رہا ہے جس میں رما ناتھ کو واپس آنے کی تحریک کی گئی ہے اور اس کا سراغ لگانے والے کو پانچ سو روپے انعام دینے کا وعدہ کیا گیا ہے مگر ابھی کہیں سے کوئی خبر نہیں آئی۔ جالپا فکر اور غم سے گھلتی جاتی ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر دیانا تھ کو بھی اس پر رحم آنے لگا ہے۔ آخر انہوں نے ایک دن اپنے سمدھی دیندیال کو لکھا۔ آپ آکر

کچھ دنوں کے لئے ہوکو رخصت کرانے جائیے۔ دینديال خط پاتے ہی گھبرائے ہوئے آئے۔ مگر جالپا نے میکے جانے سے انکار کر دیا۔

دینديال نے کچھ ترش ہوکر کہا۔ کیا یہاں پڑے پڑے جان دے دینے کا ارادہ کر لیا ہے۔

جالپا نے خود دارانہ انداز سے کہا۔ اگر جان کو اس طرح جانا ہے تو کون روک سکتا ہے، لیکن میں ابھی مرنے کی نہیں، سچ جانیئے غم نصیبوں کو موت بھی نہیں پوچھتی۔

دینديال۔ آخر چلنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ شہزادی اور بسنتی دونوں آئی ہوئی ہیں ان کے ساتھ ہنسنے بولنے سے جی بہلتا رہے گا۔

جالپا۔ یہاں اماں جی اور لالہ کو چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ جب رونا ہی لکھا ہے تو روؤں گی۔

دینديال۔ یہ بات کیا ہوگی۔ سنتے ہیں کچھ قرض ہو گیا تھا۔ کوئی کہتا ہے سرکاری رقم کھا گئے تھے۔

جالپا۔ جس نے آپ سے یہ کہا۔ اس نے سراسر جھوٹ کہا۔

دینديال۔ تو پھر چلے کیوں گئے۔

جالپا۔ یہ میں بالکل نہیں جانتی۔ مجھے خود تعجب ہوتا ہے۔

دینديال۔ منشی دیانا تھ سے تو کھٹ پٹ نہیں ہو گئی۔

جالپا۔ لالہ جی کے سامنے تو وہ سر تک نہیں اٹھاتے تھے۔ پان تک نہیں کھاتے تھے۔ کھٹ پٹ کیا ہوگی۔ انہیں گھومنے کا شوق تھا۔ سوچا ہوگا یوں تو کوئی جانے نہ دے گا چلو بھاگ چلیں۔

دینديال۔ شاید ایسا ہی ہو۔ کچھ لوگوں کو دیش بدیش پھرنے ہی کی سنک ہوتی ہے۔ تمہیں یہاں جو تکلیف ہو صاف صاف کہہ دو۔ خرچ کے لئے کچھ بھیجا کروں۔

جالپا نے تمکنت سے کہا۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ دادا جی آپ کی دعا سے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔

دیا ناتھ اور جاگیشوری نے جالپا کو سمجھایا مگر وہ جانے پر راضی نہ ہوئی۔ تب دیا ناتھ جھنجلا کر بولے۔ یہاں دن بھر پڑے پڑے رونے سے تو اچھا ہے۔

جالپا۔ کیا وہ کوئی دوسری دنیا ہے۔ یا وہاں جا کر میں کچھ اور ہو جاؤں گی۔ جب ہنسنا تھا تب ہنستی تھی۔ جب رونا ہے تو روؤں گی۔ رما کالے کوسوں چلے گئے ہوں لیکن مجھے ہر دم بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ان کا جسم نہیں ہے لیکن گھر کی ایک ایک چیز میں وہ بسے ہوئے ہیں۔ وہاں یہ تسکین بھی نہ رہے گی۔

دینڈیال سمجھ گئے یہ غرور کی پتلی اپنی ضد نہ چھوڑے گی۔ اُٹھ کر باہر چلے آئے۔ شام کو چلتے وقت انہوں نے پچاس روپے کا ایک نوٹ جالپا کی طرف بڑھا کر کہا۔ اسے رکھ لو شاید کوئی ضرورت پڑے۔

جالپا نے سر ہلا کر کہا۔ مجھے اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ دادا ہاں آپ کی دعا چاہتی ہوں ممکن ہے آپ کی دعا سے میری مراد بر آئے۔

دینڈیال کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ نوٹ چارپائی پر رکھ کر باہر چلے آئے۔

کوار کا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ ابر کے خنک ٹکڑے کبھی کبھی آسمان پر دوڑتے نظر آجاتے تھے۔ جالپا چھت پر لیٹی ہوئی ان آسمانی وجودوں کی خوش فعلیاں دیکھا کرتی تھی۔ وہ طرح طرح کے رنگ بدلتے۔ بھانت بھانت کے روپ بھرتے کبھی محبت سے باہم بغلگیر ہو جاتے۔ کبھی روٹھ کر منہ پھیر لیتے۔ ان بادلوں کے ٹکڑے میں بھی اسے رما ناتھ ہی کی تصویر پھرتی نظر آتی۔

مصیبت میں ہماری نگاہیں خود شناسی کی جانب مائل ہو جاتی ہیں۔ جالپا کو اب بھی گمان ہوتا تھا کہ ایشور نے اسے اس کی خطاؤں کی سزا دی ہے۔ آخر رما ناتھ دوسرے

کا گلا دبا کر ہی تو روپے لاتے تھے۔ وہ روپے دیکھ کر وہ کتنی خوش ہوتی تھی۔ انہیں روپوں سے تو ہمیشہ آرائش و نمائش کی چیزیں آتی رہتی تھیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اب اس کا جی جلتا تھا۔ انہیں کے لئے تو رمانا تھ کو گھر سے بھاگنا پڑا۔ یہ چیزیں اب اس کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح چبھتی تھیں۔

آخر اس نے ایک دن ان سب چیزوں کو جمع کیا۔ مخملی سلیپر، ریشمی موزے طرح طرح کی بیلیں، فیتے، پن۔ کنگھیاں، آئینہ، کوئی کہاں تک گنائے اچھا خاصہ ایک انبار ہو گیا۔ اس نے ان چیزوں کو گنگا میں ڈبو دینے کا ارادہ کیا۔ اب سے اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوگا۔ انہیں تکلفات کے پیچھے آج اس کی یہ درگت ہو رہی ہے۔ آج وہ اس طلسم کو توڑ ڈالے گی۔ ان میں کتنی ہی چیزیں تو اتنی ہی خوبصورت تھیں کہ ان کو پھینکتے ہوئے قلق ہوتا تھا۔ آدھی رات تک وہ ان چیزوں کو اٹھا اٹھا کر رکھتی تھی۔ گویا کسی سفر کی تیاری کر رہی ہے۔ ہاں یہ فی الواقعہ سفر ہی تھا۔ نمائش سے حقیقت کا باطل سے حق کا دل میں سوچ رہی تھی اب اگر ایشور کے فضل و کرم سے وہ پھر لوٹ کر گھر آئے تو وہ نہایت سادہ، بے تکلف زندگی بسر کرے گی۔ حرام کی ایک کوڑی بھی گھر نہ آنے دے گی۔

جیوں ہی رات کے چار بجے سڑک پر لوگوں کے آنے جانے کی آہٹ ملنے لگی، جالپا نے بقچہ اٹھایا اور اشنان کرنے چلی۔ بقچہ بہت وزنی تھا۔ اسے ہاتھ میں لٹکا کر دس قدم چلنا بھی مشکل ہو گیا۔ بار بار ہاتھ بدلتی تھی۔ یہ خوف ہو رہا تھا کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ بوجھ لے کر چلنے کی اسے کبھی نوبت نہ آئی تھی۔ آخر جب ہاتھ شل ہو گئے تو اپنے بقچے کو پیٹھ پر رکھ لیا اور قدم بڑھا کر چلنے لگی۔ لمبا گھونگٹ نکال لیا تھا کہ کوئی پہچان نہ سکے۔

وہ گھاٹ کے قریب پہنچی، تو روشنی پھیل چکی تھی۔ یکایک اس نے رتن کو اپنی

موٹر پر آتے دیکھا۔ اس نے چاہا کہ سر جھکا کر کترا کر نکل جائے لیکن رتن نے دور ہی سے پہچان لیا۔ اور موٹر روک کر بولی۔ کہاں جا رہی ہو بہن۔ یہ بیٹھ پر لقچہ کیسا ہے۔

جالپا نے بے نقاب ہو کر کہا۔ ذرا گنگا اشنان کرنے جا رہی ہوں۔

رتن۔ میں تو اشنان کر کے لوٹ آئی۔ لیکن چلو تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ تمہیں گھر پہنچا دوں گی۔ لاؤ یہ لقچہ رکھ دو۔

جالپا۔ یہ کچھ بھاری نہیں ہے۔ تم جاؤ تمہیں دیر ہو گی۔ میں چلی جاؤں گی۔

مگر رتن نے نہ مانا۔ کار سے اتر کر اس کے ہاتھ سے بقچی لے ہی لی اور گاڑی میں رکھتی ہوئی بولی۔ یہ تو بڑا بھاری ہے۔ کیا بھرا ہے تم نے اس میں؟ کھول کر دیکھوں؟

جالپا۔ اس میں تمہارے دیکھنے کے لائق کوئی چیز نہیں ہے۔

رتن نے بقچی کو کھول کر دیکھا تو حیرت میں آ کر بولی۔ ان چیزوں کو کہاں لئے جاتی ہو؟

جالپا نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ انہیں گنگا میں ڈبا دوں گی۔

رتن نے اور بھی متعجب ہو کر کہا۔ گنگا میں! کچھ پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ چلو گھر چلیں، ان چیزوں کو رکھ کر پھر لوٹ آنا۔

جالپا نے قطعی طور پر کہا۔ نہیں رتن میں ان چیزوں کو ڈبا کر ہی جاؤں گی۔

رتن۔ آخر کیوں؟

جالپا۔ پہلے کار کو بڑھاؤ۔ پھر بتاؤں۔

رتن۔ نہیں پہلے بتا دو۔

جالپا۔ نہیں یہ غیر ممکن ہے۔ پہلے کار کو بڑھاؤ۔

رتن نے مجبور ہو کر کار بڑھائی اور بولی۔ اچھا اب تو بتاؤ۔

جالپا نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا۔ اتنی بات تو تمہیں پہلے ہی سمجھ لینی چاہیئے تھی۔ اب یہ چیزیں میرے کس کام کی ہیں۔ انہیں دیکھ کر خواہ مخواہ جلن ہوتی ہے۔ جب دیکھنے

والا ہی نہ رہا تو انہیں رکھ کر کیا کروں گی۔

رتن نے ایک لمبی سانس کھینچی اور بولی۔ تم بالوجی کے ساتھ بڑی بے انصافی کر رہی ہو۔ بہن! ان چیزوں کو وہ کتنی اُمنگوں سے لائے ہونگے۔ تمہارے جسم پر ان کی زیبائش دیکھ کر وہ کتنے خوش ہونگے۔ ایک ایک چیز ان کی محبت کی یادگار ہے۔ انہیں گنگا میں ڈبا دو گی۔

جالپا اب فکر میں ڈوب گئی۔ دل میں لیس و پیش ہونے لگا۔ مگر ایک لمحہ میں اس نے فیصلہ کر لیا۔ بولی۔ جب تک یہ چیزیں میری آنکھوں سے دُور نہ ہو جائیں گی میری طبیعت کو سکون نہ ہوگا۔ انہیں تکلفات نے میری یہ درگت کی ہے۔ یہ محبت کی نشانیاں نہیں۔ میری مصیبت کی گٹھڑی ہے۔ محبت کا نقش تو میرے دل پر ہے۔

رتن۔ تمہارا دل بڑا سخت ہے جالپا! میں تو شاید ایسا نہ کر سکتی۔

جالپا۔ ایشور نہ کرے کہ تمہیں ایسا موقعہ آئے۔ سچ پوچھو تو انہوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ جو آدمی اپنی بیوی سے پردہ رکھتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ میں بالوجی کی جگہ ہوتی تو یوں ناتا توڑ کر کبھی نہ بھاگتی۔ اپنے دل کا سہارا درد دُکھ سناتی۔ اور جو کچھ کرتی ان کے مشورے سے کرتی۔ عورت اور مرد میں پردہ کیسا۔

رتن نے مسکرا کر کہا۔ ایسے مرد تو بہت کم ہونگے جو عورت سے اپنا دل کھولتے ہوں جب تم خود دل میں چور رکھتی ہو تو ان سے کیوں اُمید رکھتی ہو کہ وہ تم سے پردہ رکھیں۔ تم ایمان سے کہہ سکتی ہو کہ تم نے ان سے کوئی بات نہیں چھپائی۔

جالپا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ میں نے تو اپنے دل میں کبھی چور نہیں رکھا۔

رتن نے زور دے کر کہا۔ جھوٹ بولتی ہو۔ بالکل جھوٹ اگر تم نے ان پر اعتبار کیا ہوتا تو وہ بھی ضرور کھلتے۔

جالپا اس الزام کو اپنے سر سے نہ ٹال سکی۔ اسے آج معلوم ہوا کہ پردہ داری کا آغاز پہلے اسی کی جانب سے ہوا تھا۔

گنگا کا کنارا آ پہنچا۔ موٹر کار رک گئی۔ جالپا اتری اور بقچی کو اٹھانے لگی مگر رتن نے اس کا ہاتھ ہٹا کر کہا۔ نہیں میں اسے نہ لے جانے دوں گی۔ سمجھ لو ڈوب گئے۔ مجھ پر اتنا رحم کرو بہن سمجھ کر۔

جالپا۔ بہن کے ناتے تمہارے پیر دھو سکتی ہوں۔ مگر ان کانٹوں کو دل میں نہیں رکھ سکتی۔

رتن نے بھویں سکوڑ کر کہا۔ کسی طرح نہ مانو گی۔

جالپا۔ نہ۔

رتن نے بے اعتنائی سے منہ پھیر لیا۔ جالپا نے بقچی اٹھائی اور تیزی سے نیچے اتر کر اسے پانی میں پھینک دیا۔ اپنے نفس پر فتح پا کر اس کا چہرہ منور ہو گیا۔ آج اسے جتنا غرور اور جتنی مسرت ہوئی اتنی ان چیزوں کو پا کر کبھی نہ ہوئی تھی۔ ان صدہا آدمیوں میں جو اس وقت اشنان و دیان کر رہے ہیں شاید کسی کو بھی اپنے باطن میں نورانیت کا ایسا احساس نہ ہوا ہو گا۔ گویا صبح کو سنہری شعاعیں اس کے جسم کے ایک ایک ذرہ میں ناچ رہی ہوں۔

جب وہ اشنان کر کے اوپر آئی تو رتن نے پوچھا ڈبا دیا۔

جالپا۔ ہاں اور کیا کرتی۔

رتن بڑی سنگدل ہو۔

جالپا۔ یہی سنگدلی پر فتح پاتی ہے۔ اگر کچھ دن پہلے سنگ دل ہو جاتی تو آج یہ دن کیوں آتا۔

موٹر کار چل پڑی۔

(۲۵)

رمانا تھ کو کلکتے آئے ہوئے دو ماہ سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ ابھی تک دیبی دین

کے گھر پر پڑا ہوا ہے۔ اُسے ہمیشہ یہی دھن سوار رہتی ہے کہ روپوں کا خزانہ کیسے ہاتھ آجائے طرح طرح کے منصوبے باندھتا ہے۔ طرح طرح کی تدبیریں سوچتا ہے لیکن گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ ہاں جب خوب اندھیرا ہو جاتا ہے تو وہ ایک بار محلہ کے کتب خانہ میں ضرور جاتا ہے۔ اپنے شہر اور صوبے کی خبروں کے لئے اس کی طبیعت بے قرار رہتی ہے۔ اس نے وہ نوٹس دیکھا جو دیا ناتھ نے اخباروں میں چھپوایا تھا۔ لیکن اسے اس پر اعتبار نہ آیا۔ کون جانے پولیس نے اُسے گرفتار کرنے کے لئے یہ جال پھیلایا ہو۔ روپے کس نے چکائے ہونگے غیر ممکن۔

ایک دن اسی اخبار میں رما ناتھ کو جالپا کا ایک خط چھپا ہوا ملا۔ جالپا نے دردناک اور عاجزانہ الفاظ میں اس سے گھر لوٹ آنے کی التجا کی تھی۔ اس نے لکھا تھا تمہارے ذمہ کسی کی رقم نہیں آتی۔ تم کسی طرح کا اندیشہ مت کرو۔ میں نے پائی پائی بیباق کر دی ہے رما کا دل للچا اٹھا۔ لیکن معاً خیال آیا یہ بھی پولیس کی شرارت ہوگی۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ جالپا ہی نے یہ خط لکھا۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ روپے گھر والوں نے ادا کر دیئے ہونگے تو کیا اس حالت میں بھی وہ گھر جا سکتا ہے۔ سارے شہر میں اس کی بدنامی ہو رہی ہوگی۔ پولیس میں اطلاع ہو چکی ہوگی۔ اسے منہ دکھانا مشکل ہو جائے گا۔ اس نے طے کیا میں نہیں جا سکتا۔ جب تک کم سے کم پانچ ہزار روپے ہاتھ نہ آجائیں گے۔ وہ گھر جانے کا نام نہ لے گا۔ اور اگر اب تک روپے ادا نہ ہوئے اور پولیس اس کی تلاش میں ہے تو وہ کبھی نہیں گھر جا سکتا۔

دیبی دین کے گھر میں دو کوٹھریاں تھیں اور سامنے ایک برآمدہ تھا۔ برآمدہ میں دکان تھی ایک کوٹھری میں کھانا پکتا تھا۔ دوسری کوٹھری میں برتن بھانڈے رکھے ہوئے تھے اوپر ایک کوٹھری تھی اور چھوٹی سی کھلی ہوئی چھت۔ رما اسی بالاخانہ پر رہتا تھا۔ دیبی دین اور اس کی بڑھیا کے رہنے اور بیٹھنے اور سونے کا خاص مقام نہ تھا۔ رات کو دکان

بڑھ جانے کے بعد وہی برآمدہ خواب گاہ کا کام دیتا تھا۔ دونوں وہیں پڑے رہتے تھے۔ دیبی د کا کام چلم پینا اور سارے دن گپیں مارنا تھا۔ دوکان کا سارا کام بڑھیا کرتی تھی۔ منڈی جا کر اسٹیشن سے مال بھیجنا یا لانا یہ بار بھی اسی کے سر تھا۔ دیبی دین گاہکوں کو پہچانتا تک نہ تھا بیٹھا بیٹھا رامائن طوطا مینا، راس لیلا یا ماتا مریم کی کہانی پڑھا کرتا تھا۔ جب سے رما آگیا بڈھے کو انگریزی پڑھنے کا شوق چرایا ہے۔ سویرے ہی پرنام کرکے آ بیٹھتا ہے اور نو دس بجے تک حروف پڑھتا رہتا ہے۔ بیچ بیچ میں لطیفے بھی سناتا جاتا ہے جن کا ان کے پا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ مگر جگو بڑھیا کو رما کا آسن جمانا اچھا نہیں لگتا۔ وہ اسے اپنا منیم تو بنائے ہوئے ہے۔ حساب کتاب اسی سے لکھواتی ہے۔ لیکن اتنے ذرا سے کام کے لئے وہ اتنا بڑا بھار نہیں اٹھانا چاہتی۔ یہ کام تو وہ گاہکوں سے یونہی کرا لیا کرتی تھی۔ اس لئے رما کا رہنا اسے کھلتا تھا۔ لیکن رما اتنا منکسر مزاج اتنا خلیق اور اتنا فرمانبرد ہے کہ وہ علانیہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ہاں دوسروں پر رکھ کر اشارہ کرنا۔ اُسے سُنا سُنا دل کا بخار نکالتی رہتی ہے۔ رما نے اپنے کو برہمن کہہ رکھا ہے اور مذہبیت کا سوانگ رچے ہوئے ہے۔ برہمن اور دھرماتما بن کر وہ ان دونوں کا مخدوم بن سکتا ہے۔ بڑھیا کے مزاج سے وہ واقف ہے لیکن کرے کیا۔ بے حیائی کرنے پر مجبور ہے حالات نے اس کی خود داری کا خاتمہ کر دیا ہے۔

ایک دن رما ناتھ کتب خانہ میں بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا اسے رتن نظر پڑی رتن کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی کی تلاش کر رہی ہے۔ رما کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رتن کی نگاہ اس پر پڑ جائے۔ یہ یہاں نہ جانے کیسے آ پہنچی۔ وہ رتن کی آنکھ بچا کر سر کو جھکا کر کمرے سے نکل گیا۔ اور پیچھے کے اندھیرے برآمدے میں جہاں پرانے ٹوٹے پھوٹے صندوق اور کرسیاں پڑی تھیں چھپا کھڑا رہا۔ رتن سے ملنے اور گھر کے حالات پوچھنے کے لئے اس کا دل تڑپ رہا تھا لیکن مارے

رم کے سامنے نہ آسکتا تھا۔ اس سے پوچھنے کی کتنی ہی باتیں تھیں رخاص کر وہ یہ جاننا چاہتا تھا
ماکہ اس کی نسبت جالپا کے کیا خیالات ہیں۔ اس سے ناراض تو نہیں ہے۔ اُسے مکار
ور دغا باز تو نہیں سمجھتی۔ روتی تو نہیں ہے۔ دبلی تو نہیں ہو گئی ہے۔ محلہ کے اور لوگوں
ے کیا خیالات ہیں۔ کیا گھر کی تلاشی ہوئی ہے مقدمہ چلا۔ ایسی ہی ہزاروں باتیں
اس کے ذہن میں تھیں۔ مگر منہ کیسے دکھائے۔ وہ جھانک جھانک کر دیکھتا رہا جب
موٹر چلی گئی تب اس کے دل کو سکون ہوا۔ اس دن سے ایک ہفتہ تک وہ کتب خانہ
نہ گیا گھر سے نکلا تک نہیں۔

کبھی پڑے پڑے رما ناتھ کا جی ایسا گھبراتا تھا کہ تھانہ میں جا کر ساری روئداد
کہہ سنائے جو کچھ ہونا ہے ہو جائے۔ دو چار سال کی قید اس دائمی حبس سے تو اچھی ہے
پھر وہ از سر نو زندگی شروع کرے گا۔ اس کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگا لیکن
ایک ہی لمحے میں ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔

اس طرح دو مہینے اور گذر گئے۔ پوس کا مہینہ آپہنچا۔ رما کے پاس جاڑوں کا کوئی
کپڑا نہ تھا۔ گھر سے تو کوئی چیز لایا ہی نہ تھا۔ یہاں بھی کوئی چیز نہ بنوا سکا۔ اب تک تو اس
نے دھوتی اوڑھ کر کسی طرح راتیں کاٹیں۔ مگر پوس کے کڑکڑاتے جاڑے لحاف یا کمبل
کے بغیر کیسے کٹے۔ وہ بیچارا رات بھر گٹھری بنا رہتا۔ جب بہت سردی لگتی تو بچھاون اوڑھ
لیتا۔ دیبی دین نے اُسے ایک پرانی دری بچھانے کو دیدی تھی۔ اس کے گھر میں شاید یہی
سب سے اچھا بستر تھا۔ اس طبقہ کے آدمی چاہے دس ہزار کے گہنے پہن لیں۔ شادی بیاہ
میں دس ہزار خرچ کر دیں۔ لیکن بچھاون گودڑ ہی رکھیں گے۔ اس سڑی ہوئی دری سے
جاڑا بھلا کیا جاتا۔ مگر کچھ نہ ہونے سے اچھا ہی تھا۔ رما مارے شرم کے دیبی دین سے کچھ
کہہ نہ سکتا تھا اور دیبی دین بھی شاید اتنا صرف کثیر نہ برداشت کرنا چاہتا تھا۔ یا ممکن ہے
اس کے ذہن میں یہ ضرورت آئی ہی نہ ہو۔ جب دن ڈھلنے لگتا تو رما رات کی تکلیف

کا خیال کر کے نیم جان ہو جاتا تھا۔ گویا کالی بلا دوڑی چلی آتی ہو۔ رات کو بار بار کھڑکی کھول کر دیکھتا کہ سویرا ہونے میں کتنی دیر ہے۔

ایک دن شام کو وہ کتب خانہ جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا ایک بڑی کوٹھی کے سامنے ہزاروں کنگلے جمع ہیں۔ مجمع کے اندر گھس کر دیکھا تو معلوم ہوا کوئی سیٹھ جی کمبلوں کا دان کر رہے ہیں۔ کمبل بہت گھٹیا تھے پتلے اور ہلکے مگر خلقت ایک پر ایک ٹوٹی پڑتی تھی۔ رما کے جی میں آیا کہ ایک کمبل لے لوں یہاں مجھے کون جانتا ہے۔ اگر کوئی پہچان بھی لے تو کیا حرج اگر غریب برہمن خیرات کا مستحق نہیں تو اور کون ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک ہی لمحہ میں اس کی غیرت بیدار ہو اٹھی۔ کچھ دیر وہاں کھڑا تاکتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔ اس کے ماتھے پر تلک دیکھ کر منیم نے سمجھ لیا یہ برہمن ہے اتنے سارے کنگلوں میں خال خال ہی برہمن تھے برہمنوں کو خیرات دینے کا ثواب کچھ اور ہی ہے۔ منیم دل میں خوش تھا کہ ایک برہمن دیوتا دکھائی تو دیئے۔ اس لئے جب اس نے رما کو جاتے دیکھا تو بولا۔ پنڈت جی کہاں چلے گئے کمبل تو لیتے جائیے۔

رما پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ مجھے ضرورت نہیں — یہ کہہ کر پھر وہ بڑھا۔ منیم جی نے سمجھا شاید کمبل گھٹیا دیکھ کر دیوتا جی روٹھے جا رہے ہیں ایسے غیرت مند دیوتا اسے اپنی زندگی میں شاید کبھی ملے ہی نہ تھے۔ کوئی دوسرا برہمن ہوتا تو دو چار چکنی چپڑی باتیں کرتا اور کوئی اچھا سا کمبل مانگتا۔ یہ پنڈت جی بغیر کچھ کہے سنے استغنا کی شان سے چلے جا رہے ہیں تو ضرور کوئی مہاتما ہونگے۔ اس نے لپک کر رما کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔

آئیے تو مہاراج آپ کے لئے چوکھا کمبل رکھا ہے۔ یہ تو کنگلوں کے لئے ہے۔ رما نے دیکھا کہ بغیر مانگے ایک چیز مل رہی ہے بلکہ زبردستی گلے لگائی جا رہی ہے تو وہ دو چار بار نہیں نہیں کر کے منیم کے ساتھ اندر چلا گیا۔ منیم نے اسے کوٹھی میں لے جا کر تخت

پر بٹھا دیا اور ایک بھاری دبیز کمبل ان کی نذر کیا۔ رما کی بے نیازی کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے پانچ روپے دکھشنا کے دینا چاہا۔ مگر رما نے اُسے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ کمبل لے کر ہی اسکا خاندانی غرور مجروح ہو چکا تھا۔ دکھشنا کے لئے ہاتھ پھیلانا اس کے لئے غیر ممکن ہو گیا۔

منیم نے حیرت سے کہا۔ آپ دکھشنا نہ لیں گے تو سیٹھ جی کو بڑا رنج ہوگا۔

رما نے خود داری انداز سے کہا۔ آپ کی ضد سے میں نے کمبل لے لیا۔ لیکن دکھشنا نہیں لے سکتا۔ مجھے روپے کی ضرورت نہیں۔ جس بابو جی کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں وہ مجھے بھوجن دیتے ہیں اور مجھے لے کر کیا کرنا ہے۔

منیم۔ سیٹھ جی مانیں گے نہیں۔

رما۔ آپ میری طرف سے کہہ دیجئے گا۔

منیم۔ آپ کے تیاگ کا دھنیہ ہے۔ ایسے ہی برہمنوں سے دھرم کی مریادا بنی ہوئی ہے کچھ دیا اور بیٹھئے سیٹھ جی آتے ہی ہونگے۔ آپ کے درشنوں سے بہت پرسن ہونگے۔ برہمنوں کے پرم بھگت ہیں۔ ترکال سندھیا کرتے ہیں۔ مہاراج تین بجے رات کو گنگا تٹ پر پہنچ جاتے ہیں اور وہاں سے آکر پوجن پر بیٹھ جاتے ہیں۔ دس بجے بھگوان کا بھوگ لگاتے ہیں۔ دوپہر کو بھوجن پاتے ہیں۔ پھر چار بجے سندھیا کرنے چلے جاتے ہیں۔ آپ کا استھان کہاں ہے۔

رما نے پریاگ نہ بتلا کر کاشی بتلایا۔ اس پر منیم جی کا اصرار اور بھی بڑھا لیکن رما کو یہ خوف ہو رہا تھا کہ کہیں سیٹھ جی نے کوئی مذہبی بحث چھیڑ دی تو ساری قلعی کھل جائے گی۔ کسی دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے گلا چھڑایا۔

نو بجے وہ کتب خانے سے لوٹا تو ڈر رہا تھا کہ کہیں دیبی دین نے پوچھا کہ کمبل کہاں سے ملا تو کیا جواب دونگا۔ کوئی بہانہ ضروری تھا اس نے سوچا کہدونگا

ایک پہچان والے کی دکان سے ادھار لایا ہوں۔

دیی دین نے کمبل دیکھتے ہی پوچھا۔ سیٹھ کرورڑی مل کے یہاں پہنچ گئے کیا مہاراج!

رمانے پوچھا کون سیٹھ کروڑی مل۔

دیی۔ ارے وہی جس کی لال کوٹھی ہے۔

رما کوئی بہانہ نہ کر سکا۔ بولا۔ ہاں منیم جی نے گلے لگا دیا۔ سیٹھ جی بڑے دھرماتما آدمی ہیں۔

دیی دین نے مسکرا کر کہا، بڑے دھرماتما ہیں، انہیں کے تھامے تو دھرتی تھمی ہوئی ہے نہیں اب تک مٹ گئی ہوتی۔

رما۔ کام تو دھرماتماؤں کا کرتے ہیں۔ من کا حال ایشور جانے جو سارے دن پوجا پاٹ میں لگا رہے اسے دھرماتما نہیں تو اور کیا کہا جائے۔

دیی۔ اسے پاپی کہنا چاہیئے، مہا پاپی۔ دیا تو کسی کے پیچھے پھٹکنے بھی نہیں پاتی مظلوموں کے ساتھ جتنی کرطائی اس کے مل میں ہوتی ہے اور کہیں نہیں ہوتی۔ آدمیوں کو ہنٹروں سے پٹواتا ہے ہنٹروں سے۔ چربی ملا گھی بیچکر اس نے لاکھوں کمائے۔ کوئی نوکر ایک منٹ کی بھی دیر کرے تو اس کی مجوری کاٹ لیتا ہے۔ اگر سال میں دو چار ہزار دان نہ کرے تو پاپ کا دھن پچے کیسے۔ میں نے تو جتنے پجاری دیکھے سب کو پتھر ہی پایا۔ پتھر پوجتے پوجتے ان کے دل بھی پتھر ہو جاتے ہیں۔ آدمی کچھ نہ کرے من میں دیا بنائے رکھے یہی سو دھرم کا ایک دھرم ہے۔

دن کی رکھی ہوئی روٹیاں کھا کر جب رما کمبل اوڑھ کر لیٹا تو اس کا ضمیر اس پر ملامت کرنے لگا۔ رشوت میں اس نے ہزاروں روپے مارے تھے مگر کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اسے باطنی خلش نہ ہوئی تھی۔ رشوت عقل سے ہوشیاری سے، رعب سے ملتی ہے۔ دان نکمے پست ہمت اور رنگے سیاروں کا سہارا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا میں

اتنا ذلیل ہو گیا ہوں کہ کھانے اور کپڑوں کے لئے مجھے خیرات لینا پڑتا ہے، وہ دیبی دین کے گھر دو مہینے سے پڑا تھا مگر دیبی دین اسے محتاج نہیں مہمان سمجھتا تھا۔ رما کے دل میں ایسا ہیجان ہوا کہ اسی وقت تھانے میں جا کر اپنی سرگذشت کہہ سنا کے۔ یہی تو ہو گا کہ دو تین سال کی سزا ہو جائے گی پھر تو دل میں یہ خلش ہو گی کہیں ڈوب کر مر جائے اس طرح زندہ رہنے سے فائدہ ہی کیا۔ نہ گھر کا ہوں نہ گھاٹ کا۔ دوسروں کی پرورش تو کیا کروں گا اپنے ہی لئے دوسروں کا محتاج ہوں۔ رما نے فیصلہ کیا کل وہ کام کی تلاش میں نکلے گا جو کچھ ہونا ہے ہو۔

(۲۶)

ابھی رما منہ ہاتھ دھو رہا تھا کہ دیبی دین پرا امرُ سے کر آ پہنچا اور بولا۔ بھیا یہ تمہاری انگریزی بڑی بکٹ ہے۔ ایس۔ آئی۔ آر سر ہوتا ہے تو پی۔ آئی۔ ٹی پٹ کیوں ہو جاتا ہے۔ بی۔ یو۔ ٹی بٹ ہوتا ہے۔ تو پی۔ یو۔ ٹی پٹ کیوں ہوتا ہے۔ تمہیں بھی بڑی کٹھن لگتی ہو گی۔

رما نے مسکرا کر کہا۔ پہلے تو کٹھن لگتی تھی مگر اب تو آسان معلوم ہوتی ہے۔

دیبی دین۔ جس دن پرا امرُ ختم ہو گی مہابیر جی کو سوا سیر لڈّو چڑھاؤں گا۔ پرا امرُ کا مطلب ہے پرائی استری مر جائے۔ میں کہتا ہوں ہماری مرے۔ پرائی کے مرنے سے ہمیں کیا سکھ۔ تمہارے بال بچے تو ہیں بھیا۔

رما نے اسی انداز سے کہا۔ گویا ہیں۔ لیکن نہ ہونے کے برابر ہیں۔ رہاں ہیں تو۔

دیبی۔ کوئی چٹھی پتر آئی تھی۔

رما۔ نہ۔

دیبی۔ اور تم نے لکھی۔ ارے تین مہینہ سے کوئی چٹھی ہی نہیں بھیجی۔ گھبراتے نہ ہوں گے لوگ۔

رما۔ جب تک یہاں کوئی صورت نہ پیدا ہو جائے کیا خط لکھوں۔

دیبی۔ ارے بھلے آدمی لکھ دو۔ میں یہاں خیریت سے ہوں۔ گھر سے بھاگ آئے ہو۔ ان لوگوں کو کتنی چنتا ہو رہی ہوگی۔ ماں باپ تو ہیں نا۔

رما۔ ہاں ہیں تو۔

دیبی دین۔ تو بھیّا آج ہی چٹھی ڈال دو۔ میری بات مانو۔

رما نے اب تک اپنی اصلیت کو چھپایا تھا۔ اُسے کئی بار خواہش ہوئی کہ دیبی دین سے سارا حال کہہ دے۔ مگر بات ہونٹوں تک آکر رک جاتی تھی۔ وہ دیبی دین کے منہ سے اس کا فیصلہ سننا چاہتا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کیا صلاح دیتا ہے اس وقت دیبی دین کی ہمدردی نے اسے مغلوب کر دیا بولا۔ میں گھر سے بھاگ آیا ہوں۔

دیبی دین نے موچھوں میں مسکرا کر کہا۔ میں جانتا ہوں۔ گھر والی سے ٹھن گئی ہوگی وہ کہتی ہوگی۔ میں الگ رہوں گی تم کہتے ہوگے میں ماں باپ سے الگ نہ رہوں گا۔ یا گہنوں کے لئے ضد کرتی ہوگی۔ کیوں؟

رما نے شرماتے ہوئے کہا۔ کچھ ایسی ہی بات تھی۔ دادا۔ وہ تو گہنوں کے لئے ضد نہ کرتی تھیں۔ لیکن پا جاتی تھیں تو خوش ہوتی تھیں اور میں محبت کے نشہ میں آگا پیچھا کچھ نہ سوچتا تھا۔

دیبی دین کے منہ سے گویا آپ ہی آپ نکل گیا۔ سرکاری رقم تو نہیں اڑا دی۔

رما کا سینہ دھک سے ہو گیا۔ وہ سرکاری رقم کا معاملہ اس سے چھپانا چاہتا تھا۔ دیبی دین کے اس سوال نے گویا اس کی سوتی ہوئی فوج پر چھاپہ مارا۔ اس کے چہرہ کا رنگ اڑ گیا۔ وہ یکا یک کچھ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کا جواب کیا دوں۔

دینی دین اس کے بستر سے تاڑ گیا کہ اس نے کوئی دل آزار بات کہہ دی، زخم پر مرہم رکھتے ہوئے بولا۔ دل کی لگن بڑی بے ڈھب ہوتی ہے، بھیا تم تو ابھی لڑکے ہو۔ غبن کے ہزاروں مکدمے ہر سال ہوتے ہیں، تحقیقات کی جائے تو ایک ہی بات نکلے گی۔ گہنا۔ دس، بیس وارداتیں تو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ یہ روگ ہی ایسا ہے، عورت منہ سے تو یہی کہتی جاتی ہے کہ یہ کیوں لائے۔ یہ کیوں لائے۔ روپے کہاں سے آئیں گے۔ دل میں پھولی نہیں سماتی۔ یہیں ایک ڈاک بابو رہتے تھے، بیچارے نے چھری سے گلا کاٹ لیا۔ ایک دوسرے میاں صاحب کو جانتا ہوں جن کو پانچ سال کی سزا ہو گئی۔ جیل میں مر گئے۔ ایک تیسرے پنڈت جی کو جانتا ہوں جنہوں نے افیم کھا کر جان دے دی۔ برا روگ ہے دوسروں کو کیا کہوں، میں ہی تین سال کی سزا کاٹ چکا ہوں۔ جوانی کی بات ہے، جب اس بڑھیا پر جوبن تھا، ناگنی تھی تو جیسے کلیجہ پر تیر چلا دیتی تھی، میں ڈاکیہ تھا منی آرڈر تقسیم کیا کرتا تھا۔ یہ کانوں کے جھومک کے لئے جان کھا رہی تھی کہتی تھی سونے ہی کے لوں گی۔ مجھ پر تو نشہ چھایا ہوا تھا اپنی آمدنی کی ڈینگیں مارتا رہتا تھا۔ کبھی پھولوں کی ہار لاتا۔ کبھی مٹھائی، کبھی عطر پھلیل، سہر کا ملک تھا۔ منی آرڈر بہت آتے تھے۔ ایک دن ایک منی آرڈر پر میں نے جھوٹے دستخط کر کے روپے اڑا لئے۔ کل تیس روپے تھے۔ جھومک لا کر دیئے اتنی خوش ہوئی کہ کچھ نہ پوچھو۔ لیکن ایک ہی مہینہ میں چوری پکڑی گئی، تین سال کی سزا ہو گئی۔ سزا کاٹ کر نکلا تو یہاں بھاگ آیا، پھر کبھی گھر نہیں گیا۔ ہاں گھر چٹھی بھیج دی۔ بڑھیا خبر پاتے ہی چلی آئی۔ یہ سب کچھ ہوا مگر گہنوں سے اس کا پیٹ نہیں بھرا، جب دیکھو کچھ نہ کچھ بنتا ہی رہتا ہے۔ ایک ہیچ بنوائی۔ کل اسی کو توڑ کر دوسری ہیچ بنوالی۔ میری تو ایک صلاح ہے۔ گھر ایک چٹھی بھیج دو۔ لیکن نہیں پولیس تمہاری ٹوہ میں ہو گی۔ کہیں سراغ مل گیا تو کام بگڑ جائے گا۔ کہو تو میں کسی سے ایک چٹھی لکھا کر بھیج دوں۔

رما نے سر ہلا کر کہا۔ نہیں دادا غضب ہو جائیگا۔ پولیس سے زیادہ تو مجھے گھر والوں کا خوف ہے۔

دیپ۔ ڈر پولیس کا ہے کہ گھر والوں کا۔ گھر والے سن کر کھُش ہوں گے۔ پولیس والے سجا کرا دیں گے۔

رما۔ میں سزا سے بالکل نہیں ڈرتا۔ تم سے کہا نہیں ایک دن مجھے کتب خانہ میں جان پہچان کی ایک عورت نظر پڑی۔ ہمارے گھر بہت آتی جاتی تھی۔ ایک بڑے وکیل کی بیوی ہے اسے دیکھتے ہی میری نانی مر گئی۔ ایسا سٹ پٹایا کہ اس کی طرف تاکنے کی ہمت نہ پڑی۔ اگر اس وقت اس سے دو چار باتیں کر لیتا تو گھر کی ساری حالت معلوم ہو جاتی۔ اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہ کرتی۔ میرے گھر میں بھی یقین ہے کہ وہ اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہ کرتی۔ میرے گھر میں بھی کسی سے نہ کہتی۔ لیکن میری ہمت نہ پڑی۔

دیپ۔ تو پھر اسی کو کیوں نہیں ایک چٹھی لکھتے۔

رما۔ چٹھی تو مجھ سے نہ لکھی جائے گی۔

دیپ۔ کب تک چھپے بیٹھے رہو گے۔

رما۔ دیکھا چاہیئے۔

دیپ۔ پولیس تو تمہاری ٹوہ میں ہو گی۔

رما۔ یہی تو خوف ہے۔

دیپ دین کو تشویش پیدا ہو گئی۔ رما نے سمجھا شاید پولیس کے خوف نے اسے فکر مند کر رکھا ہے۔ بولا۔ ہاں تم دیکھتے ہو دن کو میں بہت کم گھر سے نکلتا ہوں۔ لیکن میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں گھسیٹنا چاہتا۔ میں تو جاؤنگا ہی۔ تمہیں کیوں الجھن میں ڈالوں۔ سوچتا ہوں کسی ایسے گاؤں میں جا کر رہوں جہاں پولیس کی ہوا تک نہ ہو۔

دیبی دین نے غرور سے سر اٹھا کر کہا۔ میرے بارے میں تم کچھ چنتا نہ کرو بھیا! یہاں پولیس سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ کسی پردیسی کو اپنے گھر ٹھہرانا کوئی جرم نہیں ہے ہمیں کیا معلوم کہ اس کے پیچھے پولیس ہے۔ یہ پولیس کا کام ہے پولیس جانے۔ میں پولیس کا مخبر نہیں۔ گوئندا نہیں۔ جاسوس نہیں۔ ہاں کہیں بڑھیا سے نہ کہہ دینا۔ نہیں اس کے پیٹ میں پانی نہ پچے گا۔

دونوں ایک لمحہ تک خاموش رہے۔ تب دیبی دین بولا۔ کہو تو میں تمہارے گھر چلا جاؤں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ میں ادھر ادھر سے سارا حال پوچھ لوں گا تمہارے باپ سے ملوں گا۔ تمہاری ماں کو سمجھاؤں گا۔ تمہاری گھر والی سے بات چیت کروں گا پھر جیسا مناسب سمجھنا کرنا۔

رما نے اندر خوش ہو کر کہا۔ لیکن کیسے پوچھو گے دادا۔ لوگ کہیں گے تمہیں ان باتوں سے کیا مطلب؟

دیبی دین نے قہقہہ مار کر کہا۔ بھیا اس سے سہل تو اور کوئی کام ہی نہیں۔ ایک جنیو گلے میں ڈال لا۔ اور برہمن بن گئے پھر جا ہے ہاتھ دیکھو جا ہے کنڈلی بانچو جا ہے شگون بچارو۔ سب کچھ کر سکتے ہو۔ تمہاری ماں بھیک لے کر آئے گی اسے دیکھتے ہی کہوں گا۔ ماتا تیرے پتر کو پردیس میں بڑا کشٹ ہے۔ اتنا سنتے ہی گھر بھر کے لوگ آجائیں گے۔ تمہاری گھر والی بھی آئے گی۔ اس کا ہاتھ دیکھونگا۔ میں ان باتوں میں پکا ہوں کچھ کما لاؤں گا دیکھ لینا۔

رما اس خیال کے مزے لینے لگا۔ جالپا اس وقت رتن کے پاس دوڑی جائے گی دونوں طرح طرح کے سوالات کریں گی۔ کیوں بابا وہ کہاں گئے ہیں۔ اچھی طرح ہیں نا؟ کب تک آئیں گے؟ کبھی بال بچوں کی بھی سدھ آتی ہے کہ نہیں۔ وہاں کسی حسینہ کے جال میں تو نہیں پھنس گئے۔

دیبی دین بولا۔ تو صلاح ہے؟

رمانے اس کا دل ٹٹولنے کے ارادہ سے کہا۔ کہاں جاؤ گے دادا! تکلیف ہوگی

دیبی۔ رماگھر کا اشنان بھی تو کروں گا۔ میں تو کہتا ہوں تم بھی چلو۔ کسی دھرم شالہ میں ٹھہر جائیں گے۔ رنگ ڈھنگ دیکھ کر تم سے کہہ دونگا۔ اگر دیکھا کہ کوئی کھٹکا نہیں ہے تو گھر چلے جانا۔ کوئی کھٹکا ہو تو میرے ساتھ ہی لوٹ آنا۔

رمانے ہنس کر کہا۔ کہاں کی بات کرتے ہو دادا۔ اسٹیشن پر اترتے ہی کہیں گرفتار ہو جاؤں تو بس!

دیبی دین نے ذمہ داری کی شان سے کہا۔ گرفتار ہو جانا کیا دل لگی ہے۔ مجھ سے کہو میں تمہیں پراگ کے تھانے میں لے جا کر کھڑا کر دوں۔ اگر کوئی ترچھی آنکھوں سے بھی دیکھ لے تو مونچھیں منڑا لوں۔ ایسی بات ہے بھلا سینکڑوں خونیوں کو جانتا ہوں جو اسی شہر میں رہتے ہیں۔ پولیس کے افسروں کے ساتھ دعوتیں کھاتے ہیں۔ پولیس انہیں جانتی ہے پھر کبھی کچھ نہیں کر سکتی۔ روپیہ بڑی چیز ہے۔

رمانے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کے سامنے ایک نیا مسئلہ آ کھڑا ہوا۔ جن باتوں کو وہ ناتجربہ کاری کے باعث محال سمجھتا تھا انہیں دیبی دین نے بچوں کا کھیل بنا دیا۔ اور بوڑھا شیخی بازوں میں نہیں ہے۔ وہ منہ سے جو کچھ کہتا ہے پورا کر دکھاتا ہے اس نے سوچا کہ میں سچ مچ دیبی دین کے ساتھ گھر چلا جاؤں۔ یہاں کچھ روپے مل جاتے تو سوٹ بنوا لیتا۔ پھر شان سے جاتا۔ وہ اس وقت کا تصور کرنے لگا۔ جب وہ نیا سوٹ پہنے ہوئے گھر پہنچے گا اسے دیکھتے ہی گوپی اور بشمبر دوڑ پڑیں گے۔ بھیا آئے بھیا آئے دادا نکل آئیں گے۔ اماں کو تو پہلے یقین نہ آئے گا مگر جب دادا جا کر کہیں گے ہاں آ گیا۔ تب وہ آنسو بہاتی ہوئی دروازہ کی طرف چلیں گی۔ اسی وقت میں پہنچ کر اماں کے پیروں پر گر پڑے گا۔ جالپا وہاں نہ آ سکے گی۔ روٹھی ہوئی بیٹھی رہے گی۔ رمانے دل میں وہ

باتیں بھی سوچ لیں جو وہ بابا کو منانے کے لئے کہے گا۔ اس وقت شاید روپے کا ذکر ہی نہ آئے، روپیوں کا ذکر کرنے میں سبھی کو تکلف ہوگا۔ اپنے عزیزوں سے جب کوئی خطا ہو جاتی ہے تو ہم اس کے روبرو اس کا ذکر کرکے اسے شرمندہ کرنا نہیں چاہتے اور چاہتے ہیں اس بات کا اسے دھیان ہی نہ آئے۔ اس کے ساتھ اس طرح پیش آتے ہیں کہ اسے ہماری طرف سے ذرا بھی شک نہ ہو۔ وہ بھول کر بھی یہ نہ سمجھے کہ ان کے دل میں میری طرف سے کدورت ہے۔

دینی دین نے پوچھا، کیا سوچ رہے ہو چلو گے؟

رما نے دبی زبان سے کہا، تمہارا اتنا اصرار ہے تو چلونگا۔ مگر پہلے تمہیں میرے گھر جاکر پوری پوری خبر لانی پڑے گی۔ اگر میرا من نہ بھرا تو میں لوٹ آؤنگا۔

دینی دین نے کہا منظور!

رما نے شرم سے آنکھیں نیچی کرکے کہا۔ ایک بات اور ہے مجھے کچھ کپڑوں کی ضرورت پڑے گی۔

دینی دین بن جائیں گے۔

رما، گھر پہنچکر تمہارے روپے دے دونگا۔

دینی۔ اور میں تمہاری گرو دکھشنا بھی وہیں دے دونگا۔

رما، گرو دکھشنا بھی مجھی کو دینی پڑے گی۔ میں نے تمہیں چار حرف انگریزی پڑھادی اس سے تمہارا کیا بھلا ہوا۔ تم نے مجھے جو تجربے سکھائے وہ عمر بھر میرے کام آئیں گے منہ پر بڑائی کرنا خوشامد ہے لیکن دادا ماں باپ کے بعد جتنی محبت مجھے تم سے ہے اتنی اور کسی سے نہیں۔ تم نے ایسے گاڑھے وقت میں میری بانہہ پکڑی جب میں منجدھار میں جا رہا تھا۔ ایشور ہی جانے اب تک میری کیا حالت ہوئی ہوتی۔ کس گھاٹ لگا ہوتا۔

دیبی دین نے تمسخر سے کہا۔ اور جو کہیں تمہارے دادا مجھے گھر میں گھسنے ہی نہ دیں تو
رما۔ دادا تمہاری اتنی خاطر کریں گے کہ تم ادب ہو جاؤ گے رجا لیا تمہاری اتنی خدمت
کرے گی کہ جوان ہو جاؤ گے۔

دیبی دین نے ہنسکر کہا۔ تب تو بڑھیا مارے ڈاہ کے جل مریگی رما نیگی نہیں! نہیں
میرا جی تو چاہتا ہے کہ ہم دونوں یہاں سے اپنا ڈیرا ڈنڈا اٹھا کر چلتے اور وہیں سر کی تا منتے
تم لوگوں کے ساتھ چند گھڑی آرام سے کٹ جاتی۔ لیکن اس جڑیل سے کلکتہ نہ چھوڑا جائیگا
تو بات پکی ہو گئی!

رما۔ ہاں پکی ہی ہے۔

دیبی۔ دکان کھلے تو چلیں کپڑے لادیں، آج ہی سلنے کو دیدیں۔

دیبی دین کے چلے جانے کے بعد رما بڑی دیر تک سنہرے تصوّرات میں بیٹھا رہا۔
جن جذبات کو اس نے کبھی اپنے دل میں قدم نہ رکھنے دیا تھا۔ جن کی گہرائی وسعت او
شدت سے وہ اتنا ہراساں تھا کہ اس میں پھسل کر ڈوب جانے کے خوف سے وہ ا
دل بیقرار کو ادھر بھٹکنے بھی نہ دیتا تھا۔ اسی اتھاہ اور ناپیدا کنار سمندر میں وہ آج پور
لاابالی پن کے ساتھ تیرنے لگا۔ تصوّر نے اسے کشش عطا کر دی تھی، وہ تربینی کی سیر و
الفریڈ کی ہوا خوری وخسرو باغ کے مزے، وہ احباب کی مجلسیں سب یاد آ آ کر ا
دل کو گدگدانے لگے۔ رمیش اسے دیکھتے ہی دوڑ کر گلے لپٹ جائیں گے۔ احباب آ
گے کہاں گئے تھے یار خوب سیر کی۔ رتن اس کی خبر پاتے ہی دوڑی آئے گی اور پوچھے
تم کہاں گئے تھے۔ بابو جی نے تو سارا کلکتہ چھان مارا۔ پھر جالپا کی غمگین صورت سا
آ کھڑی ہوئی۔

یکا یک دیبی دین نے آ کر کہا۔ دس بج گئے چلو بازار ہو تے آئیں۔
رما چلنے کو تیار ہوا۔ لیکن دروازے تک آ کر رک گیا۔

دیی دین نے پوچھا۔ کیوں رک گئے۔

رما۔ تمہیں چلے جاؤ۔ میں جا کر کیا کرونگا۔

دیی۔ کیا ڈر رہے ہو۔

رما۔ ڈر نہیں رہا ہوں، مگر کیا فائدہ؟

دیی۔ میں اکیلا جا کر کیا کرونگا۔ مجھے کیا معلوم تمہیں کونسا کپڑا پسند ہے چلکر اپنی پسند سے لے لو۔

رما۔ جو کپڑا چاہے لے لینا۔ مجھے سب پسند ہے۔

دیی۔ تمہیں ڈر کس بات کا ہے۔ میں کہتا ہوں پولیس تمہاری طرف تاکے گی بھی نہیں

دیی دین نے بہت سمجھایا، تشفی دی مگر رما جانے پر راضی نہ ہوا، وہ سوچتا تھا اگر کسی سپاہی نے پکڑ لیا تو دیی دین کیا کرے گا۔ مانا کہ سپاہی سے اس کی جان پہچان بھی ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ سرکاری معاملہ میں بھی دوستی کا حق نبھائے۔ دیی دین منت خوشامد کر کے رہ جائے گا۔ جا پڑیگی میرے سر۔ کہیں پکڑا جاؤں تو پریاگ کے بدلے جیل جانا پڑے آخر دیی دین لاچار ہو کر اکیلا ہی گیا۔

دیی دین گھنٹے بھر میں لوٹا۔ دیکھا رما چھت پر ٹہل رہا ہے۔ بولا کچھ جانتے ہو کیا بج گئے بارہ کا عمل ہے آج روٹی نہ بنے گی کیا؟ گھر جانے کی خوشی میں کھانا پینا چھوڑ دوگے یہ دیکھو کپڑوں کا نمونہ لایا ہوں۔ ان میں جونسا پسند کرو گے لے لوں۔

رما نے نمونوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا۔ اتنے مہنگے کپڑے کیوں لائے۔

دیی۔ سستے تھے مگر ولایتی تھے۔

رما۔ تم ولایتی کپڑے نہیں پہنتے۔

دیی۔ ادھر بیس سال سے تو نہیں پہنتے۔ ادھر کی بات نہیں کہتا۔ کچھ بیسی دام لگ جاتا ہے مگر روپیہ تو دیس میں رہ جاتا ہے۔

رمانے شرماتے ہوئے کہا، تم اپنے اصول کے بڑے پکے ہو دادا۔

دینا دین کے چہرے پر عجیب رونق آگئی۔ اس کی بجھی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں اکڑ کر بولا جس دیس میں رہتے ہیں جس کا ان جل کھاتے پیتے ہیں اس کے لئے اتنا بھی نہ کریں تو جینے پر لعنت ہے، وہ جوان بیٹے اسی سودیشی کی بھینٹ کر چکا ہوں بھیا۔ اکیلے ایسے پٹھے تھے کہ تم سے کیا کہوں، دونوں بدیشی کپڑوں کی دکان پر تعینات تھے مجال تھی کہ کوئی گاہک دکان پر آجائے۔ ہاتھ جوڑ کر گھگیا کر دھمکا کر شرما کر سب کو پھیر لیتے تھے۔ بجاجوں نے جاکر کمشنر سے فریاد کی۔ سن کر آگ ہو گیا بس فوجی گورے بھیجے کہ ابھی جاکر بجار سے پہرے اٹھا دو۔ گوروں نے دونوں بھائیوں سے کہا یہاں سے چلے جاؤ۔ مگر وہ اپنی جگہ سے جو بھر بھی نہ ہلے۔ بھیڑ لگ گئی گورے ان پر گھوڑے چڑھا لائے تھے مگر دونوں بیوان کی طرح ڈٹے کھڑے تھے۔ جب اس طرح کچھ بس نہ چلا تو سبھوں نے ڈنڈے سے پیٹنا شروع کیا۔ دونوں بہادر ڈنڈے کھاتے تھے پر جگہ سے نہ ہلتے تھے جب بڑا بھائی گر پڑا تو چھوٹا بھائی اس کی جگہ آکر کھڑا ہو گیا۔ اگر دونوں اپنے ڈنڈے سنبھال لیتے تو ان بیسوں کو مار بھگاتے۔ لیکن ہاتھ اٹھانا تو بڑی بات ہے، سر تک نہ اٹھایا۔ آخر چھوٹا بھی وہیں گر پڑا۔ دونوں کو لوگوں نے اٹھا کر ہسپتال بھیجا۔ اسی رات کو دونوں سدھار گئے۔ تمہارے چرن چھو کر کہتا ہوں بھیا اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری چھاتی گج بھر کی ہو گئی ہے، یہی امنگ آتی تھی کہ بھگوان نے اوروں کو پہلے نہ اٹھا لیا ہوتا۔ اس وقت انہیں بھیج دیتا۔ جب جنازہ چلا ہے تو ایک لاکھ آدمی ساتھ تھا۔ بیٹوں کو گنگا کی بھینٹ کر کے میں سیدھا بجاج میں پہونچا اور اسی دکان پر کھڑا ہوا جہاں دونوں بیروں کی لہاس گری تھی۔ گاہک کے نام چڑیے کا پوت تک نہ دکھائی دیا۔ آٹھ دن وہاں سے ہلا تک نہیں۔ نہ بھوک تھی نہ پیاس۔ نویں دن دکانداروں نے قسم کھائی کہ بلایتی کپڑے نہ منگائیں گے تب بجار سے ہٹا۔

تب سے بدیسی دیا سلائی تک گھر میں نہیں لایا۔

رملا نے متاثر ہو کر کہا۔ دادا! تم سچے دیر ہو۔ اور وہ دونوں لڑکے بھی سچے جودھا تھے۔

دیبی دین نے اس انداز سے دیکھا گویا اپنے کو اس تعریف کا مستحق سمجھتا ہے شہیدوں کی شان سے بولا۔ ان بڑے بڑے آدمیوں کے لئے کچھ نہ ہوگا۔ یہ تو رونا جانتے ہیں، بڑے بڑے دیش بھگتوں کو بلائتی سراب کے بغیر چین نہیں آتا۔ ان کے گھر میں جا کر دیکھو تو ایک بھی دیسی چیز نہ ملے گی۔ دکھلانے کو دس بیس کرتے گاڑھے کے بنوا لئے سب کے سب بھوگ بلاس میں اندھے ہو رہے ہیں۔ چھوٹے بھی اور بڑے بھی۔ اس پر دعوے یہ ہے کہ ہم دیس کے لئے مرتے ہیں۔ ارے تم کیا دیس کا اُدھار کرو گے پہلے اپنا اُدھار تو کر لو۔ غریبوں کو لوٹ کر بلایت کا گھر بھرنا تمہارا کام ہے اسی لئے تمہارا اس دیس میں جنم ہوا ہے۔ ہاں روتے جاؤ بلائتی سرابیں اڑاؤ۔ بلائتی موٹریں دوڑاؤ۔ بلائتی مربے اور اچار چکھو، بلائتی برتنوں میں کھاؤ۔ بلائتی دوائیاں پیو۔ بلائتی بھاسا بولو بلائتی ٹھاٹ بناؤ، مگر دیس کے نام کو روتے جاؤ۔ اور اس رونے سے کچھ ہوگا، رونے سے ماں دودھ پلاتی ہے شیر اپنا شکار نہیں چھوڑتا۔ روؤ اس کے سامنے جس میں دیا اور دھرم ہو ایکبار یہاں بڑا بھاری جلسہ ہوا۔ ایک صاحب بہادر کھڑے ہو کر خوب اُچھلے کودے رجب وہ نیچے آ گئے تو میں نے پوچھا، صاحب تم دیس کا کیا سوراج دوگے، تم بھی بڑی طلب لوگے، تم بھی بنگلوں میں رہوگے۔ پہاڑوں کی ہوا کھاؤ گے انگریزی ٹھاٹ بنائے گھومو گے۔ اس سوراج سے دیس کا کلیان ہوگا۔ تمہاری اور تمہارے بھائی بندوں کو بھلے آرام اور ٹھاٹ کئے اور دیس کا تو کوئی بھلا نہ ہوگا تب بغلیں جھانکنے لگے۔ تمہیں ہزاروں کی طلب چاہیئے۔ گریب کسان کو ایک جون سوکھا چبینا بھی نہیں ملتا۔ اسی کا لہو چوس کر تو سرکار تمہیں ہدے دیتی ہے۔

کبھی ان غریبوں کا بھی دھیان آتا ہے۔ ابھی تمہارا راج نہیں ہے تب تو تم اتنا اینٹھتے ہو جب تمہارا راج ہوگا۔ تب تو تم غریبوں کو پیس کر پی جاؤ گے۔

رما مہذب جماعت کی فضیحت نہ سن سکا۔ آخر وہ بھی تو اسی جماعت کا ایک فرد تھا۔ بولا۔ یہ بات تو نہیں ہے دادا کہ پڑھے لکھے آدمی کسانوں کا دھیان نہیں کرتے۔ ان میں سے کتنے ہی کسان تھے یا ہیں۔ انہیں اگر یقین ہو کہ ہمارے تکلیف اٹھانے سے کسانوں کا کوئی فائدہ ہوگا۔ اور جو بچت ہوگی وہ کسانوں کے لئے خرچ کی جائے گی تو وہ خوشی سے تھوڑے مشاہرہ سے کام کریں۔ لیکن وہ دیکھتے ہیں کہ بچت دوسرے ہی ہڑپ کر جاتے ہیں تو وہ سوچتے ہیں کہ جب دوسروں ہی کو کھانا ہے تو ہم کیوں نہ کھائیں۔

دیبی۔ تو سوراج ملنے پر ہجار ہجار دو دو ہجار پانے والے پھر نہیں رہیں گے وکیلوں کی لوٹ نہیں رہے گی۔ پولیس کی لوٹ بند ہو جائے گی۔

رما۔ تب سب کام کثرت رائے سے ہوگا۔ اگر کثرت کہیگی کہ سرکاری ملازموں کی تنخواہ گھٹا دی جائے تو گھٹ جائیگی۔ کسانوں کے فائدے کے لئے کثرت جتنے روپے مانگے گی مل جائیں گے۔ کنجی کثرت رائے کے ہاتھوں میں رہے گی اور ابھی دس پانچ برس چاہے نہ ہو لیکن اس کے بعد کثرت رائے کسانوں اور مزدوروں ہی کی ہوگی۔

دیبی دین نے مسکرا کر کہا۔ بھیا! تم بھی ان باتوں کو سمجھتے ہو۔ میں نے بھی سوچا تھا بھگوان کرے کچھ دن اور جیوں۔ اچھا اب کھانا پکاؤ۔ سانجھ کو چلکر کپڑے درجی کو دیدیں گے۔

جب اندھیرا ہو گیا تو دیبی دین نے آکر کہا۔ چلو کپڑے سلوالیں۔

رما سر پہ ہاتھ رکھے بیٹھا تھا چہرہ غمگین تھا بولا۔ دادا میں گھر نہ جاؤں گا۔

دیبی دین نے تعجب سے پوچھا کیوں کیا بات ہوئی۔ رما کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں بولا۔ کون سا منہ لے کر جاؤں مجھے تو ڈوب مرنا چاہیئے تھا۔

یہ کہتے کہتے یہ کھل کر رو پڑا۔ وہ درد دل جواب تک بے ہوش پڑا ہوا تھا ٹھنڈے پانی کے یہ چھینٹے پا کر ہوش میں آگیا تھا۔ اور اس کی آہیں تیر کی طرح اس کے سارے وجود کو چھیدے ڈالتی تھیں۔ اسی نالہ و زاری کے طرف سے وہ اسے بہلا رہا تھا گویا کوئی غم نصیب ماں اپنے بچہ کو اس لئے جگاتی ڈرتی ہو کہ وہ فوراً کچھ کھانے کو مانگنے لگے گا۔

(۲۷)

کئی دنوں کے بعد کوئی نو بجے رما کتب خانہ سے لوٹ رہا تھا کہ راستہ میں اسے کئی آدمی کسی شطرنج کے نقشہ کا ذکر کرتے ہوئے ملے۔ یہ نقشہ وہاں کے ایک ہندی روزانہ اخبار میں چھپتا تھا اسے حل کرنے کے لئے پچاس روپے انعام کا وعدہ تھا۔ ان آدمیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ نقشہ بہت مشکل ہے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں کے کتنے ہی مشاق شطرنج بازوں نے اسے حل کرنے کی بھرپور کوشش کی، مگر کچھ پیش نہ گئی یکایک رما کو یاد آیا کہ کتب خانہ میں ایک اخبار پر بہت سے آدمی جھکے ہوئے تھے اور نقشہ کو نقل کر رہے تھے اب معلوم ہوا یہ بات تھی۔

رما کی ان میں سے کسی سے بھی جان پہچان نہ تھی، مگر وہ نقشہ دیکھنے کے لئے اتنا بے قرار ہوا کہ اس سے بغیر پوچھے نہ رہا گیا۔ بولا آپ لوگوں میں کسی کے پاس یہ نقشہ ہے

ان جوانوں نے ایک کمبل پوش دہقان کو یہ سوال کرتے سنا تو سمجھے کوئی عطائی ہوگا۔

ایک نے بے اعتنائی سے کہا۔ ہاں ہے تو مگر تم دیکھ کر کیا کرو گے ریہاں آپ جیسے

اچھے غوطے کھا رہے ہیں۔ ایک صاحب نے جو شطرنج میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، اسے حل کرنے کے لئے اپنے پاس سے سَو روپے دینے کا وعدہ کیا ہے۔

دوسرا نوجوان بولا۔ دکھا کیوں نہیں دیتے بھائی۔ کون جانے یہی بے چارے حل کرلیں شاید انہیں کی طبیعت لڑ جائے۔

اس تحریک میں ہمدردی نہیں طنز تھا۔ اس میں یہ خیال چھپا ہوا تھا کہ ہمیں دکھانے میں تو کوئی عذر نہیں ہے، دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرلو۔ مگر تم جیسے اُلو سمجھ ہی نہیں سکتے حل کیا کریں گے۔

ایک دکان میں جا کر انہوں نے رما کو نقشہ دکھایا۔ رما کو فوراً یاد آیا یہ نقشہ کہیں دیکھا ہے۔ سوچنے لگا کہاں؟

ایک نے چٹکی لی۔ آپ نے تو حل کرلیا ہوگا۔

دوسرا بولا۔ اب کیا ہی چاہتے ہیں۔

تیسرا۔ ذرا دو ایک چال ہمیں بتایئے۔

رما نے برانگیختہ ہو کر کہا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں اسے حل ہی کرلونگا۔ مگر ایسا نقشہ میں نے ایک بار حل کیا ہے اور بہت ممکن ہے اسے بھی حل کرلوں۔ ذرا کاغذ پنسل دیجیئے نقل کرلوں۔

اس برجستہ جواب نے رما کا وقار قائم کردیا۔ اسے کاغذ پنسل مل گیا۔ اس نے نقشہ نقل کیا۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور گھر چلا۔

گھر پہنچکر رما نے اس نقشہ پر دماغ لڑانا شروع کیا۔ لیکن مہروں کی چالیں سوچنے کے عوض وہ یہی سوچ رہا تھا کہ یہ نقشہ دیکھا کہاں۔ شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ یاد آتے ہی اسے نقشہ کا حل بھی سوجھ جائیگا۔ دیگر جانداروں کی طرح دماغ بھی بہانہ تلاش کیا کرتا ہے۔ رما آدھی رات تک نقشہ کھولے بیٹھا رہا۔ شطرنج کی جو بڑی بڑی معرکے کی

بازیاں کھیلی تھیں وہ سارے نقشے اسے یاد تھے، مگر یہ نقشہ کہاں دیکھا۔

دفعتہً اس کی آنکھوں کے سامنے بجلی کوند گئی۔ رما راجہ صاحب نے یہ نقشہ دیا تھا۔ لگاتار تین دن دماغ لڑانے کے بعد اس نے اسے حل کیا تھا۔ پھر تو اسے ایک ایک چال یاد آ گئی۔ ایک ہی لمحہ میں نقشہ حل ہو گیا۔ اس نے مسرت کے نشے میں زمین پر دو تین قلابازیاں کھائیں۔ مونچھوں پر تاؤ دیا آئینہ میں منہ دیکھا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

دیبی دین ابھی آگ سلگا رہا تھا کہ رما خوش خوش آ کر بولا۔ دادا جانتے ہو صداقت اخبار کا دفتر کہاں ہے۔

دیبی۔ جانتا کیوں نہیں ہوں۔ یہاں کون اخبار ہے جس کا پتہ مجھے معلوم نہ ہو۔ صداقت کا ایڈیٹر ایک رنگیلا آدمی ہے جو ہر دم منہ میں پان بھرے رہتا ہے۔ مگر ہے ہمت کا دھنی۔ دو بار جیل ہو آیا ہے۔

رما۔ آج ذرا وہاں تک جاؤ گے۔

دیبی دین نے عذر کیا۔ مجھے بھیجکر کیا کرو گے؟

رما۔ کیا بہت دور ہے۔

دیبی۔ نہیں دور تو نہیں ہے۔

رما۔ پھر بات کیا ہے؟

دیبی دین نے خطا وارانہ انداز سے کہا۔ بات کچھ نہیں ہے۔ بڑھیا بگڑتی ہے اسے بچن دے چکا ہوں کہ سودیشی بدیشی کے جھگڑے میں نہ پڑوں گا۔ نہ کسی اخبار کے دفتر میں جاؤں گا۔ اس کا دیا کھاتا ہوں تو اس کا حکم بھی تو بجانا پڑے گا۔

رما نے مسکرا کر کہا۔ دادا تم دل لگی کرتے ہو۔ میرا ایک بڑا ضروری کام ہے اس اخبار میں شطرنج کا ایک نقشہ چھپا ہے۔ جس پر پچاس روپے انعام ہے۔ جواب چھپ جائے تو مجھے وہ انعام مل جائے۔ اخباروں کے دفتر میں اکثر خفیہ

پولیس کے آدمی آتے جاتے ہیں۔ یہی ڈر ہے نہیں تو میں خود چلا جاتا۔

دیبی دین۔ تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے!

رما۔ تو پھر کیا ڈاک سے بھیج دوں!

دیبی۔ نہیں ڈاک سے کیا بھیجو گے۔ سادہ لفافہ ادھر ادھر ہو جائے تو تمہاری محنت اکارت جائے۔ رجسٹری کراؤ تو کہیں پرسوں پہنچے گا۔ کل اتوار ہے کسی اور نے جواب بھیج دیا تو انعام دہ مار لے جائیگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اخبار والے دھاندلی کر بیٹھیں اور تمہارا جواب اپنے نام سے چھاپ کر روپے ہضم کر لیں۔

رمانے شش و پنج میں پڑ کر کہا۔ تو میں ہی چلا جاؤنگا۔

دیبی۔ نہیں میں نہ جانے دونگا۔ کہیں پھنس جاؤ گے بس۔

رما۔ پھنسنا تو ایک دن ہی ہے۔ کب تک چھپا رہوں گا۔

دیبی۔ تو جب پھنسو گے تب دیکھی جائے گی۔ لاؤ میں چلا جاؤں۔ بڑھیا سے کوئی بہانہ کروں گا۔

یہ کہتے ہوئے دیبی دین نے اپنا کالا کمبل اوڑھا۔ رما سے لفافہ لیا اور چل دیا۔

بڑھیا ساگ بھاجی لینے منڈی گئی تھی۔ آدھ گھنٹے میں سر پر ٹوکری رکھے اور ایک بڑا سا ٹوکرا مزدور کے سر پر رکھوائے آئی۔ پسینہ سے تر تھی۔ آتے ہی بولی کہاں گئے ذرا بوجھ تو اتارو۔ گردن ٹوٹ گئی۔

رمانے آگے بڑھ کر ٹوکری اتروائی۔ اتنی بھاری تھی کہ سنبھالے نہ سنبھلتی تھی۔ بڑھیانے پوچھا وہ کہاں گئے۔

رمانے بہانہ کیا۔ مجھے تو نہیں معلوم ابھی اسی طرف گئے ہیں۔

بڑھیانے مزدور کے سر سے ٹوکرا اتروایا اور زمین پر بیٹھ کر ایک ٹوٹی ہوئی پنکھیا جھلتی ہوئی بولی۔ چرس کی چاٹ لگی ہوئی ہوگی اور کیا؟ میں مر مر کر کماؤں اور

یہ بیٹھے بیٹھے موج اڑاویں رہ ریس بیٹیں۔

رما جانتا تھا۔ دیبی دین چرس پیتا ہے لیکن بڑھیا کو ٹھنڈا کرنے کے لئے بولا۔ کیا چرس پیتے ہیں میں نے تو نہیں دیکھا۔

بڑھیا نے بیٹھ کی ساڑھی ہٹا کر اسے پنکھے کی ڈنڈی سے کھجلاتے ہوئے کہا۔ ان سے کوئی نشہ چھوٹا ہے رہ ریس بہ میٹیں، گانجہ بیٹیں، سراب انہیں چاہیئے بھنگ انہیں چاہیئے۔ ہاں ابھی تک افیم نہیں کھائی۔ یا رام جانے کھاتے ہوں۔ میں کون ہر دم دیکھتی ہوں۔ میں تو سوچتی ہوں کون جانے آگے کیا ہو۔ ہاتھ میں چار پیسے رہیں گے تو پرائے بھی اپنے ہو جائیں گے، مگر اس بھلے آدمی کو رتی بھر فکر نہیں ہوتی کبھی تیرتھ ہے کبھی کچھ، کبھی کچھ، میرا تو ناک میں دم آگیا بھگوان اٹھا لیتے تو گلا چھوٹ جاتا تب یاد کریں گے لالہ، تب جگو کہاں ملے گی جو کما کما کے کل جھرے اڑانے کو دیا کرے گی۔ تب سر پہ ہاتھ رکھ کر نہ روئیں تو کہہ دینا کوئی کہتا تھا مزدور سے کے پیسے ہو گئے تیرے۔

مزدور نے بڑی جلاتے ہوئے کہا۔ پوچھا دیکھ لو دائی، گردن ٹوٹ گئی۔

جگو نے بے رحمانہ انداز سے کہا، ہاں ہاں گردن ٹوٹ گئی بڑے نازک ہو نا۔ یہ لے کل پھر چلے آنا۔

مزدور چلا گیا۔ تو بڑھیا کو حساب کی یاد آئی۔ رما سے بولی۔ بھیا! جرا آج کا کھرچا ٹوٹا نک لو۔ بجار میں تو جیسے آگ لگ گئی ہے۔

بڑھیا جھپٹریوں میں چیزیں لگا لگا کر رکھتی جاتی تھی اور حساب بھی لکھاتی جاتی تھی آلو۔ ٹماٹر۔ کدو۔ کیلے، پالک، رسیم سب چیزیں کا تول اور در اسے یاد تھا، رما سے دوبارہ پڑھوا کر سنا تب اسے اطمینان ہوا۔ ان کاموں سے فرصت پا کر اس نے اپنی چلم بھری اور موڑھے پر بیٹھ کر پینے لگی۔ لیکن اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ

وہ تمباکو کا مزا لینے کے لئے نہیں دل کو جلانے کے لئے پی رہی ہے۔ ایک لمحہ بعد پھر بولی۔ دوسری دوسری عورت ہوتی تو گھڑی بھر ان کے ساتھ نباہ نہ ہوتا۔ گھڑی بھر ہر بات سے چکی میں جت جاتی ہوں اور دس بجے رات تک دکان پر بیٹھی ستی ہوتی رہتی ہوں۔ کھاتے پیتے بارہ بجتے ہیں تب جا کر چار پیسے دکھائی دیتے ہیں اور میں جو کچھ کماتی ہوں اسے یہ نشے میں اڑا دیتا ہے۔ سات کوٹھری میں چھپا کر رکھوں مگر اس کی نگاہ پہنچ جاتی ہے۔ کبھی ایک آدھ چیز بنوا لیتی ہوں تو وہ آنکھوں میں گڑنے لگتی ہے۔ بھگوان نے لڑکوں کا سکھ بھوگنا نہیں لکھا تھا تو کیا کروں۔ چھاتی پھاڑ کر مر جاؤں، مانگنے سے موت بھی تو نہیں ملتی۔ سکھ بھوگنا لکھا ہوتا تو جوان بیٹے کیوں چل دیتے۔ اور اس بیکڑ کے ہاتھوں میری یہ سانست ہوتی۔ اسی نے سودیشی کے جھگڑے میں پڑھ کر میرے لالوں کی جان لی۔ آؤ اس کوٹھری میں بھیا۔ تمہیں کدر کی جوڑی دکھاؤں۔ دونوں اس جوڑی کے پانچ پانچ سو ہاتھ پھیرتے تھے۔

اندھیری کوٹھری میں جا کر رمانے کدر کی جوڑی دیکھی۔ ان پر وارنش تھی۔ صاف ستھری گویا کسی نے ابھی پھیر کر رکھ دیا ہو۔ بڑھیانے غرور آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ لوگ کہتے تھے یہ جوڑی مہاباسن کو دے دے۔ سب تجھے دیکھ دیکھ کر کلک ہو گا۔ میں نے کہا یہ جوڑی میرے لالوں کی جوڑی ہے یہی میرے دونوں بیٹے ہیں۔

آج رما کے دل میں بڑھیا کی جانب سے بے اندازہ عقیدت پیدا ہوئی۔ کتنا زاہدانہ توکل ہے! کتنی پاکیزہ محبت، جس نے لکڑی کے ان دو ٹکڑوں کو زندگی عطا کی ہے رمانے جگو کو حرص اور طمع میں ڈوبی ہوئی پیسے پر جان دینے والی نازک جذبات سے عاری سمجھ رکھا تھا۔ آج اسے معلوم ہوا کہ ضعیفہ کا دل کتنا نازک، کتنا دلیر، کتنا مہر پرور ہے۔

بڑھیا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے

ہوئے تھے آج دونوں کے دل رشتۂ محبت میں مربوط تھے۔ ایک طرف مادرانہ شفقت تھی دوسری طرف فرزانہ سعادت مندی، وہ کدورت جواب تک نا دانستہ طور پر دونوں کو الگ کئے ہوئے تھی۔ آج یکایک مٹ گئی۔

بڑھیا نے کہا، منہ ہاتھ دھو لیا ہے بیٹا! بڑے میٹھے سنترے لائی ہوں۔ ایک لیکر چکھو تو۔

رما نے سنترہ کھاتے ہوئے کہا، آج سے میں تمہیں اماں کہا کرونگا۔

بڑھیا کے ٹھنڈے، خشک بے نور اور بجھی آنکھوں سے موتی کے سے دو قطرے نکل پڑے۔

اتنے میں دین دین دبے پاؤں آکر کھڑا ہو گیا۔ بڑھیا نے تڑپ کر پوچھا۔ اتنے سویرے کدھر سواری گئی تھی سرکار کی؟

دین دین نے سادگی سے مسکرا کر کہا۔ کہیں نہیں جرا ایک کام سے چلا گیا۔

کیا کام تھا جرا میں بھی سنوں یا میرے سننے کے لائق نہیں ہے۔

پیٹ میں درد تھا بیدجی کے پاس چورن لینے چلا گیا تھا۔

جھوٹے ہو تم۔ اڑوس سے جو تمہیں جانتا نہ ہو۔ تم چرس کی ٹوہ میں گئے تھے۔

نہیں تیرے سر کی قسم تو جھونٹ موٹ مجھے بدنام کرتی ہے۔

تو پھر کہاں گئے تھے تم۔

بتا تو دیا۔ رات کو کھانا ذرا زیادہ کھا گیا تھا سو پیٹ پھول گیا اور کھٹی کھٹی۔

جھوٹ ہے سراسر جھوٹ ہے تمہارا منہ صاف کہے دیتا ہے کہ یہ بہانہ ہے تم چرس یا گانجے کی ٹوہ میں گئے تھے میں ایک نہ مانوں گی۔ تمہیں اس بڑھاپے میں نشے کی سوجھتی ہے یہاں میری مرن ہوئی جاتی ہے، سویرے کے گئے گئے نو بجے لوٹے ہیں جیسے یہاں انکی لونڈی لگی ہے۔

دیبی دین نے ایک جھاڑو لے کر دکان میں جھاڑو لگانا شروع کیا۔ بڑھیا نے اس کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور پوچھا۔ تم اب تک تھے کہاں۔ جب تک یہ نہ بتاؤ گے گھر میں گھسنے نہ دونگی۔

دیبی دین نے سٹ پٹا کر کہا۔ کیا کرے گی پوچھ کر۔ ایک اخبار کے دفتر میں گیا تھا جو پہلے سجا دے۔

بڑھیا نے ماتھا ٹھونک کر کہا۔ تم نے پھر وہی لت پکڑی۔ تم نے کان نہ پکڑا تھا کہ اب پھر کبھی ادھر نہ جاؤنگا۔ بولو یہی منہ تھا کہ کوئی اور؟

تو بات تو سمجھتی نہیں بگڑنے لگتی ہے۔

خوب سمجھتی ہوں اخبار والے دنگا مچاتے ہیں اور گریبوں کو جیل لیجاتے ہیں۔ آج بیس سال سے دیکھ رہی ہوں کیا بڑھاپے میں جیل کی روٹیاں توڑو گے۔

دیبی دین نے ایک لفافہ رمانا تھ کو دے کر کہا۔ یہ روپے ہیں بھیا گن لو۔ یہ روپے وصول کرنے گیا تھا جی نہ مانتا ہو تو آدھے لے لے۔

بڑھیا نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ اچھا تو تم اپنے ساتھ بھیا کو بھی ڈبانا چاہتے ہو۔ تمہارے روپے میں آگ لگا دونگی۔ تم روپے مت لینا بھیا۔ مصیبت میں پھنس جاؤ گے اب سیت میں آدمی نہیں ملتے تو سب لالچ دے کر لوگوں کو پھانستے ہیں۔ بازار میں پہرا دلا دینگے۔ عدالت میں گواہی کرا دیں گے۔ پھینک دو اس کے روپے۔ جتنے روپے چاہو مجھ سے لے جاؤ۔

جب رمانا تھ نے سارا قصہ کہا تو بڑھیا کی تشفی ہوئی۔ چہرہ کی وہ تندی غائب ہو گئی خوش ہو کر بولی۔ اس میں سے میرے لئے کیا لاؤ گے بھیا۔

رما نے لفافہ اس کے سامنے رکھ کر کہا۔ تمہارے ہی روپے تو ہیں۔ اماں، میں روپے لے کر کیا کرونگا۔

پھر کیوں نہیں بھیج دیتے؟

میرا گھر یہی ہے اماں! کوئی دوسرا گھر نہیں ہے۔

بڑھیا کا حسرت نصیب دل شگفتہ ہو گیا۔ اس فرزانہ محبت کے لئے کتنے دنوں سے اس کی روح بے قرار تھی۔ اس حسین دل میں محبت کا جو خزانہ جمع ہو گیا وہ سب ماں کے سینے میں جمع ہونے والے دودھ کی طرح بیٹے پر نثار ہونے کے لئے للچا اٹھا۔

بڑھیا نے نوٹوں کو گن کر کہا۔ پچاس ہیں بیٹا! پچاس مجھ سے اور لے لو۔ چائے کا پتیلا رکھا ہوا ہے چائے کی دکان کھول لو۔ یہیں ایک طرف چار پانچ موڑھے اور ایک میز رکھ لینا۔ دو دو گھنٹے سانجھ سویرے بیٹھ جاؤ گے تو گجر بھر کو مل جائے گا۔

دیبی دین بولا۔ تب چرس کے پیسے میں اس دکان سے لیا کرونگا۔

بڑھیا نے مسرور اور مخمور آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ کوڑی کوڑی کا حساب لے لونگی — اس پھیر میں نہ رہنا۔

رما اپنے کمرہ میں گیا تو اس کا دل بہت خوش تھا۔ آج اسے وہی مسرت ہو رہی تھی جو گھر کی یاد دلاتی تھی گھر پر جو پیار ملتا تھا وہ اس کا حق تھا۔ یہاں جو پیار ملا گویا آسمان سے ٹپکا تھا۔

وہ نہا دھو کر پوجا کا سوانگ بھرنے بیٹھا کہ بڑھیا آ کر بولی۔ بیٹا تمہیں روٹی بنانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے ایک مسرانی ٹھیک کر دی ہے۔ وہ تمہارا کھانا پکا دے گی دھرم کرم سے رہتی ہے بھیّا۔ ایسی بات نہیں ہے۔

ان ضعیف آنکھوں میں گہری دلاز والی مادریت جھلک رہی تھی۔ اونچ نیچ اور اعلٰے وادنیٰ کی تمیز خود بخود مٹ گئی بولا۔ جب تم میری ماں ہو گئیں تو پھر کیا فرق۔ میں تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاؤنگا۔

بڑھیا نے زبان دانتوں سے دبا کر کہا۔ ارے نہیں بیٹیا۔ میں تمہارا دھرم نہ لوں

گی کہاں تم براہمن کہاں ہم کھٹک۔ ایسا بھی کہیں ہوا ہے۔
میں تمہاری رسوئی میں کھاؤنگا۔ جب ماں باپ کھٹک ہیں تو بٹیا بھی کھٹک ہی ہے۔
اور جو تمہارے گھر والے سنیں تو کیا کہیں۔
مجھے کسی کے کہنے سننے کی پرواہ نہیں ہے۔ آدمی گناہ سے نیچا ہوتا ہے۔ کھانے پینے سے نیچا نہیں ہوتا۔ پریم سے جو کھانا ملتا ہے وہی پاک ہوتا ہے۔ اس سے تو دیوتا بھی انکار نہیں کرسکتے۔
بڑھیا کے دل میں بھی اپنے ذات کی انتیاز کا جذبہ پیدا ہوا۔ بولی بٹیا! کھٹک کی کوئی نیچی ذات نہیں ہے۔ ہم لوگ براہمن کے ہاتھ کا بھی بھوجن نہیں کھاتے۔ کہار کے ہاتھ کا پانی تک نہیں پیتے۔ ماس مچھلی ہاتھ سے نہیں چھوتے۔ کوئی کوئی سراب پیتے ہیں۔ لیکن چھپ کر۔ اس نے کسی کو نہیں چھوڑا بٹیا! بڑے بڑے تلک دھاری گٹا گٹ پیتے ہیں لیکن میری روٹی نہیں اچھی لگیں گی۔
رمانے مسکرا کر کہا۔ پریم کی روٹیوں میں امرت رہتا ہے۔ چاہے گیہوں کی ہوں یا باجرے کی۔
بڑھیا یہاں سے چلی تو گویا انچل میں مسرت کا خزانہ بھرے ہوئے ہو۔

(۲۸)

جب سے رما چلا گیا تھا رتن کو جالپا کے بارے میں بہت تشویش ہو گئی۔ وہ کسی بہانے سے اس کی مدد کرتے رہنا چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی چاہتی تھی کہ جالپا کسی طرح تاڑ نہ جائے۔ اگر کچھ روپے خرچ کرکے بھی وہ رما کا پتہ لگا سکتی تو خوشی سے خرچ کر دیتی۔ جالپا کی وہ روتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اس کا دل مسوس اٹھتا تھا۔ وہ اسے بشاش دیکھنا چاہ

تھی۔ اپنے اندھیرے روئے گھر سے اداس ہو کر وہ جالیا کے گھر چلی جایا کرتی تھی، وہاں گھڑی بھر ہنس بول لینے سے اس کا دل خوش ہو جاتا تھا۔ اب بھی وہاں وہی نحوست چھا گئی۔ یہاں تک آ کر اسے محسوس ہوتا تھا کہ میں بھی دنیا میں ہوں۔ اس دنیا میں جہاں زندگی ہے تمنا ہے محبت ہے اور مسرت ہے۔ اس کی اپنی زندگی تو فرض کی قربان گاہ کی نذر ہو چکی تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ شہر کے معززاور خوشحال گھروں سے رتن کے مراسم تھے لیکن جہاں اعزاز تھا وہاں تکلف تھا۔ نمائش تھی حسد تھا، غیبت تھی، کلب کی صحبت سے بھی اسے نفرت ہو گئی تھی، وہاں تفریح ضرور تھی لیکن مردوں کی عاشقانہ نگاہیں بھی تھیں بیقرار دل بھی رندانہ بذلہ سنجیاں بھی۔ جالیا کے گھر اگر وہ شان نہ تھی، وہ دولت نہ تھی تو وہ نمائش بھی نہ تھی۔ وہ تنگ دل بھی نہ تھی۔ رماجوان تھا خوش رو تھا ممکن ہے شوقین بھی ہو، مگر رتن کو بھی تک اس کے متعلق کسی قسم کا شبہ کرنے کا موقعہ نہ ملا تھا اور جالیا جیسی نازنین کی موجودگی میں اس کا امکان بھی نہ تھا۔

زندگی کے بازار میں اور سبھی دکانداروں کی دغابازیوں سے تنگ آ کر اس نے اس چھوٹی سی دکان میں آ کر پناہ لی تھی، مگر یہ دکان ٹوٹ گئی۔ اب وہ کس بازار میں زندگی کی جنس خریدے گی سچا مال پائے گی۔

ایک دن وہ گراموفون لائی اور شام تک بجاتی رہی۔ دوسرے دن تازہ میووں کی ایک ٹوکری لاکر رکھ دی۔ جب وہ آتی تو کوئی نہ کوئی سوغات لے آتی۔ اب تک وہ جاگیشری سے بہت کم ملتی تھی، مگر اب اکثر اس کے پاس آ بیٹھتی تھی اور ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتی کبھی کبھی اس کے سر میں تیل ڈالتی، اور اس کے بال گوندھتی، گوپی اور بشمبر سے بھی اب اسے محبت ہو گئی تھی، کبھی کبھی دونوں کو موٹر پر سیر کرانے لے جاتی۔ اسکول سے آتے ہی دونوں بھی اس کے بنگلے پر پہنچ جاتے اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ان کے شور وغل میں رتن کو دلی مسرت حاصل ہوتی تھی۔

ایک دن رتن آئی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ جالپا نے پوچھا کیا آج طبیعت اچھی نہیں ہے۔

رتن نے غم ناک لہجہ میں کہا۔ طبیعت تو اچھی ہے مگر آج رات بھر جاگنا پڑا۔ رات سے وکیل صاحب کو بہت تکلیف ہے۔ جاڑوں میں انہیں دمہ کا دورہ ہو جاتا ہے بے چارے جاڑوں بھر دوائیں کھاتے رہتے ہیں۔ مگر یہ مرض گلا نہیں چھوڑتا۔ کلکتہ میں ایک نامی بید ہیں اب کے انہیں سے علاج کرانے کا ارادہ ہے۔ کل چلی جاؤں گی۔ مجھے ساتھ لے جانے کا تو ارادہ نہیں ہے کہتے ہیں وہاں بڑی تکلیف ہو گی۔ لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ کسی کو ساتھ تو رہنا ہی چاہیئے۔ وہاں دو بار ہو آئی ہوں اور جب گئی ہوں بیمار ہو گئی ہوں۔ مجھے وہاں ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ لیکن اپنے آرام کو دیکھوں یا ان کی بیماری کو دیکھوں۔ اگر کوئی میرا سب کچھ لے کر بھی انہیں اچھا کر دے تو میں خوشی سے دے دوں۔

جالپا نے پوچھا۔ یہاں کسی بید کو نہیں بلایا۔

یہاں کے بیدوں کو دیکھ چکی۔ بید۔ ڈاکٹر۔ حکیم کوئی تو نہیں بچا۔

پھر کب تک آؤ گی۔

کچھ ٹھیک نہیں۔ ان کی بیماری پر ہے۔ ایک ہفتہ میں آجاؤں یا مہینہ دو مہینے لگ جائیں۔ مگر جب تک بیماری کی جڑ نہ ٹوٹ جائے گی نہ آؤں گی۔

تقدیر غیب میں بیٹھی ہوئی ہنس رہی تھی۔ جالپا دل میں مسکرائی جس بیماری کی جڑ جوانی میں نہ ٹوٹی بڑھاپے میں کیا ٹوٹے گی۔

ایک لمحہ کے بعد رتن نے کہا۔ تم بھی چلتیں تو بڑا مزا آتا۔

جالپا نے دردناک انداز سے کہا۔ کیسے چلوں بہن۔ جانے بھی پاؤں۔ یہاں دن بھر آس لگی رہتی ہے۔ کوئی خبر آتی ہو گی۔ وہاں میرا جی اور بھی گھبرائے گا۔

میرا دل تو کہتا ہے بابو جی کلکتے ہی میں ہیں۔

تو ذرا اِدھر اُدھر تلاش کرنا۔ اگر کوئی خبر ملے تو مجھے اطلاع دینا۔

اس کے لئے تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں ہے جالیا۔

یہ مجھے معلوم ہے خط برابر بھیجتی رہو گی۔

ہاں ضرور، روز نہیں تو ایک روز ناغہ دے کر ضرور لکھوں گی۔

جالیا پان بنانے لگی۔ رتن اس کے چہرے کی طرف منتظر آنکھوں سے تاکتی رہی گویا کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر حجاب کے باعث کچھ نہیں کہہ سکتی۔ جالیا نے پان دیتے وقت اس کے دل کی بات بھانپ کر کہا۔ کیا ہے بہن کیا کہہ رہی ہو۔

میرے پاس کچھ روپے ہیں تم رکھ لو۔ میرے پاس رہیں گے تو خرچ ہو جائیں گے۔

جالیا نے مسکرا کر کہا۔ اور جو مجھ سے ہی خرچ ہو جائیں۔

رتن خوش ہو کر بولی۔ تمہارے ہی تو ہیں بہن، کسی غیر کے تو نہیں ہیں۔

جالیا خیال میں ڈوبی ہوئی زمین کی طرف تاکتی رہی۔ کچھ جواب نہ دیا۔ رتن نے سمجھا اسے اعتراض ہے۔ شکوہ کے انداز سے بولی۔ تم نے کچھ جواب نہ دیا بہن۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم مجھ سے کھچی کیوں رہتی ہو۔ میں چاہتی ہوں مجھ میں اور تم میں ذرا بھی مغائرت نہ رہے لیکن تم مجھ سے دور بھاگتی ہو۔ مان لو میرے سو پچاس روپے تمہیں سے خرچ ہو گئے تو کیا ہوا۔ بہنوں میں تو ایسا کوڑی کوڑی کا حساب نہیں ہوتا۔

جالیا نے متین لہجہ میں کہا۔ کچھ کہوں بُرا تو نہ مانو گی

بُرا ماننے کی بات ہو گی تو ضرور بُرا مانوں گی۔

ممکن ہے تمہیں بری لگے۔ لیکن میں تمہارا دل دکھانے کے لئے نہیں کہتی۔ تم اپنے دل میں سوچو۔ تمہارے اس بہناپے میں رحم یا امداد کا خیال شامل ہے یا نہیں۔ تم میری غریبی پر ترس کھا کر۔

رتن نے لپک کر دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ بند کر دیا اور بولی۔ بس اب رہنے

دو۔ تم چاہے جو سمجھو، مگر یہ خیال کبھی میرے دل میں نہ تھا نہ ہو سکتا ہے۔ مجھے تو اگر بھوک لگی ہو تو تم سے بے تکلف کہہ بیٹھوں۔

جالیا نے اسی بیگانہ پن سے کہا، تم ایسا کہہ سکتی ہو۔ تم جانتی ہو کہ کسی دوسرے موقعہ پر تم روٹیوں کے عوض میوے کھلا سکتی ہو۔ لیکن ایشور نہ کرے کوئی ایسا موقع آئے جب تمہارے گھر میں روٹی کا ٹکڑا نہ ہو، تو شاید تم اتنی بے تکلف نہ ہو سکو۔

رتن نے بے ساختہ پن سے کہا۔ مجھے اس حالت میں بھی تم سے مانگنے میں حجاب نہ ہوگا۔ دوستی حالات کی پرواہ نہیں کرتی۔ ایسی باتیں کر کے تم میرا دروازہ بند کر رہی ہو۔ میں نے سمجھا تھا تمہارے ساتھ زندگی کے دن کاٹ دونگی۔ لیکن تم ابھی سے دامن چھڑائے لیتی ہو۔ بدنصیبوں کو پریم کی بھیک بھی نہیں ملتی۔

یہ کہتے کہتے رتن کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ جالیا اپنے کو غم نصیب سمجھتی تھی اور غم نصیبوں کو تلخ حق کے اظہار کی آزادی ہوتی ہے۔ لیکن اب اسے معلوم ہوا کہ رتن کی مصیبت اس کی مصیبت سے کہیں زیادہ دل شکن ہے۔ جالیا کو شوہر کے لوٹ آنے کی اب بھی امید تھی۔ اس کے آتے ہی اس کے ایام غم بھول جائیں گے۔ اس کی امیدوں کا آفتاب پھر روشن ہوگا۔ اس کی آرزوئیں پھر کھلیں پھولیں گی۔ آنے والا زمانہ اپنی ساری آرزوئیں اور ترغیبوں کے ساتھ اس کے سامنے تھا، روشن، دلفریب، اور وسیع۔ رتن کا مستقبل کیا تھا کچھ نہیں، گہری تاریکی۔

رتن آنکھیں پونچھ کر کھڑی ہو گئی۔ خطوں کا جواب دیتی رہنا۔

جالیا نے کہا روپے دیتی جاؤ۔

رتن نے تھیلی سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ لیکن اس کے چہرے پر خوشی نہ تھی۔ جالیا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ کیا برا مان گئیں۔

رتن نے روٹھ کر کہا، برا مان کر تمہارا کیا کر لونگی!

جالپا نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ فرطِ الفت سے اس کا دل لہلہا اٹھا۔ رتن سے اسے اتنی محبت کبھی نہ ہوئی تھی۔ وہ اب تک اس سے کھنچتی تھی جلتی تھی۔ آج جیسے رتن کی اصلی صورت نظر آئی۔ اس نے سوچا یہ سچ مچ بدنصیب ہے۔ اور مجھ سے زیادہ۔ ایک لمحہ میں رتن آنکھوں میں آنسو اور ہنسی ایک ساتھ بھرے ہوئے رخصت ہو گئی۔

(۳۹)

کلکتہ میں وکیل صاحب کے ٹھہرنے کے لئے پہلے ہی انتظام کر لیا گیا تھا۔ کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ رتن نے مہراج اور ٹمبل کہار کو ساتھ لے لیا تھا۔ دونوں وکیل صاحب کے پرانے ملازم تھے اور گھر کے آدمی ہو گئے تھے۔ شہر کے باہر ایک بنگلہ میں تین کمرے لے لئے گئے تھے۔ احاطے میں طرح طرح کے پھول پودے لگے ہوئے تھے بڑی فرحت کی جگہ تھی۔ قرب وجوار میں اور کتنے ہی بنگلے تھے۔ شہر کے لوگ ادھر ہوا خوری کو جایا کرتے تھے۔ اور رہ رہے ہو کر لوٹتے تھے مگر رتن کو جگہ پھاڑے کھاتی تھی۔ بیمار کے تیمار دار بھی بیمار ہو جاتے ہیں۔ افسردہ دلوں کے لئے جنت بھی ویران ہے۔

سفر نے وکیل صاحب کو اور بھی مضمحل کر دیا۔ دو تین دن تو ان کی حالت پہلے ابتر ہو گئی۔ لیکن معالجہ شروع ہونے کے بعد وہ کچھ سنبھلنے لگے۔ رتن صبح سے آدھی رات تک ان کی چارپائی کے پاس ہی کرسی ڈالے بیٹھی رہتی۔ وکیل صاحب چاہتے تھے کہ وہ یہاں سے ہٹ جائے تو دل کھول کر کراہیں۔ اسے تشفی دینے کے لئے وہ اپنی حالت چھپانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

وہ پوچھتی آج کیسی طبیعت ہے تو وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہتے۔ آج تو جی بہت ہلکا معلوم ہوتا ہے۔ بیچارے ساری رات کروٹیں بدل کر کاٹتے تھے۔ مگر رتن پوچھتی رات نیند آئی تھی تو کہتے۔ ہاں خوب سویا۔ رتن جب کھانا لے کر جاتی

تو رغبت نہ ہونے پر بھی کھا لیتے۔ رتن سمجھتی تھی اب یہ اچھے ہو رہے ہیں۔ کبیراج سے بھی وہ یہی کیفیت بیان کرتی تھی۔ کبیراج بھی اپنے معالجہ کی کامیابی پر خوش تھے۔

ایک دن وکیل صاحب نے رتن سے کہا۔ مجھے خوف ہے کہ اچھا ہونے کے بعد بھی مجھے تمہاری دوا نہ کرنی پڑے۔

رتن نے خوش ہو کر کہا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔ میں تو ایشور سے مناتی ہوں کہ وہ تمہاری بیماری مجھے دے دیں۔

شام کو گھوم آیا کرو۔ اگر بیمار پڑنے کی خواہش ہو تو میرے اچھے ہونے پر پڑنا۔

کہاں جاؤں۔ میرا تو کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ مجھے یہیں سب سے اچھا لگتا ہے۔

وکیل صاحب کو یکایک رما ناتھ کا خیال آ گیا۔ بولے ذرا شہر کے پارکوں میں گھوم گھام کے دیکھو شاید رما ناتھ کا پتہ چل جائے۔

رتن کو اپنا وعدہ یاد آ گیا۔ اسے ملاقات ہو جانے کی امید نے ایک لمحہ کے لئے اسے بیتاب کر دیا۔ کہیں وہ پارک میں بیٹھے مل جائیں تو پوچھوں۔ کہئے بابوجی اب بھاگ کر کہاں جایئے گا۔ اس خیال سے اس کا چہرہ کھل اٹھا بولی۔ جا لیا سے میں نے وعدہ تو کیا تھا لیکن یہاں آ کر بھول گئی۔

وکیل صاحب نے اصرار کر کے کہا۔ آج چلی جاؤ۔ آج کیا شام کو روز گھنٹہ بھر ٹہل آیا کرو۔

رتن نے تشویش کے ساتھ کہا۔ لیکن فکر تو نہ لگی رہے گی۔

وکیل صاحب نے مسکرا کر کہا۔ میں تو اچھا ہو رہا ہوں۔

رتن بے دلی سے بولی۔ اچھا چلی جاؤں گی۔

مگر رتن کو کل سے وکیل صاحب کی تشفی انگیز باتوں پر کچھ شبہ ہونے لگا تھا۔

ان کی صورت سے اچھے ہونے کی کوئی علامت نہیں نظر آتی تھی۔ اگر وہ اچھے ہو رہے ہیں تو ان کا چہرہ روز بروز کیوں زرد ہوتا جاتا ہے آنکھیں کیوں ہر وقت بند رہتی ہیں، جسم کیوں گھلتا جاتا ہے، مہراج اور خدمتگار سے وہ اپنا شبہ نہ ظاہر کر سکتی تھی، کبیراج سے پوچھتے بھی شرم آتی تھی۔

اگر کہیں رما مل جائے تو ان سے پوچھتی، ممکن ہے کسی ڈاکٹر سے ان کی ملاقات ہو۔ ان کبیراج سے وہ کچھ کچھ مایوس ہو چلی تھی۔

جب رتن چلی گئی تو وکیل صاحب نے ٹیمل سے کہا، مجھے ذرا اٹھا کر بٹھا دو، ٹیمل پڑے پڑے کمر سیدھی ہو گئی۔ ایک پیالی چائے پلا دو، کئی دن ہو گئے چائے کی صورت نہیں دیکھی، مجھے مارے ڈالتا ہے دودھ کی صورت دیکھ کر بخار چڑھ آتا ہے مگر ان کی خاطر سے پی لیتا ہوں۔ مجھے تو ان کبیراج کی دوا سے کچھ فائدہ نہیں معلوم ہوتا، تمہارا کیا خیال ہے۔

ٹیمل نے وکیل صاحب کو تکیہ کے سہارے بٹھا کر کہا۔ بابوجی یہ تو میں پہلے ہی کہنے والا تھا، بہوجی کے ڈر کے مارے نہیں کہتا تھا۔

وکیل صاحب ایک منٹ تک خاموش رہ کر بولے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ ٹیمل! بالکل نہیں۔ مجھے دوزخ اور بہشت پر بالکل یقین نہیں ہے۔ اگر آدمی کو اپنے اعمال کے مطابق جنم لینا پڑتا ہے تو مجھے یقین ہے کہ میرا جنم کسی اچھے گھر میں ہوگا۔ تاہم مرنے کو جی نہیں چاہتا۔ سوچتا ہوں مر گیا تو کیا ہوگا۔

ٹیمل بولا۔ بابوجی آپ ایسی باتیں نہ کریں، بھگوان چاہیں گے تو آپ اچھے ہو جائیں گے۔ کہئے تو کل کسی دوسرے ڈاکٹر کو بلا لاؤں۔ آپ لوگ تو انگریزی پڑھے ہیں۔ کچھ مانتے ہی نہیں۔ مجھے تو کوئی دوسرا پھیر معلوم ہوتا ہے، کبھی کبھی گنواروں کی بھی سُن لیا کیجئے۔ آپ مانو یا نہ مانو، میں تو ایک سیانے کو لاؤں گا۔

وکیل صاحب نے منہ پھیر لیا۔ جن و آسیب کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ کئی سیانوں کو پیٹ چکے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شعبدہ بازی ہے، بالکل ریاکاری۔ لیکن اس وقت انہیں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ ٹمبل کی اس تجویز سے اختلاف کرتے!

مہراج نے چائے لا کر کہا۔ سرکار چائے پی لیجئے۔

وکیل صاحب نے چائے کے پیالے کو گرسنہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ لے جاؤ اب نہ پیوں گا۔ بہو جی کو معلوم ہو گیا تو ناراض ہوں گی۔ ایک منٹ کے بعد پھر وہ بولے۔ کیوں مہراج صبح سے میں آیا ہوں میرا چہرہ کچھ ہرا ہوا ہے۔

مہراج نے ٹمبل کی طرف دیکھا۔ وہ ہمیشہ رُخ دیکھ کر رائے دیا کرتے تھے، خود اپنی رائے قائم کرنے کی صلاحیت ان میں نہ تھی۔ اگر ٹمبل نے کہا ہے آپ اچھے ہو رہے ہیں تو وہ اس کی تائید کریں گے۔ ٹمبل نے اس کے خلاف کہا ہے تو انہیں بھی خلاف کہنا چاہیئے۔ ٹمبل نے ان کی پریشانی کو بھانپ کر کہا۔ ہرا کیوں نہیں ہوا ہے، ہاں مگر جتنا چاہیئے اتنا نہیں ہوا ہے۔

مہراج بولے، ہاں کچھ ہرا ضرور ہوا ہے مگر بہت کم۔

وکیل صاحب نے کچھ جواب نہ دیا۔ دو چار باتیں کرنے کے بعد انہیں ضعف ہو جاتا تھا اور دس پانچ منٹ خاموش پڑے رہتے تھے۔ شاید انہیں اپنی حالت کا واقعی علم ہو گیا تھا اس کے چہرے پر عقل پر دماغ پر موت کا سایہ پڑنے لگا تھا۔ اگر کچھ اُمید تھی تو اتنی ہی کہ شاید دل کی کمزوری سے انہیں اپنی حالت سے مایوسی ہو رہی ہو۔ ان کا دم پہلے سے زیادہ پھولنے لگا تھا۔ کبھی کبھی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب جان نکل جائیگی۔ نزع کی حالت طاری ہو جاتی تھی، کون جانے یہی حبس دم ذرا اور بڑھ کر زندگی کا خاتمہ کردے۔

سامنے باغ میں چاندنی کہرے کی چادر اوڑھے زمین پر پڑی سسک رہی تھی۔

پھول اور پودے سر جھکائے امید اور خوف سے بے قرار ہو کر گویا اس کی چھاتی پر ہاتھ رکھنے تھے اس کے ٹھنڈے جسم پر ہاتھ پھیر تے تھے اور آنسوؤں کی دو بوندیں گرا کر پھر المناک آنکھوں سے تاکنے لگتے تھے۔

دفعتاً وکیل صاحب نے آنکھیں کھولیں، آنکھوں کے دونوں گوشوں میں آنسو کی دو بوندیں مچل رہی تھیں۔ پھر آہستہ سے بولے۔ ٹمیل کیا سدھو آ گئے تھے پھر اس سوال پر آپ ہی آپ شرمندہ ہو کر مسکراتے ہوئے بولے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے سدھو آئے ہوں پھر گہری سانس لے کر خاموش ہو گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

سدھو۔ اس کے بیٹے کا نام تھا جوان موت مر چکا تھا۔ اس وقت وکیل صاحب کو بار بار اسی کی یاد آ رہی تھی۔ کبھی اس کا بچپن سامنے آ جاتا۔ کبھی اس کی موت آنکھوں میں پھر جاتی ساٹھ سال کا حافظہ کبھی اتنا روشن۔ کبھی اتنا صحیح نہ تھا۔

کئی منٹ کے بعد انہوں نے پھر آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر کھوئی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ انہیں ایسا معلوم ہوا کہ میری ماں آ کر پوچھ رہی ہے رتبیا تمہاری طبیعت کیسی ہے دفعتاً انہوں نے ٹمیل سے کہا۔ یہاں آؤ۔ جا کر کسی وکیل کو بلا لاؤ۔ جلد آنا ورنہ ہوچی آتی ہوں گی۔

اتنے میں موٹر کار کا ہارن سنائی دیا۔ اور ایک لمحہ میں رتن آ پہنچی۔ وکیل کو بلانے کی بات ٹل گئی۔

وکیل صاحب نے چہرہ کو بشاش بنا کر پوچھا۔ کہاں کہاں ہو آئیں۔ کچھ رمانا تھ کا پتہ ملا۔

رتن نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ کئی جگہ گئی وہ کہیں نہیں دکھائی دیتے اتنے بڑے شہر میں سڑکوں کا پتہ تو جلدی چلتا نہیں، وہ بھلا کیا ملیں گے۔ دوا کھانے کا وقت تو آ گیا ہوگا۔

وکیل صاحب نے دبی زبان سے کہا۔ لاؤ کھالوں۔

رتن نے دوا نکالی اور انہیں اٹھا کر پلائی۔ اس وقت وہ نہ معلوم کچھ خائف سی ہو رہی تھی۔ ایک نامعلوم دہشت اس کے دل پر غالب تھی۔

یکایک اس نے کہا۔ ان لوگوں میں سے کسی کو تار دے دوں؟

وکیل صاحب نے پرسوال نظروں سے دیکھا۔ پھر آپ ہی آپ اس کا مطلب سمجھ کر بولے۔ نہیں نہیں، کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر ایک لمحہ کے بعد اپنے حواس کو مجتمع کرنے کی کوشش کرکے بولے، میں چاہتا ہوں کہ اپنی وصیت لکھا دوں جیسے ایک ٹھنڈی تیز نکیلی چیز رتن کے تلوؤں سے گھس کر سر سے نکل گئی۔ گویا اس کے جسم کی ساری بندشیں کھل گئیں۔ سارے اعضاء بکھر گئے۔ جیسے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ اوپر سے آسمان اڑ گیا اور اب وہ بے حس، بے جان معلق کھڑی ہے۔ روندھے ہوئے گلے سے بولی گھر سے کسی کو بلاؤں۔ یہاں کوئی اپنا نہیں ہے۔

اپنوں کے لئے رتن اس وقت بیقرار ہو اٹھی۔ کوئی بھی تو اپنا ہو، جس پر وہ تکیہ کر سکتی۔ گھر کے لوگ آجاتے تو دوڑ دھوپ کرکے کسی دوسرے ڈاکٹر کو لاتے، وہ اکیلی کیا کرے۔ آخر بھائی بند اور کس دن کام آئیں گے۔ مصیبت ہی میں تو اپنے کام آتے ہیں۔ پھر یہ کیوں کہتے ہیں کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔

وصیت کی بات اسے پھر یاد آگئی۔ یہ خیال کیوں ان کے دل میں پیدا ہوا؟ وید جی نے تو کچھ کہا نہیں، کیا ہونے والا ہے۔ ایشور یہ خیال اس کے دل کو بے چین کرنے لگا۔ اس کی طبیعت آواز بلند سے رونے کے لئے مائل ہو گئی۔ اپنی ماں یاد آئی۔ اپنی ماں کے آنچل میں منہ چھپا کر رونے کی تمنا دل میں پیدا ہوئی۔

مہراج نے آکر کہا، سرکار کھانا تیار ہے تھالی پروسوں۔

رتن نے اس کی طرف سخت نگاہوں سے دیکھا۔ وہ لغیر انتظار کئے چلا گیا۔

مگر ایک ہی لمحہ میں مہراج پر رتن کو رحم آ گیا۔ اس نے کیا خطا کی جو کھانے کے لئے پوچھنے آیا۔ کھانا بھی ایسی چیز ہے جسے کوئی چھوڑ سکے، وہ رسوئی میں جا کر بولی۔ تم لوگ کھا لو مہراج مجھے آج بھوک نہیں ہے۔

مہراج نے اصرار کیا۔ دو ہی لقمے کھا لو سرکار!

رتن ٹھٹک گئی۔ مہراج کے اصرار میں اتنا خلوص، اتنی ہمدردی بھری ہوئی تھی کہ رتن کو ایک طرح کی تشفی کا احساس ہوا۔ یہاں کوئی اپنا نہیں ہے یہ کتنا غلط خیال ہے مہراج نے اب تک رتن کو تند مزاج مالکن کی صورت میں دیکھا تھا۔ وہی مالکن آج اس کے سامنے کھڑی گویا ہمدردی کی بھیک مانگ رہی تھی۔

رتن نے پوچھا۔ کیوں مہراج تمہارا کیا خیال ہے۔ بابوجی کو اس کبیراج کی دوا سے کچھ فائدہ ہو رہا ہے۔

مہراج نے ڈرتے ڈرتے وہی الفاظ دوہرائے جو آج وکیل صاحب سے کہے تھے۔ کچھ کچھ تو ہو رہا ہے۔ مگر جتنا چاہیئے اتنا نہیں۔

رتن نے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ تم بھی مجھے دھوکا دیتے ہو مہراج۔

مہراج کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور بولے۔ بھگوان سب اچھا ہی کریں گے۔ بہوجی گھبرانے سے کیا ہوگا۔ اپنا تو کوئی اختیار نہیں۔

رتن نے پوچھا۔ یہاں کوئی جوتشی تو نہ ملے گا۔

مہراج نے سرگرمی کے ساتھ کہا۔ یہ تو میں پہلے ہی کہنے والا تھا بہوجی۔ لیکن بابوجی کا مزاج تو جانتی ہو ان باتوں سے کتنا چڑتے ہیں۔

رتن نے تاکید کر کے کہا۔ سویرے کسی کو ضرور بلا لانا۔

یہ کہتی ہوئی وہ کمرے میں آئی اور جالپا کو یہ خط لکھنے لگی۔

بہن نہیں کہہ سکتی کیا ہونے والا ہے آج مجھے معلوم ہوا کہ میں کتنے بڑے مغالطہ

میں پڑی ہوئی تھی۔ وکیل صاحب اب تک مجھ سے اپنی حالت چھپاتے تھے، مگر آج یہ بات ان کے قابو سے باہر ہو گئی۔ رتن سے کیا کہوں آج وہ وصیت لکھوانے جا رہے تھے۔ دل بہت گھبرا رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تھوڑی سی سنکھیا کھا کر سو رہوں۔ ایشور کو دنیا رحیم اور کریم اور جانے کیا کیا کہتی ہے۔ میں کہتی ہوں اس سے زیادہ بے رحم اور سنگ دل کوئی دشمن بھی نہیں ہو سکتا۔ پچھلی زندگی کا قصہ محض دل کو سمجھانے کے لئے ہے جس سزا کا سبب ہی ہمیں معلوم نہ ہوا۔ اس سزا کی وقعت ہی کیا۔ وہ تو زبردست کی لاٹھی ہے جو اپنے لئے کوئی حیلہ گھڑ لیتی ہے۔ اس اندھیرے ہولناک پُر غار رستا ہرا زندگی میں مجھے صرف ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ملا تھا۔ اُسے انچل میں چھپائے ایشور کا گیت گاتی ہوئی اپنی حالت پر شاکر چلی جا رہی تھی۔ لیکن آج وہ چراغ بھی مجھ سے چھینا جا رہا ہے۔ اس اندھیرے میں مَیں کہاں جاؤں گی۔ کون میرا رونا سُنے گا۔ کون میری بانہہ پکڑے گا۔

بہن مجھے معاف کرنا مجھے بابو جی کی تلاش کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ آج شہر کی سڑکوں کا چکر لگا آئی ہوں۔ کچھ موقع ملا تو پھر جاؤں گی۔

یہ خط لکھ کر رتن برآمدہ میں آئی۔ دیکھا وکیل صاحب کی سانس زوروں سے چل رہی تھی۔

(۳۰)

رات کے تین بج چکے تھے رتن آدھی رات کے بعد آرام کرسی پر لیٹے ہی لیٹے جھپکیاں لے رہی تھی کہ یکایک وکیل صاحب کے گلے کی گھر گھراہٹ سن کر چونک پڑی۔ الٹی سانس چل رہی تھی وہ ان کے سرہانے چارپائی پر بیٹھ گئی اور ان کا سر اٹھا کر اپنی جانگھ پر رکھ لیا ابھی نہ جانے کتنی رات باقی تھی۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی تین بجے تھے سویرا ہونے میں چار گھنٹے کی دیر تھی۔ کبیراج کہیں نو بجے آئیں گے۔ گھر میں چار دن

طرف سوتا پڑا تھا۔ رتن کے دل پر خوف طاری ہو گیا یہ منحوس رات کبھی ختم بھی ہوگی یا نہیں۔

کئی منٹ کے بعد وکیل صاحب کی سانس رُکی، سارا جسم پسینے میں تر تھا، ہاتھ سے رتن کو ہٹ جانے کا اشارہ کیا اور تکیہ پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

ایک لمحہ میں انہوں نے ایک خفیف آواز میں کہا۔ رتن اب جدائی کا وقت آ گیا۔ میری خطائیں ...... انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ لئے اور رتن کی طرف بیکسانہ نظروں سے دیکھا۔ کچھ لکھنا چاہتے تھے مگر منہ سے آواز نہ نکلی۔ رتن نے چیخ کر پکارا۔ کیا ٹمبل مہراج دونوں مر گئے

مہراج نے آکر کہا۔ میں سویا تھوڑے بہو جی۔ بابو جی کی حالت۔ ۔۔ ۔۔

رتن نے ڈانٹ کر کہا۔ بکو مت جا کر کبیراج کو بلا لاؤ۔ کہنا ابھی چلئے۔

مہراج نے فوراً اپنا پُرانا اور کوٹ ڈاٹا۔ سوٹا اٹھایا اور چل دیئے۔ رتن اٹھ کر آگ جلانے لگی کہ شاید سینک سے کچھ فائدہ ہو۔ خطرے کو سامنے دیکھ کر اس میں یاس کی ہمت پیدا ہوئی۔ سارا گھبراہٹ سارا ضعف دور ہو گیا۔ اس کی جگہ اعتماد کی قوت پیدا ہوئی۔ فرض کے احساس نے اس کے سارے ادراک کو بیدار کر دیا۔ اسٹو جلا کر اس نے روئی کے گالوں سے وکیل صاحب کی چھاتی کو سینکنا شروع کیا۔ کوئی پندرہ منٹ تک متواتر سینکنے کے بعد وکیل صاحب کی سانس کچھ رکی۔ رتن کے دونوں ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھ کر بولے تمہیں بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ رتن میں کیا جانتا تھا یہ وقت اتنی جلد آ جائیگا۔ میں نے تمہارے اوپر بڑا ظلم کیا ہے۔ کتنا وحشیانہ ظلم۔ میں نے تمہاری زندگی غارت کر دی میری خطاؤں کو معاف کرنا۔

یہی آخری الفاظ تھے جو ان کے منہ سے نکلے۔ یہی زندگی کا آخری رشتہ تھا۔ یہی بزمِ حیات کا آخری دور۔ رتن نے مایوس نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ ابھی تک مہراج کا پتہ نہ تھا۔ ہاں ٹمبل کھڑا تھا۔

رتن نے کہا۔ ٹمبل ذرا پانی گرم کر دو گے۔

ٹمیلا نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔ پانی گرم کیا کرو گی بہو جی۔ گئو دان کرا دو۔ دو بوند گنگا جل منہ میں ڈال دو۔ رتن نے مرنے والے کی چھاتی پر ہاتھ رکھا۔ گویا ٹمیلا کی باتیں اس کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں۔ وکیل صاحب کا سینہ گرم تھا۔ اس نے پھر منتظر آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ مہراج نظر نہ آئے وہ اب بھی سوچ رہی تھی کہ مہراج آجاتے تو شاید ان کی حالت سنبھل جاتی۔ پچھتا رہی تھی کہ ان کو یہاں کیوں لائی۔ شاید راستے کی تھکان اور آب و ہوا کی تبدیلی نے مرض کو لاعلاج کر دیا۔ یہ پچھتاوا ابھی ہو رہا تھا کہ میں شام کو سیر کرنے چلی گئی شاید اتنی ہی دیر میں انہیں سردی لگ گئی ہو۔

لیکن پچھتاوے کی یہی باتیں نہ تھیں۔ اس آٹھ سال کی زندگی میں میں نے انہیں کیا آرام پہونچایا۔ وہ بارہ بجے رات تک قانونی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ میں پڑی سویا کرتی تھی۔ وہ موکلوں سے معاملہ مقدمہ کی باتیں کرتے تھے۔ میں باغیچہ اور بازاروں کی سیر کیا کرتی تھی۔ میں نے انہیں کسب دولت کا محض ایک آلہ سمجھ لیا۔ وہ کتنا چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ بیٹھوں اور باتیں کروں، لیکن میں بھاگتی تھی میں نے کبھی ان کے دل کے قریب جانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اپنے گھر میں چراغ نہ جلا کر دوسروں کے اجالے گھر کا لطف اٹھاتی رہی۔ تفریح کے سوا مجھے اور کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ اپنے جلے ہوئے دل کو یوں تسکین دے کر میں خوش تھی۔ کھیر اور ملائی کی تھالی مجھے کیوں نہ ملی۔ اس غم میں میں نے اپنی روٹیوں کو لات مار دی۔

آج رتن کو اس محبت کا کامل ثبوت ملا۔ جو مرنے والے کے دل میں تڑپتی رہتی تھی۔ رتن کے لئے تو زندگی میں پھر بھی کچھ دلچسپی تھی۔ ان کے لئے زندگی میں کونسا آرام تھا زندگی کیا ایک مستقل ریاضت تھی جس کا خاص مقصد تکمیل فرض تھا کیا وہ ایک لمحہ کے لئے بھی ان فکروں سے انہیں آزاد نہ کر سکتی تھی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ دلجوئی اور مزاج شناسی سے یہ بجھنے والا چراغ کچھ دن اور روشن رہتا۔ لیکن اس نے شوہر کے ساتھ اپنے فرض کا کبھی

خیال ہی نہ کیا۔ اس کا دل ہمیشہ بغاوت پر کمر بستہ رہا، محض اس لئے کہ ان سے میرا تعلق کیوں ہوا۔ رتن کا ضمیر اس وقت اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کے احساس سے پامال ہو رہا تھا۔ اس نے شوہر کے بے جان قدموں پر سر جھکا دیا اور بلک بلک کر رونے لگی۔ وہ سارے باغیانہ جذبات جو اس کے دل میں اٹھتے رہتے تھے وہ سارے ناہمدردانہ خیالات جنہیں وہ بار بار دبانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ اس وقت سینکڑوں بچھوؤں کی طرح ڈنگ مار رہے تھے ہائے میرا یہ برتاؤ اس آدمی کے ساتھ تھا جس نے اپنے تئیں مجھ پر قربان کر دیا۔ ان باتوں کو یاد کر کے اس کا دل پھٹا جاتا تھا۔ ان قدموں پر سر رکھے ہوئے اسے یہی آرزو ہوتی تھی کہ اسی وقت میری جان نکل جائے۔ ان قدموں کو اپنی پیشانی سے سہلاتے ہوئے آج اس کے دل میں کتنا ایثار دوڑ آتا تھا کہ گویا مدتوں کی اندوختہ دولت کو وہ آج ہی اسی وقت لٹا دے گی۔ موت کی نورانی ضیاء کے سامنے اس کے باطن کی ساری کدورتیں مٹ گئیں۔

وکیل صاحب کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن چہرے پر کسی جذبہ کے آثار نہ تھے۔ رتن کی بے خودی بھی ان کے بکھتے ہوئے ادراک کو روشن نہ کر سکتی تھی۔ شادی اور غم کی بندشوں سے وہ آزاد ہو گئے تھے۔ اور کوئی روئے غم نہیں، ہنسے تو خوشی نہیں۔ مٹیل نے اجمنی میں گنگا جل لے کر ان کے منہ میں ڈال دیا۔ آج انہوں نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ وہ جو رسوم اور معتقدات کا دشمن تھا اس وقت خاموش ہو گیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اس میں مذہبی اعتقاد رونما ہو گیا تھا بلکہ اس لئے کہ اس میں اب کوئی حس نہ تھا۔ اتنے ہی توکل سے وہ زہر کا گھونٹ بھی پی جاتا۔

انسانی حیات کا اہم ترین واقعہ کتنی خاموشی کے ساتھ ظہور پذیر ہو جاتا ہے وہ کائنات کا ایک رکن اعظم وہ تمناؤں کا طوفان سمندر، وہ سعی و عمل کا لافانی مخرج، وہ محبت اور حسد، خوشی اور رنج کا جولان گاہ۔ وہ عقل شعور کی رنگ بھوم نہ جانے کب اور کہاں غائب ہو جاتی ہے کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ ایک ہچکی بھی نہیں، ایک سانس بھی نہیں۔ ایک آہ

بھی نہیں نکلتی۔ سمندر کی موجوں کا کہاں خاتمہ ہوتا ہے۔ کون بتا سکتا ہے آواز فضا میں کہاں مدغم ہو جاتی ہے۔ کون جانتا ہے حیاتِ انسانی اس موج کے سوا۔ اس آواز کے سوا اور کیا ہے۔ اس کی تحلیل بھی اتنی پرسکون، اتنی ہی غیر محسوس ہو۔ کیا تعجب ہے عناصر کے معتقد پوچھتے ہیں کیا چیز نکل گئی۔ طبیعات کا معتقد کہتا ہے ایک خفیف سی چمک نکل جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے آنکھوں سے جان نکلی۔ کوئی منہ سے۔ کوئی ان سے پوچھے موجیں فنا ہوتے وقت کیا چمک اٹھتی ہیں۔ آواز غائب ہوتے وقت کیا مجسم ہو جاتی ہے۔ وہ فنا اس ابدی سفر کی محض ایک منزل ہے جہاں سفر کا خاتمہ نہیں بلکہ اس کی توسیع ہوتی ہے۔

کتنا حیرت انگیز انقلاب ہے۔ وہ جو مچھر کے ڈنک کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اب اسے چاہے مٹی میں دبا دو، خواہ آگ کی چتا پر رکھ دو۔ اس کی پیشانی پر شکن نہ آئے گی۔

ٹمیل نے وکیل صاحب کے منہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ بہو جی آیئے۔ مالک کو کھاٹ سے اتار دیں وہ چلے گئے۔

یہ کہہ کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔ آج اس کی تیس سال کی رفاقت ختم ہو گئی جس نے کبھی آدھی بات نہیں کہی۔ کبھی نوکر کے نہیں پکارا۔ وہ مالک اب اسے چھوڑے چلا جا رہا ہے۔

رتن ابھی تک کبیراج کا انتظار کر رہی تھی۔ ٹمیل کے منہ سے یہ الفاظ سن کر اسے دھکا سا لگا اس نے اٹھ کر وکیل صاحب کی چھاتی پر ہاتھ رکھا۔ ساٹھ سال کی مسلسل حرکت کے بعد وہ اس وقت خاموش تھی۔ رتن کو پھر پیشانی پر ہاتھ رکھنے کی ہمت نہ پڑی۔ اس جسم کو چھوتے ہوئے اس بے جان چہرہ کی طرف تاکتے ہوئے اسے کچھ احتراز ہو رہا تھا جو اشکراہ سے مشابہ تھا۔ ابھی جن قدموں پر سر رکھ کر وہ روتی تھی اسے چھوتے ہوئے انگلیاں کٹی سی جاتی تھیں۔ رشتۂ حیات اتنا نازک ہے اس نے ایسا کبھی نہ سمجھا تھا۔

ایک لمحہ کے بعد ٹمیل نے کہا۔ بہو جی اب کیا دیکھتی ہو۔ کھاٹ کے نیچے اتار دو۔ جو

ہونا تھا ہو گیا۔

اس نے بیر پکڑا۔ رتن نے سر پکڑا اور لاش کو نیچے لٹا دیا۔ تب وہیں زمین پر بیٹھ کر رتن رونے لگی۔ اس لئے نہیں کہ دنیا میں اب کوئی اس کا دستگیر نہ تھا بلکہ اس لئے کہ وہ اس کے ساتھ اپنا فرض پورا نہ کر سکی۔

اسی وقت موٹر کی آواز آئی اور کبیراج نے کمرہ میں قدم رکھا۔

شاید اب بھی رتن کے دل میں اُمید کی کوئی بجھتی ہوئی چنگاری چھپی پڑی تھی۔ اس نے فوراً آنکھیں پونچھ ڈالیں، سر کا آنچل سنبھال لیا۔ اُلجھے ہوئے بال سمیٹ لئے اور کھڑی ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر کبیراج سے کچھ پوچھتے ہوئے اس کی روح کانپ رہی تھی۔

نورِ سحر نے آسمان کو اپنی سنہری کرنوں سے رنگین کر دیا تھا۔ کیا اس وجود کی خیر مقدم کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

(۳۱)

اسی دن لاش کاشی لائی گئی۔ وکیل صاحب کے ایک بھتیجے مالوہ میں رہتے تھے انہیں تار دے کر بلایا گیا۔ آخری مراسم انہوں نے ادا کئے۔

جالپا آجکل سارے دن رتن کے پاس بیٹھی رہتی تھی۔ بدنصیب رتن کو نہ گھر بار کی سُدھ تھی نہ کھانے پینے کی۔ روز ہی کوئی نہ کوئی ایسی بات یاد آجاتی جس سے رونے کا ایک بہانہ مل جاتا۔ شوہر کے ساتھ اس کے جو فرائض تھے اس کے ایک حصّے کی بھی اس نے تعمیل کی ہوتی۔ تو اسے تسکین ہوتی۔ اپنی بیدردی، اپنی ناقدر شناسی، اپنی آرائش پسندی کے چرچے کرکے ہی وہ اپنے ضمیر کو تشفی دیتی تھی۔ جب تک اس کی زندگی کے دروازے پر ایک محافظ بیٹھا ہوا تھا اُسے کسی کُتّے بلی یا چور کا اندیشہ نہ تھا۔ لیکن اب دروازہ پر کوئی محافظ نہ تھا۔ اس لئے وہ ہشیار رہتی تھی۔ شوہر کا ذکر خیر کرتی رہتی تھی۔ گزر بسر کیسے ہوگی۔ نوکروں چاکروں میں کس کس

کا جواب دینا ہوگا۔ گھر کے کون کون سے خرچ کم کرنے کی ضرورت ہے۔ ان مسئلوں کے متعلق کوئی گفتگو ہی نہ ہوتی۔ گویا یہ فکر مرنے والے کی روح کے ساتھ بے وفائی ہوگی۔ کھانا صاف کپڑا پہننا اور کچھ پڑھ کر دل بہلانا بھی اُسے غیر مناسب سا معلوم ہوتا تھا۔ شرادھ کے دن اس نے اپنے سارے کپڑے اور زیور مہا براہمن کو دے ڈالے۔ ان چیزوں کی اب اسے کیا ضرورت ہے۔ اس کے برعکس شوہر کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو ان کی نشانی سمجھ کر وہ دیکھتی بھالتی رہتی تھی۔ اس کا مزاج اتنا متحمل ہوگیا تھا کہ کتنا ہی بڑا نقصان ہو جائے اسے غصہ نہ آتا تھا ٹمیل کے ہاتھ سے چائے کا سیٹ چھوٹ کر گر پڑا۔ لیکن رتن جبیں بہ جبیں بھی نہیں ہوئی۔ پہلے ایک دوات ٹوٹ جانے پر اس نے ٹمیل کو اس بُری طرح ڈانٹ بتائی تھی، مگر آج اس سے کئی گنے بڑے نقصان پر اس نے زبان تک نہ کھولی۔

وکیل صاحب کے بھتیجے کا نام تھا منی بھوشن۔ بڑا ملنسار خوش مزاج اور کارگزار اسی ایک مہینہ میں اس نے صدہا دوست بنا لئے۔ شہر میں جن جن وکیلوں اور رئیسوں سے وکیل صاحب کا یارانہ تھا۔ ان سبھی نے ایسا میل جول بڑھایا ایسی بے تکلفی پیدا کی کہ رتن کو خبر تک نہ ہوئی۔ اور اس نے بینک کا لین دین اپنے نام سے شروع کر دیا۔ الٰہ آباد بینک میں وکیل صاحب کے پچیس ہزار روپے جمع تھے ان پر تو اس نے قبضہ کر ہی لیا۔ مکانوں کے کرایہ بھی خود ہی وصول کرنے لگا۔ مواضعات کی تحصیل بھی شروع کر دی۔ گویا رتن سے کوئی مطلب ہی نہیں۔

ایک دن ٹمیل نے رتن سے آکر کہا۔ بہوجی جانے والا تو چلا گیا اب گھر بار کی بھی کچھ خبر لیجئے۔ میں نے سنا ہے بھیا نے بینک کا سب حساب اپنے نام کر لیا۔

رتن نے اس کی طرف ایسی غضبناک آنکھوں سے دیکھا کہ پھر اُسے کچھ کہنے کی ضرورت نہ ہوئی۔ اسی دن شام کو منی بھوشن نے ٹمیل کو نکال دیا۔ چوری کا الزام لگا کر نکالا جس میں رتن کچھ کہہ بھی نہ سکے۔

اب صرف مہراج رہ گئے۔ انہیں منی بھوشن نے بھنگ پلا پلا کر ایسا ملا یا کہ وہ انہیں کا دم بھرنے لگے۔ مہری سے کہتے بابو جی نے ٹراریسانہ مزاج پایا ہے کوئی چیز لاؤ کبھی نہیں پوچھتے۔ کتنے کولائے بڑوں کے گھروں میں بڑے ہی پیدا ہوتے ہیں، بہو جی تو بال کی کھال نکالتی رہتی تھیں۔ مہری کا منہ پہلے ہی سی دیا گیا تھا۔ اس کے ڈھلے ہوئے حسن پر نئے مالک غیر معمولی طور پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ وہ کسی نہ کسی بہانہ سے باہر کے دیوان خانہ میں ہی منڈلایا کرتی۔ رتن کو ذرا بھی خبر نہ تھی، کس طرح اس کے خلاف قلعہ بندی ہو رہی ہے۔

ایک دن منی بھوشن نے رتن سے کہا۔ اب تو مجھے یہاں رہنا فضول معلوم ہوتا ہے میں سوچتا ہوں آپ کو لے کر گھر چلا جاؤں، وہاں آپ کی بہو آپ کی خدمت کرے گی بال بچوں میں جی بہل جائے گا۔ اور خرچ بھی کم ہو جائیگا۔ آپ کہیں تو یہ بنگلہ بیع کر دوں، اچھے دام اٹھیں گے۔

رتن اس طرح چونکی گویا کسی نے اسے جھنجوڑ کر جگا یا ہو۔ بولی۔ کیا مجھ سے کچھ کہہ رہے ہو۔

منی بھوشن۔ جی ہاں کہہ رہا تھا کہ اب ہم لوگوں کو یہاں رہنا فضول ہے۔ اب تو یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔

رتن نے بے دلی سے کہا۔ ہاں اچھا تو ہو گا۔

منی۔ کاکا جی نے کوئی وصیت لکھی ہو۔ لایئے دیکھوں۔ ان کی مرضی ہمارے لئے مقدم ہے۔

رتن نے اسی طرح آسمان پر بیٹھے ہوئے گویا دنیا کی باتوں سے اُسے کوئی علاقہ نہیں ہے جواب دیا۔ وصیت تو نہیں لکھی اور اس کی ضرورت بھی کیا تھی؟

منی بھوشن نے پھر پوچھا۔ شاید کہیں لکھ کر رکھ گئے ہوں۔

منی بھوشن نے دل میں خوش ہو کر کہا۔ میری خواہش ہے کہ ان کی کوئی یادگار بنوادی

جائے۔

رتن نے خوش ہو کر کہا۔ میں بھی چاہتی ہوں۔

منی۔ گاؤں کی آمدنی کوئی تین ہزار روپیہ سال کی ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہے اتنا ہی وہ سال بھر میں خیرات کرتے تھے۔ دو ڈھائی سو سے کہیں مہینہ میں کم نہ ہوتا تھا۔ میری تجویز ہے کہ وہ ساری مدیں جیوں کی تیوں قائم رہیں۔

رتن نے اسی لہجہ میں کہا۔ ہاں اور کیا۔

منی۔ تو گاؤں کی آمدنی تو خیراتی کاموں کے لئے وقف کر دی جائے۔ مکانوں کا کرایہ کوئی دو سو روپیہ ماہوار ہے۔ اس سے ان کے نام پر ایک چھوٹی سی سنسکرت پاٹھ شالہ کھول دی جائے۔

رتن۔ بہت اچھا ہوگا۔

اور یہ بنگلہ بیچ دیا جائے۔ اس روپیہ کو بینک میں رکھدیا جائے۔

رتن۔ بہت اچھا ہوگا۔ مجھے روپے پیسے کی اب کیا ضرورت ہے۔

منی۔ آپ کی خدمت کے لئے تو ہم سب حاضر ہی ہیں۔ موٹر بھی نکال دی جائے۔ ابھی سے یہ انتظام ہوگا تو جاکر کہیں دو تین مہینے میں فرصت ملے گی۔

رتن نے لاپروائی سے کہا۔ ابھی جلدی کیا ہے۔ کچھ روپیہ بینک میں تو ہے۔

منی۔ بینک میں روپے تھے مگر مہینہ بھر سے خرچ بھی تو ہو رہے ہیں۔ ہزار پانچ سو پڑے ہوں گے۔ یہاں تو روپے پیسے ہوا میں اڑ جاتے ہیں۔ مجھ سے تو یہاں ایک مہینہ بھی نہ رہا جائے۔ موٹر کو بھی جلد ہی نکال دینا چاہیئے۔

رتن نے اس کے جواب میں بھی کہا اچھا تو ہوگا۔ وہ اس دماغی تعطل کی حالت میں تھی، جب انسان کو چھوٹے چھوٹے کام بھی اسو جھ معلوم ہونے لگتے ہیں منی بھوشن کی کارپردازیوں نے اسے ممنون کر دیا تھا۔ اس وقت اس کے ساتھ جو شخص تھوڑی سی

ہمدردی ظاہر کر دیتا۔ اسی کو وہ اپنا خیر خواہ سمجھنے لگتی۔ رنج و محن نے اس کے دل کو اتنا نازک اور نرم بنا دیا تھا کہ اس پر کوئی نقش بھی آسانی سے جم سکتا تھا۔ اس وقت سبھی اسے اپنے نظر آتے تھے۔ اسے کسی پر شبہ نہ تھا۔ کسی سے مطلق خوف نہ تھا۔ شاید کوئی چور بھی اس کے سامنے اس کا مال و متاع اٹھائے جاتا تو وہ شور نہ مچاتی۔

(٣٢)

تیرھویں کے بعد جالپا نے رتن کے گھر آنا جانا کم کر دیا تھا۔ صرف ایک بار گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے چلی جایا کرتی تھی۔ ادھر کئی دنوں سے منشی دیا ناتھ کو بخار آنے لگا تھا۔ انہیں بخار ہی چھوڑ کر کیسے جاتی۔ منشی جی کو ذرا بھی بخار آجاتا تو وہ بک جھک کرنے لگتے تھے۔ کبھی گاتے کبھی روتے۔ کبھی موت کے فرشتوں کو اپنے سامنے ناچتے دیکھتے۔ ان کا جی چاہتا کہ سارا گھر میرے پاس بیٹھا رہے۔ بلکہ رشتہ داروں کو بھی بلا لیا جائے تاکہ وہ سب سے آخری ملاقات کر لیں۔ کیونکہ اس بیماری سے بچنے کی انہیں کوئی امید نہ تھی۔ رامیشری اور سب کچھ کر سکتی تھی مگر ہرزہ سرائیاں نہ سُن سکتی تھی۔ جیوں ہی وہ رونے لگتے وہ کمرے سے نکل جاتی اسے آسیب کا اندیشہ تھا۔

منشی جی کے کمرے میں کئی اخباروں کے فائل تھے یہی انہیں ایک شوق تھا جالپا کا جی وہاں بیٹھے بیٹھے گھبرانے لگتا تو ان فائلوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتی۔ ایک دن اس نے ایک پرانے اخبار میں ایک شطرنج کا نقشہ دیکھا جسے حل کر دینے کے لئے کسی رئیس نے انعام دے رکھا تھا اسے خیال آیا کہ جس طاق پر رما ناتھ کی بساط اور مہرے رکھے ہوئے ہیں اسی پر ایک کتاب میں نقشے بھی دئے ہوئے ہیں۔ وہ فوراً دوڑتی اوپر گئی اور کتاب اٹھا لائی۔ یہ نقشہ اسی کتاب میں موجود تھا اور نقشہ ہی نہ تھا اس کا حل بھی دیا ہوا تھا۔ معاً جالپا کو یہ خیال پیدا ہوا، اس نقشہ کو کسی اخبار میں چھپوا دوں تو کیسا ہو۔ شاید رما ناتھ کی

نگاہ اس پر پڑ جائے۔ یہ نقشہ اتنا آسان تو نہیں ہے کہ آسانی سے حل ہو جائے۔ اس نے سوچا اس شہر میں جب ان کا ثانی کوئی نہیں ہے تو ایسے لوگوں کی تعداد بہت نہیں ہو سکتی۔ جو یہ نقشہ حل کر سکیں۔ کچھ بھی ہو جب رمانا تھ نے یہ نقشہ حل کیا ہے تو یقیناً وہ اسے پھر حل کر لیں گے جو لوگ پہلی بار دیکھیں گے انہیں سوچتے دو ایک دن ضرور لگ جائیں گے۔ جالپا نے اس نقشہ کو حل کرنے کے لئے کچھ انعام مقرر کر دینے کا فیصلہ کیا۔ جا تو ہے ہی انہیں روپے نہ ملیں تاہم اتنا تو ممکن ہے ہی کہ حل کرنے والوں میں ان کا نام بھی ہو۔ اس طرح کچھ پتہ لگ جائیگا۔ کچھ بھی نہ ہو روپے ہی تو جائیں گے۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ آج رتن سے نہ مل سکی۔ رتن دن بھر تو اس کی راہ دیکھتی رہی۔ جب وہ شام کو بھی نہ گئی تو اس سے رہا نہ گیا۔ آج وہ شوہر کی وفات کے بعد پہلی بار گھر سے نکلی ہے۔ اسے تیز موٹر چلانے کی دھن تھی۔ لیکن آج موٹر کی رفتار تانگے سے بھی سست تھی۔ ایک بڑھیا کو سڑک کے کنارے بیٹھے دیکھ کر اپنی موٹر کو روک دیا اور اسے چار آنے کے پیسے دے دیئے اور آگے بڑھی تو دو کانسٹبل ایک قیدی کو لئے جا رہے تھے اس نے موٹر روک کر ایک کانسٹبل کو بلایا اور اسے ایک روپیہ دے کر کہا۔ اس قیدی کو مٹھائی کھلا دینا۔ کانسٹبل نے سلام کر کے روپیہ لے لیا۔ آج کسی خوش نصیب کا منہ دیکھ کر اٹھا تھا۔ جالپا نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ معاف کرنا بہن! آج میں نہ آسکی۔ دادا کو کئی دن سے بخار آ رہا ہے۔

رتن نے منشی جی کے کمرے کی طرف قدم اٹھایا اور پوچھا۔ وہیں ہیں نا۔ تم نے مجھ سے نہیں کہا۔

منشی جی کا بخار اس وقت کچھ اترا ہوا تھا۔ رتن کو دیکھ کر بولے۔ بہت رنج ہوا۔ دیوی جی، مگر یہ تو دنیا ہے آج ایک کی باری ہے کل دوسرے کی باری ہے۔ چل چلاؤ لگا ہوا ہے اب میں بھی چلا۔ اب نہیں بچ سکتا۔ بڑی پیاس ہے جیسے سینے میں کوئی

بھٹی جل رہی ہو۔ پھنکا جاتا ہوں کوئی اپنا نہیں ہوتا دیبی جی! دنیا کے ناتے سب غرض کے ناتے ہیں۔ آدمی ہاتھ پسارے اکیلا ایک دن چلا جاتا ہے۔ رما ہوتا تو آج ایک چلو پانی تو دیتا دو لونڈے ہیں انہیں کوئی فکر ہی نہیں۔ میں مروں یا جیوں یہاں بیٹھتے دونوں کا دم گھٹتا ہے۔ آپ سے یہ آخری ملاقات ہے۔

رتن نے تشفی دی۔ یہ ملیریا ہے لالہ جی! دو چار دن میں آپ اچھے ہو جائیں گے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔

منشی جی نے بیکسانہ انداز سے کہا۔ بیٹھ جایئے دیوی جی، آپ کی دعا ہے تو شاید بچ جاؤں لیکن مجھے تو امید نہیں ہے۔ میں بھی ٹال ٹھونک کر جم راج سے لڑنے کو تیار بیٹھا ہوں۔ اسی طرح وہاں بھی کچہریاں ہیں حاکم ہیں۔ راجہ ہیں پرجا ہیں۔ تقریریں ہوتی ہیں۔ اخبار نکلتے ہیں پھر کیا فکر ہے وہاں بھی ایڈیٹر ہو جاؤں گا۔

رتن کو ایسی ہنسی چھوٹی کہ وہاں کھڑی نہ رہ سکی۔ منشی جی مذاق میں یہ باتیں نہیں کر رہے تھے ان کا لب و لہجہ نہایت درجہ متین تھا۔ آج ڈیڑھ دو مہینہ کے بعد رتن کو ہنسی آئی اور اس بے موقعہ ہنسی کو چھپانے کے لئے وہ کمرے سے نکل گئی۔ اس کے ساتھ جالپا بھی باہر آ گئی۔

رتن نے معذرت آمیز لہجہ میں کہا۔ دادا جی نے دل میں کیا سمجھا ہوگا سوچتے ہوں گے میں تو جان سے مر رہا ہوں اور اسے ہنسی سوجھتی ہے اب وہاں نہ جاؤں گی۔ نہیں ایسی بات پھر کہیں تو میری ہنسی نہ رکے گی۔ دیکھو تو آج کتنی بے موقع ہنسی آئی ہے۔

جالپا نے اس کے دلی جذبات کو تاڑ کر کہا۔ مجھے بھی اکثر ان کی باتوں پر ہنسی آ جاتی ہے۔ اس وقت ان کا بخار کچھ ہلکا ہے۔ جب بخار زوروں پر ہوتا ہے تو یہ اور بھی اول فول بکتے ہیں۔ اس وقت ہنسی روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آج سویرے کہنے لگے میرا پیٹ

مہک ہو گیا، میرا بیٹا مہک ہو گیا۔ اس کی رٹ لگا دی۔ اس کا مطلب کیا تھا، نہ میں سمجھ سکی نہ اماں سمجھ سکیں، مگر وہ برابر یہی رٹے جا رہے تھے آؤ کمرے ہی چلیں۔

رنن ۔ میرے ساتھ نہ چلو گی۔

آج تو نہ چل سکوں گی۔

کل آؤں گی۔

کہہ نہیں سکتی دادا کی طبیعت اچھی رہی تو آؤں گی۔

نہیں بھائی ضرور آنا۔ تم سے ایک صلاح کرنا ہے۔

کیا صلاح ہے۔

منی کہتے ہیں یہاں رہنا اب فضول ہے۔ ان کی صلاح ہے بنگلہ بیچ دیا جائے، اور ہم لوگ مالوہ چلے جائیں۔

جالپا تعجب سے بولی۔ یہ تو تم نے بُری خبر سنائی بہن۔ مجھے اس حالت میں چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔ میں نہ جانے دوں گی منی سے کہہ دو بنگلہ بیچ دیں، مگر جب تک بابوجی کا پتہ نہ لگ جائے میں تمہیں نہ جانے دوں گی۔ تم کل ایک ہفتہ باہر رہیں مجھے ایک ایک پل پہاڑ ہو گیا۔ اب تو شاید میں ہی مر جاؤں۔ نہیں بہن تمہارے پیروں پڑتی ہوں ابھی جانے کا نام نہ لو۔

رنن بھی آبدیدہ ہو کر بولی۔ مجھ سے بھی وہاں نہ رہا جائے گا، سچ کہتی ہوں تو منی سے کہہ دوں گی مجھے نہیں جانا ہے، جالپا اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے کمرے میں لے گئی۔ اور اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر طفلانہ انداز سے بولی۔ قسم کھاؤ کہ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ گی۔

رنن نے اُسے آغوش میں لے کر کہا۔ لو قسم کھاتی ہوں نہ جاؤں گی۔ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ میرے لئے وہاں کیا رکھا ہے بنگلہ بھی کیوں بیچوں، دو ڈھائی سو مکانوں کا کرایہ ہے۔ ہم دونوں کے گزارے کے لئے کافی ہے۔ میں ابھی منی سے

کہہ دوں گی۔

دفعتہً فرش پر مہرے اور شطرنج کے نقشہ کو دیکھ کر پوچھا۔ یہ شطرنج کس کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔

جالپا نے شطرنج کے نقشہ پر اپنی تقدیر کا پانسہ پھینکنے کی جو تجویز سوچی تھی وہ اسے کہہ سنائی۔ دل میں ڈر رہی تھی کہ رتن کہیں اس تجویز کو پاگل پن نہ خیال کرے۔ لیکن رتن سنتے ہی باغ باغ ہو گئی بولی۔ دس روپے کا انعام تو بہت کم ہے پچاس روپے کر دو۔ روپے میں دیتی ہوں۔

جالپا نے اعتراض کیا۔ تب تو بڑے بڑے شطرنج باز میدان میں آجائیں گے۔

رتن رکوئی مضائقہ نہیں بابوجی کی نگاہ پڑ گئی تو وہ اسے ضرور حل کرلیں گے اور مجھے امید ہے سب سے پہلے انہی کا نام آوے گا۔ کچھ نہ ہوگا تو پتہ تو لگ ہی جائے گا۔ تم نے بڑی اچھی تدبیر سوچ نکالی۔

جالپا نے پوچھا تو تمہیں امید ہے۔

پوری۔ میں کل سویرے روپے لے کر آؤں گی۔

تو میں آج خط لکھ رکھوں گی۔ کسی مشہور اخبار میں بھیجنا چاہیئے۔

کلکتہ میں تو زیادہ تر لوگ بشومتر ہی پڑھتے نظر آتے تھے۔

اسی وقت منشی جی پکار اٹھے۔ بہو! بہو!

جالپا تو لپکی ہوئی ان کے کمرے کی طرف چلی۔ رتن باہر جا رہی تھی کہ جاگیشری پنکھا جھلتی نظر آئی۔ رتن نے پوچھا تمہیں گرمی لگ رہی ہے اماں جی! میں تو مارے سردی کے کانپ رہی ہوں۔ ارے تمہارے پاؤں میں یہ کیا سفید لگا ہوا ہے؟ کیا آٹا پیس رہی تھیں۔

جاگیشری نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ہاں۔ وید جی نے انہیں ہاتھ کے آٹے کی روٹی کھانے کو

کہا ہے بازار میں ہاتھ کا آٹا کہاں میسر۔ محلہ میں کوئی پیسنہری نہیں ملتی۔ مزدور نیں تک چکی میں آٹا پسوا لیتی ہیں۔ کوئی ملتی ہی نہیں۔

رتن نے تعجب سے پوچھا۔ تم سے چکی چل جاتی ہے۔

جاگیشری مسکرا کر بولی۔ کون بہت سا گیہوں تھا۔ پاؤ بھر تو دونوں وقت کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ ایک لقمہ بھی نہیں کھاتے۔ بہو پیسنے جا رہی تھی مگر پھر مجھے ان کے پاس بیٹھنا پڑتا۔ مجھے رات چکی پینا منظور ہے۔ ان کے پاس گھنٹے بھر بیٹھنا منظور نہیں۔ رتن جا کر جانت کے پاس ایک منٹ کھڑی رہی پھر مسکرا کر مانجی پر بیٹھ گئی اور بولی تم سے تو یہ جانت نہ چلتا ہوگا۔ ماں لاؤ تھوڑا سا گیہوں مجھے دو، دیکھوں تو۔

جاگیشری نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ارے نہیں بہو۔ تم کیا پیسو گی چلو یہاں سے۔

رتن نے اپنی قابلیت کا ثبوت دیا۔ میں نے بہت دنوں تک پیسا ہے اماں۔ جب اپنے گھر تھی تو روز پیستی تھی لاؤ تھوڑا سا گیہوں دو۔

ہاتھ دکھنے لگے گا۔ چھالے پڑ جائیں گے۔

کچھ نہیں ہوگا اماں جی! آپ گیہوں تو لائیے۔

جاگیشری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کر کے کہا۔ گیہوں گھر میں نہیں ہے۔ اب اس وقت بازار سے کون لا دے۔ رتن کو اعتبار نہ آیا۔ بولی۔ اچھا چلئے میں آپ کے بھنڈارے میں دیکھوں ہوگا کیسے نہیں۔

رسوئی کی بغل والی کوٹھری میں کھانے کا سامان رہتا تھا۔ رتن اندر چلی گئی اور ہانڈیوں میں ٹٹول کر دیکھنے لگی۔ ایک ہانڈی میں گیہوں نکل آئے خوش ہو کر بولی۔ دیکھو اماں نکلے کہ نہیں۔ تم مجھ سے بہانہ کر رہی تھیں۔

اس نے ایک ڈلیا میں تھوڑے سے گیہوں نکال لئے اور خوش خوش جانت پر جا کر پیسنے لگی۔ جاگیشری نے جا کر جالپا سے کہا۔ بہو وہ جانت پر بیٹھی گیہوں پیس رہی

ہے اٹھاتی ہوں اٹھتی ہی نہیں، کوئی دیکھ لے تو کیا کہے۔

جا لیلا نے منشی جی کے کمرے سے نکل کر ساس کی پریشانی کا مزہ اٹھانے کے لئے کہا۔ یہ تم نے کیا غضب کیا۔ اماں سچ مچ کوئی دیکھ لے تو ناک ہی کٹ جائے چلئے دیکھوں۔

جاگیشری نے مجبوری انداز سے کہا۔ میں تو سمجھا کے ہار گئی مانتی ہی نہیں۔

جا لیلا نے جا کر دیکھا تو رتن گیہوں پیسنے میں مگن تھی۔ تفریح کی فطری مسرت سے اس کا چہرہ شگفتہ ہو رہا تھا۔ اتنی ہی دیر میں اس کے ماتھے پر پسینہ کی بوندیں آ گئی تھیں۔ اس کے مضبوط ہاتھوں میں جانت لٹو کی طرح ناچ رہی تھی۔

جا لیلا نے ہنس کر کہا۔ اوری آٹا مہین ہو، ورنہ پیسے نہ ملیں گے۔

رتن کو سنائی نہ دیا۔ بہروں کی طرح اس کے منہ کی طرف تاک کر مسکرائی۔ جا لیلا نے اور زور سے کہا۔ آٹا خوب مہین پیسنا نہیں تو پیسے نہ ملیں گے۔

رتن نے بھی ہنس کر کہا۔ جتنا مہین کہئے اتنا مہین پیس دوں بہو جی۔ پیسائی اچھی ملنی چاہیئے۔

جا لیلا۔ دھیلے سیر۔

رتن۔ دھیلی سیر سہی۔

منہ دھو آؤ۔ دھیلے سیر ملے گی۔

میں یہ سب پیس کر اٹھوں گی تم یہاں کھڑی رہو۔

آجاؤں میں بھی پسوا دوں۔

جی چاہتا ہے کوئی جانت کا گیت گاؤں۔

جا لیلا نے جاگیشری کو منشی جی کے کمرے میں بھیج دیا اور جانت پر جا بیٹھی۔ دونوں سہیلیاں یہ گیت گانے لگیں۔

موہے جوگن بنا کے کہاں گئے رے جوگیا

دونوں کے گلے میں لوتیج نما جانت کا گھنگر، گھنگران کے گیت پر ساز کا کام دے رہا تھا۔ جب دونوں ایک کڑی گاکر خاموش ہو جاتیں تو جانت کی آواز گویا گیت کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر اور بھی دلکش ہو جاتی تھی۔ دونوں کے دل اسوقت مسرتِ حیات کے فطری سرور سے پر تھے نہ غم کا بوجھ تھا نہ فراق کی کشش۔ گویا دو چڑیاں طلوع سحر کی کیفیتوں سے مست ہو کر چہک رہی تھیں۔

(۳۳)

رمانا تھ کی چائے کی دکان کھل تو گئی مگر صرف رات کو کھلتی تھی۔ رات کو بھی زیادہ تر دیبی دین ہی دکان پر بیٹھتا لیکن بکری اچھی ہو جاتی تھی۔ پہلے دن تین روپے کے پیسے آئے دوسرے دن چار پانچ روپے کا اوسط پڑنے لگا۔ چائے اتنی لذیذ ہوتی تھی کہ جو ایک بار یہاں چائے پی لیتا پھر دوسری دکان پر نہ جاتا۔ رمانے کچھ تفریح کا سامان بھی جمع کر دیا چراغ جلنے کے بعد سبزی کی بکری زیادہ نہ ہوتی تھی وہ ان ٹوکروں کو اٹھا کر اندر رکھ دیتا اور برآمدے میں میز لگا دیتا۔ اس پر تاش کا سٹ رکھ دیتا دو روزانہ اخبار بھی منگانے لگا۔ دکان چلنے لگی۔

ان چار پانچ مہینوں کے افلاس نے رما کے ذوق تن پروری کو اور بھی تیز کر دیا تھا جب تک روپے نہ تھے وہ مجبور تھا روپے ہاتھ میں آتے ہی سیر و تفریح کا جنون سر پر سوار ہو گیا۔ سینما کی بھی یاد آئی۔ روزمرہ کی جن ضروریات کو وہ اب تک ٹالتا آتا تھا خریدی جانے لگیں۔ دیبی دین کے لئے ایک خوشنما ریشمی چادر لایا۔ جگو کے سر میں اکثر درد ہوتا رہتا تھا ایک دن تیل کی خوشبودار دو شیشیاں لا کر دے دیں۔ دونوں نہال ہو گئے۔ اب بڑھیا کبھی اپنے سر پر بوجھ لادتی تو اسے ڈانٹتا۔ اب تو میں بھی چار پیسے کمانے لگا ہوں اب تو کیوں جان دیتی ہے۔ اگر پھر کبھی تیرے سر پر ٹوکری دیکھی تو کہے دیتا ہوں دکان اٹھا کر

پھینک دونگا۔ بڑھیا لڑکے کی یہ ڈانٹ سُن کر باغ باغ ہوجاتی۔ منڈی سے بوجھ لاتی تو پہلے چپکے سے دیکھتی، رما دکان پر تو نہیں ہے اگر وہ بیٹھا ہوتا تو کسی قلی کو ایک دو پیسے دے کر اس کے سر پر رکھ دیتی۔ وہ نہ ہوتا تو لپکی ہوئی آتی اور جلدی سے بوجھ اتار کر اطمینان سے بیٹھ جاتی۔ تاکہ رما بھانپ نہ سکے۔

ایک دن منور ما تھیٹر میں آغا حشر کا کوئی نیا ڈرامہ آنے والا تھا۔ اس ڈرامہ کی بڑی دھوم دھام تھی۔ ایک دن پہلے ہی سے لوگ اپنی اپنی جگہیں رزرو کرا رہے تھے۔ رما کو بھی اپنی جگہ رزرو کرانے کی دھن سوار ہوئی۔ سوچا کہیں رات کو ٹکٹ نہ ملا تو ٹاپتے ہی رہ جائیں گے۔ یہ اشتیاق پولیس کے خوف پر بھی غالب آگیا ایسی آفت نہیں آئی ہے کہ گھر سے نکلتے ہی پولیس گرفتار کرے۔ دن کو نہ سہی رات کو نکلنا ہی ہوں۔ پولیس چاہتی تو کیا رات کو نہ گرفتار کر لیتی۔ پھر میرا وہ علیہ بھی نہیں رہا۔ تبدیل ہیئت کے لئے پگڑی کافی ہے، یوں دل کو سمجھا کر وہ دس بجے گھر سے نکلا۔ دیبی دین کہیں گیا ہوا تھا بڑھیا نے پوچھا، کہاں جاتے ہو بیٹا!

رما نے کہا۔ کہیں نہیں ابھی آتا ہوں۔

رما سڑک پر آیا تو اس کی ہمت برف کی طرح پگھلنے لگی۔ قدم قدم پر یہ خوف ہوتا تھا کوئی کانسٹیبل نہ آ رہا ہو۔ اُسے یقین تھا کہ پولیس کا ایک ایک چوکیدار بھی اس کا حلیہ پہچانتا ہے اس لئے وہ سر نیچے جھکائے چل رہا تھا۔ دفعتہً اسے خیال آیا خفیہ پولیس کے جاسوس سادہ لباس میں ادھر اُدھر گھوما کرتے ہیں۔ کون جانے جو آدمی میری بغل میں آرہا ہے کوئی جاسوس ہی ہو۔ میری طرف کتنے غور سے دیکھ رہا ہے یوں سر جھکا کر چلنے ہی سے شاید اسے شبہ ہو رہا ہے یہاں اور سبھی آدمی سامنے دیکھ رہے ہیں کوئی یوں سر جھکا کر نہیں چل رہا ہے۔ موٹروں کی ریل پیل میں سر جھکا کر چلنا موت کو دعوت دینا ہے۔ پارک میں کوئی اس طرح چہل قدمی کرے تو کر سکتا ہے یہاں تو نگاہ سامنے ہونا چاہیئے

لیکن بغل والا آدمی ابھی تک میری ہی طرف تاک رہا ہے۔ ہے کوئی خفیہ ہی۔ رما اس کا ساتھ چھوڑنے کے لئے ایک تنبولی کی دکان پر پان کھانے لگا۔ وہ آدمی آگے نکل گیا رما نے آرام کی لمبی سانس لی۔

اب اس نے سر اٹھا لیا۔ اور دل مضبوط کرکے چلنے لگا۔ اس وقت ٹرام کا بھی کہیں پتہ نہ تھا۔ نہیں تو اس پر بیٹھ لیتا۔ تھوڑی ہی دور چلا ہوگا کہ اسے تین کانسٹبل پیچھے سے آتے دکھائی دیئے۔ اس نے سڑک چھوڑ دی اور پٹری پر چلنے لگا۔ خواہ مخواہ سانپ کے بل میں انگلی ڈالنا کونسی بہادری ہے مگر وائے نصیب تینوں کانسٹبلوں نے بھی سڑک چھوڑ دی اور پٹری لے لی۔ رما کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ دوسری پٹری پر جانا اس شبہ کو اور بھی طاقت پہنچائیگا۔ کوئی ایسی گلی بھی نہیں جس میں گھس جائے۔ اب تو سب بہت قریب آگئے کیا بات ہے کہ سب میری ہی طرف دیکھ رہے ہیں میں نے بڑی حماقت کی کہ یہ پگڑ باندھ لیا اور باندھا بھی کتنے بے تکے پن سے ایک ٹیلہ سا اوپر اُٹھ گیا ہے۔ یہ پگڑی آج مجھے پکڑا ئے گی ضرور باندھی تھی اس سے صورت بدل جائے گی۔ یہ الٹے اور تماشہ بن گئی۔ تینوں میری طرف دیکھ دیکھ کر آپس میں کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ شاید میرا حلیہ ملا رہے ہیں اب نہیں بچ سکتا۔ گھر والوں کو میری گرفتاری کی خبر ملے گی تو کتنے شرمندہ ہونگے۔ جا لیا تو رو رو کر جان دیدے گی پانچ سال سے کم سزا نہ ہوگی۔ بس زندگی کا خاتمہ ہی سمجھو۔

اس تخیل کا اس کے دل پر ایسا غلبہ ہوا کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ جب کانسٹبلوں کی جماعت قریب آگئی تو اس کا چہرہ خوف سے کچھ ایسا تبدیل ہو گیا آنکھوں میں کچھ ایسا خوف نمودار ہو گیا اور وہ کچھ اس طرح دوسرے آدمیوں کی آڑ تلاش کرنے لگا کہ عام آدمیوں کو اس پر شبہ ہونا قدرتی بات تھی۔ پھر پولیس والوں کی منجی ہوئی آنکھیں کیوں چوکتیں۔ ایک نے رما ناتھ کو للکارا۔ او جی۔ او پگڑی ذرا ادھر آنا۔ تمہارا نام کیا ہے!

رما ناتھ نے سینہ زوری کے انداز سے کہا۔ ہمارا نام پوچھ کر کیا کروگے۔ کیا میں چور

ہوں؟

چور نہیں۔ تم شاہ سہی، نام کیوں نہیں بتاتے؟

رمانے ایک لمحہ کے بعد سلی رنج کے ساتھ کہا۔ ہیرالال۔

گھر کہاں ہے۔

گھر۔

ہاں گھر ہی پوچھتے ہیں۔

شاہجہاں پور۔

کون محلہ؟

رما شاہجہاں پور نہ گیا تھا۔ نہ اتنی جرأت ہوئی کہ کوئی فرضی ہی نام بتا دے۔ دلیری سے بولا۔ تم تو گویا میرا حلیہ لکھ رہے ہو۔

کانسٹبل نے بھبکی دی۔ تمہارا حلیہ پہلے ہی لکھا ہوا ہے نام جھوٹ بتایا۔ سکونت جھوٹ بتائی۔ محلہ پوچھا تو بغلیں جھانکنے لگے۔ مہینوں سے تمہاری تلاش ہو رہی ہے۔ آج جا کر ملے ہو۔ چلو تھانے پر۔

یہ کہتے ہوئے اس نے رما کا ہاتھ پکڑ لیا رمانے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وارنٹ لاؤ تب میں چلونگا۔ کیا مجھے کوئی دیہاتی سمجھ لیا ہے۔

کانسٹبل نے اپنے ساتھی سے کہا۔ پکڑ لو جی ان کے ہاتھ، وہیں تھانے پر وارنٹ دکھایا جائے گا۔

شہروں میں وارداتیں مداری کے تماشے سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں۔ سینکڑوں آدمی جمع ہو گئے ندامت کا مارا دیبی دین اسی وقت افیم لے کر لوٹ رہا تھا۔ یہ مجمع دیکھ کر وہ بھی آ گیا۔ دیکھا کہ تین کانسٹبل رما ناتھ کو گھسیٹے ہوئے لئے جا رہے ہیں۔ آگے بڑھ کر بولا۔ ہائیں ہائیں جمعدار یہ کیا کرتے ہو۔ پنڈت جی تو ہمارے مہمان ہیں۔ انہیں کہاں

پکڑے لئے جاتے ہو۔

کانسٹبل دیبی کو پہچانتے تھے ایک نے پوچھا۔ تمہارے مہمان ہیں یہ کب سے؟

دیبی دین نے دل میں حساب لگا کر کہا۔ چار مہینے سے کچھ زیادہ ہی ہوئے ہونگے۔ مجھے پراگ راج میں مل گئے تھے رہنے والے بھی وہیں کے ہیں۔ میرے ساتھ ہی تو آئے تھے۔

کانسٹبل نے دل میں خوش ہو کر کہا۔ ان کا نام کیا ہے۔

دیبی دین نے سٹ پٹا کر کہا نام انہوں نے بتایا نہ ہوگا۔

کانسٹبلوں کا شبہ پختہ ہو گیا۔ ایک کانسٹبل نے آنکھیں نکال کر کہا۔ معلوم ہوتا ہے تم بھی ملے ہوئے ہو۔ ان کا نام کیوں نہیں بتلاتے۔

دیبی دین نے شبہ انگیز جسارت کے ساتھ کہا۔ مجھ سے رعب نہ جماؤ جمعدار سمجھے یہاں دھمکیوں میں نہیں آنے کے۔

دوسرے کانسٹبل نے گویا ثالث بن کر کہا۔ بوڑھے بابا تم خواہ مخواہ بگڑ رہے ہو ان کا نام کیوں نہیں بتا دیتے۔

دیبی دین نے خائف نظروں سے رما کی طرف دیکھ کر کہا۔ ہم لوگ تو رما ناتھ کہتے ہیں۔ اصلی نام کچھ اور ہے یا یہی ہم نہیں جانتے۔ کانسٹبل نے آنکھیں نکال کر کہا۔ بولو پنڈت جی کیا نام ہے تمہارا۔ رما ناتھ یا ہیرا لال یا دونوں۔ ایک گھر کا ایک سسرال کا۔

تیسرے کانسٹبل نے تماشائیوں کو مخاطب کر کے کہا۔ نام ہے رما ناتھ بتاتے ہیں ہیرا لال ہے۔ گھر الہ آباد بتاتے ہیں شاہجہاں پور۔ جرم ثابت ہو گیا۔

تماشائیوں میں کانا پھوسی ہونے لگی۔

شبہ کی بات تو ہے۔

صاف ہے نام اور پتہ دونوں غلط بتائے۔

ایک مارواڑی صاحب نے فرمایا۔ اچکّو سو ہے۔

ایک مولوی صاحب بولے۔ کوئی اشتہاری ملزم ہے۔

خلقت کو اپنا ہم خیال دیکھ کر سپاہیوں کو اور بھی زور ہو گیا۔ رما کو بھی اب ان کے ساتھ چپ چاپ چلے جانے ہی میں اپنی خیریت نظر آئی۔ اس طرح سر جھکا لیا گویا اُسے اس کی بالکل پرواہ نہیں ہے کہ اس پر لاٹھی پڑتی ہے یا تلوار۔ اتنا ذلیل وہ کبھی نہ ہوا تھا۔ جیل کا عذاب بھی شاید اتنا جان شکن نہ ہوتا۔

تھوڑی دیر میں تھانہ آ گیا تماشائیوں کا ہجوم بہت کم ہو گیا تھا۔ رما نے ایک بار پیچھے کی طرف شرم گیر توقع سے دیکھا۔ دیں دین کا پتہ نہ تھا رما کے منہ سے ایک لمبی سی سانس نکل گئی۔

(۳۴)

پولیس اسٹیشن کے دفتر میں اس وقت بڑی میز کے سامنے چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے ایک داروغہ تھے گورے رنگ کے شوقین۔ جن کی بڑی بڑی آنکھوں میں ہمدردی کی جھلک تھی ان کی بغل میں نائب داروغہ تھے یہ سکھ تھے بہت ہی ہنس مکھ زندہ دلی کے پُتلے گیہوں رنگ مضبوط اور متناسب اعضا سر پر کشش تھے۔ ہاتھوں میں کڑے لیکن سگار سگار سے پرہیز نہ کرتے تھے۔ میز کی دوسری طرف انسپکٹر اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بیٹھے تھے۔ انسپکٹر ادھیڑ۔ سانولہ لمبا آدمی تھا کوڑی کی سی آنکھیں۔ پھولے رخسارے اور ٹھنگنا قد۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ لانبا چھریرہ جوان تھا بہت ہی کم سخن اور ذی فہم۔

ڈپٹی نے سگار کا ایک کش لے کر کہا۔ باہری گواہوں سے کام نہیں چل سکے گا۔ ان میں سے کسی کو اپروور[1] بنانا ہوگا اور کوئی آلٹرنیٹو[2] نہیں ہے۔

---

[1] approver. [2] alternative.

انسپکٹر نے داروغہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ہم لوگوں نے کوئی بات اٹھا تو نہیں رکھی۔ از روئے حلف کہتا ہوں ہر قسم کا لالچ دے کر ہار گئے سبھوں نے ایسا گٹ کر رکھا ہے کہ کوئی ٹوٹتا ہی نہیں۔ ہم نے باہر کے گواہوں کو بھی آزمایا۔ مگر وہ سب کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔

ڈپٹی۔ اس مارواڑی کو پھر آزمانا ہوگا۔ اس کو بلا کر خوب دھمکائیے شاید اس کا کچھ دباؤ پڑے۔

انسپکٹر۔ از روئے حلف کہتا ہوں آج صبح ہی سے ہم لوگ یہی تدبیر کر رہے ہیں۔ بیچارہ باپ لڑکے کے پیروں پر گر پڑا۔ لیکن کسی طرح راضی نہیں ہوتا۔

کچھ دیر تک چاروں آدمی خاموش بیٹھے رہے۔ آخر ڈپٹی نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ مکدمہ نہیں چلنے سکتا۔ مکحمہ کا بدنامی ہوا۔

انسپکٹر۔ ایک ہفتہ کی مہلت اور دیجئے۔ شاید کوئی گواہ نکل آئے۔

یہ فیصلہ کرکے دونوں آدمی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ نائب داروغہ بھی ان کے ساتھ ہی چلے گئے۔ داروغہ جی نے حقہ منگوایا کہ دفعتاً ایک مسلمان سپاہی نے آکر کہا۔

حضور لائیے کچھ انعام دلوائیے۔ ایک ملزم کو شبہ پر گرفتار کیا ہے الہ آباد کا رہنے والا ہے رمانا تھ نام ہے پہلے نام اور سکونت غلط بتلائی تھی۔ دیپی دین کھٹک جو نکڑ پر رہتا نہیں ہے اسی کے یہاں ٹھہرا ہوا ہے ذرا ڈانٹ کر بتائیے گا تو سب کچھ اگل دے گا۔

داروغہ۔ دیپی دین وہی ہے نا جس کے دونوں لڑکے۔

سپاہی۔ جی ہاں۔ وہی ہے وہی۔

اتنے میں رمانا تھ بھی داروغہ کے سامنے حاضر کیا گیا۔ داروغہ نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ گویا دل میں اس کا حلیہ ملا رہے ہوں تب تیز نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ اچھا یہ الہ آباد کا رمانا تھ ہے خوب۔ ملے بھائی۔ خوب ملے۔ چھ مہینے سے

پریشان کر رہے ہو۔ کیسا صاف حلیہ ہے کہ اندھا بھی پہچان لے۔ یہاں کب سے آئے ؟
کانسٹبل نے رما کو صلاح دی۔ سارا حال سچ سچ بتا دو تو تمہارے ساتھ کوئی سختی نہ کی جائے گی۔

رما نے چہرہ کو بشاش بنا کر کہا۔ جناب اب تو آپ کے ہاتھ میں ہوں رعایت کیجئے یا سختی کیجئے۔ الہ آباد کی میونسپلٹی میں ملازم تھا حماقت کہیئے یا بدنصیبی رجنگی کے چار سو روپے مجھ سے خرچ ہو گئے۔ میں وقت پر روپے جمع نہ کر سکا۔ شرم کے مارے گھر والوں سے بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ نہیں تو اتنے روپے کا انتظام ہو جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ جب کچھ بس نہ چلا تو وہاں سے بھاگ کر یہاں چلا آیا۔ اس میں ایک حرف بھی غلط نہیں ہے۔

داروغہ نے چہرے کو متین بنا کر کہا۔ معاملہ کچھ سنگین ہے کچھ جوا کھیلتے تھے یا بیوی کے زیور بنوائے تھے۔

رما ابھی کچھ جواب نہ دینے پایا تھا کہ دیبی دین آکر کھڑا ہو گیا۔

داروغہ نے تند لہجہ میں پوچھا۔ کیا کام ہے یہاں ؟

دیبی۔ حجور کو سلام کرنے چلا آیا۔ ان بیچارے پر رحم کی نگاہ رکھیئے گا۔ بیچارے بڑے سیدھے آدمی ہیں۔

داروغہ۔ بچا سرکاری ملزم کو گھر میں چھپاتے ہو۔ اس پر سفارش کرنے آئے ہو۔

دیبی۔ میں کیا سفارش کرونگا حجور دو کوڑی کا آدمی ہوں۔

داروغہ۔ جانتا ہے ان پر وارنٹ ہے سرکاری روپے غبن کر گئے ہیں۔

دیبی۔ حجور بھول چوک آدمی ہی سے تو ہوتی ہے جوانی کی عمر ہے ہی۔ خرچ ہو گئے ہونگے۔

یہ کہتے ہوئے اس نے پانچ گنیاں نکال کر میز پر رکھ دیں۔

داروغہ نے تڑپ کر کہا۔ یہ کیا ہے۔

دینی۔ کچھ نہیں۔ حجور کو پان کھانے کو۔

داروغہ۔ رشوت دینا چاہتا ہے کہو تو بچّا اسی الزام میں بھیج دوں۔

دینی۔ بھیج دیجئے۔ گھر والی نگوڑی کفن کی پھکر سے چھوٹ جائے گی۔ وہیں بیٹھا ہوا آپ کو دعا دونگا۔

داروغہ۔ اگر انہیں چھڑانا ہے تو پچاس گنیاں لا کر سامنے رکھو۔ جانتے ہو ان کی گرفتاری پر پانچسو روپے کا انعام ہے۔

دینی۔ آپ کے لئے اتنا انعام کیا ہے۔ یہ بے چارے پردیسی آدمی ہیں۔ جب تک جئیں گے آپ کو یاد کریں گے۔

داروغہ۔ بک بک مت کرو۔ یہاں دھرم کمانے نہیں آئے ہیں۔

دینی۔ بہت تنگ ہوں حجور۔ دوری دکان تو نام کی ہے۔

کانسٹبل۔ بڑھیا سے مانگ جا کے۔

دینی۔ کمانے والا تو میں ہی ہوں۔ لڑکوں کا حال جانتے ہی ہو۔ پیٹ کاٹ کر کچھ روپے جمع کر رکھے تھے سو ابھی ساتوں دھام کئے چلا آتا ہوں۔

داروغہ تو اپنی گنیاں اٹھالے۔ اسے باہر نکال دو جی۔

دینی۔ آپ کا حکم ہے تو لیجئے جاتا ہوں۔ دھکے کیوں دلوایئے گا۔

داروغہ۔ (کانسٹبل سے) انہیں حراست میں رکھو منشی سے کہو ان کا بیان لکھ لیں۔

رما ناتھ نے دینی دین کے چہرے پر اتنی حسرت ناک معذوری کبھی نہ دیکھی تھی جیسے کوئی چڑیا اپنے گھونسلے میں بلی کو گھستے دیکھ کر بے قرار ہو گئی ہو۔ وہ ایک لمحہ تھانے کے دروازے پر کھڑا رہا پھر پیچھے پھرا اور سپاہی سے کچھ کہہ کر لپکا ہوا سڑک تک چلا گیا۔

مگر ایک ہی لمحہ میں پھر لوٹا اور داروغہ سے بولا۔ حضور دو گھنٹے کی مہلت نہ دیجیئے گا۔

رما ابھی تک وہیں کھڑا تھا اس کی یہ حالت دیکھ کر رو پڑا اور بولا۔ دادا اب تم حیران نہ ہو میری تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہونے دو۔ میرے باپ بھی ہوتے تو اس سے زیادہ اور کیا کرتے۔ میں مرتے دم تک تمہارا احسان مانوں گا۔

دیبی دین نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ کیسی بات کرتے ہو بھیا۔ جب روپوں پر آ گئی تو دیبی دین پیچھے ہٹنے والا نہیں ہے۔ اتنے روپے تو ایک دن کے جوئے میں ہار گیا ہوں۔ ابھی گھر بیچ دوں تو دس ہزار کی مالیت ہے کیا سر پہ لاد کر لے جاؤں گا (داروغہ سے) ابھی انہیں حراست میں بھیجئے میں روپے کی فکر کر کے تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔

دیبی دین چلا گیا تو داروغہ نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا ہے تو خرانٹ مگر بڑا نیک تم نے اسے کونسی جڑی سنگھا دی۔

رما۔ غریبوں پر سبھی کو رحم آتا ہے۔

داروغہ نے مسکرا کر کہا۔ پولیس کو چھوڑ کر اتنا اور کہیئے مجھے تو یقین نہیں یہ پاس گنیاں لائے۔

رما۔ اگر لائے بھی تو میں اتنا بڑا تاوان نہیں دلانا چاہتا۔ آپ مجھے شوق سے حراست میں لے لیں۔

داروغہ۔ مجھے پانچسو کی جگہ ساڑھے چھ سو مل رہے ہیں تو کیوں چھوڑ دوں۔ تمہاری گرفتاری کا انعام میرے کسی دوسرے بھائی کو مل جائے تو کیا بُرائی ہے۔

یکایک داروغہ کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔ میز کی دراز سے ایک مسل نکالی۔ اس کے ورق ادھر اُدھر اُلٹے۔ تب شفقت آمیز لہجہ میں بولے۔ اگر میں کوئی ایسی ترکیب بتلا دوں کہ دیبی دین کے روپے بھی بچ جائیں اور تمہارے اُوپر کوئی حرف بھی نہ آسکے تو کیسا؟

رما کو یقین نہ آیا۔ بولا۔ کیا ایسی بھی کوئی ترکیب ہے؟

داروغہ۔ راجی سائیں کے سو کھیل ہیں، آپ کو صرف ایک مقدمہ میں شہادت دینی پڑے گی۔

رما۔ جھوٹی شہادت ہوگی۔

داروغہ۔ نہیں بالکل سچی۔ بس یہی سمجھ لو کہ آدمی بن جاؤ گے۔ میونسپلٹی کے پنجہ سے تو چھوٹ ہی جاؤ گے۔ شاید سرکار پرورش بھی کرے۔ بولو۔ اگر چالان ہو گیا تو پانچ سال سے کم سزا نہ ہوگی۔ رما لو اس وقت دینی دین نہیں بچا بھی ہے تو بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ مگر میں مجبور نہیں کرتا تم اپنا نفع نقصان خود سمجھ سکتے ہو۔

داروغہ نے ڈکیتی کی داستان کہہ سنائی۔ رما ایسے کئی مقدمے اخباروں میں پڑھ چکا تھا بدگمان ہو کر بولا۔ تو مجھے مخبر بننا پڑے گا اور یہ کہنا پڑے گا کہ میں بھی ان ڈکیتوں میں شریک تھا یہ تو جھوٹی شہادت ہے

داروغہ۔ معاملہ بالکل سچا ہے۔ کسی بے گناہ کی جان خطرہ میں نہ آئے گی۔ وہی لوگ سزا پائیں گے جو سزا کے مستحق ہیں، تب جھوٹ کہاں رہا۔ ڈاکوؤں کے خوف سے یہاں کے لوگ شہادت دینے سے گریز کرتے ہیں، بس اور کوئی بات ایسی نہیں ہے سوچ لیجئے شام تک جواب دیجئے گا۔ یہ مانتا ہوں کہ آپ کو کچھ جھوٹ بولنا پڑے گا، لیکن نتائج کے اعتقاد حقیقت ہیں۔

رما کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ اگر ایک بار جھوٹ بول کر وہ اپنی پچھلی حماقتوں کی تلافی کر سکے تو پوچھنا ہی کیا۔ اس میں بہت آگ پیچھے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس اس وقت غرض مند ہے اور وہ میری کوئی واجب شرط نامنظور نہ کرے گی۔ اس انداز سے بولا۔ گویا اس کا دل حق و باطل کے مخمصہ میں پڑا ہوا ہے مجھے یہی خوف ہے کہ کہیں میری شہادت سے بے گناہ پھنس جائیں۔

داروغہ۔ اس کا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔

رما۔ اور اگر میونسپلٹی میری گردن ناپے تو میں کسے پکاروں گا۔

داروغہ۔ مجال ہے۔ میونسپلٹی چوں کر سکے۔ فوجداری کے مقدمہ میں مدعی تو سرکار ہوگی سرکار کی جانب سے آپ کو تحریری معافی نامہ دے دیا جائے گا بس اتنا سمجھ لیجئے کہ اگر آپ کی شہادت اچھی ہوئی اور فریق ثانی کے جرموں کے جال سے آپ نکل گئے تو آپ پارس ہو جائیں گے۔

داروغہ نے اسی وقت موٹر منگوائی اور رما کو ساتھ لے کر ڈپٹی صاحب سے ملنے چل دیئے۔ اتنی اہم کارگذاری دکھلانے میں تاخیر کیوں کرتے۔ ڈپٹی صاحب سے تخلیہ میں خوب ڈینگ اڑائی۔ اس آدمی کی صورت دیکھتے ہی بھانپ گیا کہ مفرور ہے فوراً گرفتار کیا۔ تجربہ کاروں کی نگاہ کہیں چوک سکتی ہے حضور مجرم کی آنکھیں پہچانتا ہوں۔ الہ آباد میونسپلٹی کے روپے غبن کر کے بھاگا ہے اس معاملہ میں شہادت دینے پر آمادہ ہے۔ آدمی پڑھا لکھا صورت کا شریف اور ذہین ہے۔

ڈپٹی نے مشتبہ انداز سے کہا۔ ہاں آدمی ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔

داروغہ۔ مگر معافی نامہ لئے بغیر اسے اعتبار نہ آئے گا۔ کہیں اسے یہ شبہ ہوا کہ ہم لوگ اس کے ساتھ کوئی چال چل رہے ہیں تو صاف نکل جائے گا۔

ڈپٹی۔ یہ تو ہوگا ہی۔ گورنمنٹ سے اس بارے میں بات چیت کرنا ہوگا۔ آپ فون ملا کر الہ آباد سے پوچھئے کہ اس آدمی پر کیا مقدمہ ہے۔

داروغہ نے ٹیلی فون ڈائرکٹری دیکھی نمبر ملایا اور بات چیت شروع ہوئی۔

ڈپٹی۔ کیا بولا۔

داروغہ۔ کہتا ہے یہاں اس نام کے کسی آدمی پر مقدمہ نہیں ہے۔

ڈپٹی۔ یہ کیا بات ہے بھائی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس نے نام تو نہیں بدل دیا۔

داروغہ۔ کہتا ہے میونسپلٹی میں کسی نے روپیے غبن نہیں کئے۔ اس طرح کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔

ڈپٹی۔ یہ تو بڑا تعجب کا بات ہے۔ آدمی بولتا ہے روپیہ لے کر بھاگا ہے، میونسپلٹی بولتا ہے کوئی روپیہ غبن نہیں کیا۔ یہ آدمی پاگل تو نہیں ہے۔

داروغہ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر دیں تمہارے اوپر کوئی الزام نہیں تو پھر اس کی گردلبی نہیں ملتی۔

ڈپٹی۔ اچھا میونسپلٹی کے دفتر سے پوچھئے۔

داروغہ نے پھر نمبر ملایا، سوال وجواب ہونے لگے۔

داروغہ۔ آپ کے یہاں رمانا تھ کوئی کلرک تھا۔

جواب۔ جی ہاں تھا۔

داروغہ۔ وہ کچھ روپیے غبن کر کے بھاگا ہے۔

جواب۔ نہیں وہ گھر سے نکل گیا ہے لیکن غبن نہیں کیا۔ کیا وہ آپ کے یہاں ہے

داروغہ۔ جی ہاں۔ ہم نے اُسے گرفتار کیا ہے، وہ خود کہتا ہے روپیے اس نے غبن کئے۔ بات کیا ہے؟

جواب۔ آپ تو لال بجھکڑ ہیں، ذرا دماغ لڑائیے۔

داروغہ۔ یہاں تو عقل کام نہیں کرتی۔

جواب۔ یہیں کیا، کہیں بھی کام نہیں کرتی۔ صرف شہادتیں گھڑنا جانتی ہے۔ سنئے رمانا تھ نے میزان لگانے میں غلطی کی تھی ڈر کر بھاگا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ تحویل میں مطلق کمی نہ تھی آئی سمجھ میں بات۔

ڈپٹی۔ اب کیا کرنا ہوگا کھان صاحب چڑیا ہاتھ سے گیا۔

داروغہ۔ نکل کیسے گیا حضور۔ رمانا تھ سے یہ بات کہی ہی کیوں جائے۔ اسے کسی

آدمی سے ملنے ہی کیوں دیا جائے جو اُسے یہ خبر دے سکے۔ گھر والے ضرور اس سے ملنے آئیں گے۔ کسی سے ملنے نہ دیا جائے۔ تحریر میں کوئی بات نہ لائی جائے۔ صرف زبانی اطمینان دلایا جائے۔

اُدھر تو یہ مشورے ہو رہے تھے ادھر دیبی دین ایک گھنٹہ میں لوٹ کر تھانے آیا۔ کانسٹبل نے کہا کہ دروغہ جی تو صاحب کے پاس گئے۔

دیبی دین نے گھبرا کر کہا۔ تو بھیا کو حراست میں ڈال دیا۔

کانسٹبل۔ نہیں۔ انہیں بھی ساتھ لے گئے۔

دیبی دین نے سر پیٹ کر کہا۔ پولیس والوں کی بات کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کہہ گیا کہ ایک گھنٹہ میں روپے لے کر آتا ہوں۔ مگر اتنا بھی صبر نہ ہوا۔ سرکار سے پانچسو ہی ملیں گے تو چھ سو دینے کو تیار ہوں۔ اب اوپر ہی اوپر انہیں پراگ راج بھیج دیں گے۔ میں دیکھ بھی نہ سکونگا بڑھیا رو رو کر مر جائے گی۔ یہ کہتا ہوا دیبی دین وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔

کانسٹبل نے پوچھا۔ تو یہاں کب تک بیٹھے رہو گے۔

دیبی دین بے خوفی سے بولا۔ اب تو دروغہ جی سے دو دو باتیں ہی کر کے جاؤنگا چاہے جیل ہی جانا پڑے۔ مگر پھٹکاروں گا ضرور بُری طرح پھٹکاروں گا۔ ان کے بھی تو بال بچے ہیں، کیا بھگوان سے بالکل نہیں ڈرتے۔ تم نے بھیا کو جاتی بار دیکھا تھا بہت رنجیدہ تھے۔

کانسٹبل۔ رنجیدہ تو نہیں تھے خاصی طرح ہنس رہے تھے۔ خاصی طرح دونوں صاحب موٹر میں بیٹھ کر گئے ہیں۔

دیبی دین کو یقین نہ آیا۔ بولا۔ ہنس کیا رہے ہونگے بچارے، منہ سے چاہے ہنسیں لیکن دل سے تو روتے ہی ہونگے۔

دیبی دین کو یہاں بیٹھے ایک گھنٹہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ یکایک جگو آکر کھڑی ہوئی

دیبی دین کو دروازہ پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر بولی۔ تم یہاں بیٹھے کیا کرتے ہو۔ بھیا کہاں ہیں؟
دیبی دین نے شکستہ دل ہو کر کہا۔ لے گئے صاحب کے پاس نہ جانے بھینٹ ہوتی ہے کہ اوپر ہی اوپر پراگ راج بھیج دئے جاتے ہیں۔
جگو۔ داروغہ جی تو بڑے وہ ہیں کہاں تو کہا۔ اتنا لیں گے اتنا لیں گے۔ کہاں لے کر چل دیئے۔
دیبی۔ اسی لئے تو بیٹھا ہوں۔
جگو۔ ہاں بھٹکا رنا ضرور جو اپنی بات کا نہیں وہ اپنے باپ کا کیا ہوگا۔ میں گھڑی کہوں گی میرا کیا کرلیں گے۔
دیبی۔ دکان پر کون ہے۔
جگو۔ بند کر آئی ہوں۔ ابھی بیچارے نے کچھ کھایا بھی نہیں۔ سویرے سے ویسے ہی ہے چولہے میں جائے وہ تماشہ۔ اسی لئے ٹکٹ بینے تو جانے تھے نہ گھر سے نکلتے تو کاہے کو یہ بلا سر پڑتی۔
دیبی۔ جو ادھر سے پراگ بھیج دیا تو۔
جگو۔ تو چھٹی تو آوے گی چل کر دیکھ آئیں گے۔
دیبی۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) سزا ہو جائے گی۔
جگو۔ روپے جمع کر دیں گے تو کاہے کو سزا ہوگی۔ سرکار اپنے روپے ہی تو لیگی۔
دیبی۔ ارے پگلی ایسا نہیں ہوتا۔ چور مال لوٹا دے تو وہ چھوڑ تھوڑے ہی دیا جائے گا۔
جگو نے صورت حال کا احساس کر کے کہا۔ داروگا جی ۔۔ ۔ ۔۔
داروغہ جی کی موٹر سامنے آ پہنچی۔ انسپکٹر صاحب بھی تھے۔ رماں ان دونوں کو دیکھتے ہی موٹر سے اُتر کر آیا اور خوش ہو کر بولا۔ تم یہاں دیر سے بیٹھے ہو کیا دادا۔ آؤ کمرے

ہیں چلو۔ تم کب آئیں اماں!

دروغہ نے مذاقاً پوچھا۔ کہو چودھری لائے روپے؟

دینی۔ جب کہہ گیا کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں تو آپ کو میری راہ دیکھنی چاہئے تھی چلئے اپنے روپے لیجئے۔

دروغہ۔ کھود کر نکالے ہونگے۔

دینی۔ آپ کے اقبال سے ہزار پانچسو ابھی ہی نکل سکتے ہیں چلو بھیا! بڑھیا کب سے کھڑی ہے میں روپے چکا کر آتا ہوں۔

دروغہ۔ تو بھائی اپنے روپے لے جا کر کسی ہانڈی میں رکھ دو۔ افسروں نے انہیں چھوڑنے سے انکار کیا میرے بس کی بات نہیں۔

انسپکٹر صاحب تو پہلے ہی دفتر میں چلے گئے تھے۔ یہ تینوں آدمی باتیں کرتے اس کے بغل والے کمرے میں گئے۔

دینی۔ دروغہ جی! مردوں کی بات ایک ہوتی ہے میں تو یہی جانتا ہوں میں روپے آپ کے حکم سے لایا ہوں۔ آپ کو اپنا قول پورا کرنا پڑے گا۔ کہہ کر مکر جانا نیچوں کا کام ہے۔

اتنے گستاخانہ الفاظ سن کر دروغہ جی کو بھنّا جانا چاہیئے تھا لیکن انہوں نے ذرا بھی برا نہ مانا۔ ہنستے ہوئے بولے۔ بھائی اب چاہے کمینہ کہو چاہے دغاباز کہو۔ مگر اب انہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ ایسے شکار روز نہیں ملا کرتے۔ قول کے پیچھے اپنی ترقی نہیں چھوڑ سکتا۔

دروغہ کے ہنسنے پر دینی دین اور بھی تیز ہوا۔ تو آپ نے کہا کس منہ سے تھا۔

دروغہ۔ کہا تو اسی منہ سے تھا لیکن منہ ہمیشہ یکساں تو نہیں رہتا۔ اسی منہ سے گالی دیتا ہوں۔ اسی منہ سے اس کی تعریف کرتا ہوں۔

دینی۔ (تنک کر) یہ مونچھیں مڑوا ڈالئے۔

داروغہ۔ مجھے بڑی خوشی سے منظور ہے۔ نیت تو میری پہلے ہی تھی۔ لیکن شرم کے مارے نہ مڑ و آتا تھا۔ اب تم نے دل مضبوط کر دیا۔

دیبی۔ ہنسیئے مت داروغہ جی۔ آپ ہنستے ہیں اور میرا خون جلا جاتا ہے۔ چاہے جیل ہی کیوں نہ ہو جائے لیکن میں کپتان صاحب سے ضرور کہہ دوں گا۔ ہوں تو ٹکے کا آدمی لیکن آپ کے اقبال سے بڑے بڑے افسروں تک پہنچ ہے۔

داروغہ۔ ارے یار تو کیا سچ مچ کپتان صاحب سے میری شکایت کر دو گے؟

دیبی دین نے سمجھا کہ دھمکی کارگر ہوتی۔ اکڑ کر بولا۔ آپ جب کسی کی نہیں سنتے۔ بات کہہ کر مکر جاتے ہیں دوسرے بھی اپنی سی کریں گے ہی۔ میم صاحب تو روز ہی دکان پر آتی ہیں۔

داروغہ۔ کون دیبی۔ اگر تم نے صاحب یا میم صاحب سے میری شکایت کی تو قسم کھا کر کہتا ہوں گھر کھدوا کر پھینک دوں گا۔

دیبی۔ جس دن میرا گھر کھدے گا اس دن یہ پگڑی اور چپڑوں بھی نہ رہے گی حضور۔

داروغہ۔ اچھا تو مارو ہاتھ پر ہاتھ۔ ہماری تمہاری دو دو چوٹیں ہو جائیں۔

دیبی۔ پچھتاؤ گے سرکار کہے دیتا ہوں پچھتاؤ گے۔

رما اب ضبط نہ کر سکا۔ اب تک وہ دیبی دین کی بدمزاجی کا تماشہ دیکھنے کے لئے بھیگی بلی بنا کھڑا تھا قہقہہ مار کر بولا۔ دادا داروغہ جی تمہیں چڑھا رہے ہیں۔ ہم لوگوں میں ایسی صلاح ہو گئی ہے کہ میں بغیر کچھ لئے دیئے ہی رہا ہو جاؤں گا۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی جگہ بھی مل جائے گی۔ صاحب نے پکا وعدہ کیا ہے مجھے اب یہیں رہنا ہوگا۔

دیبی دین اس کا کچھ مطلب نہ سمجھ سکا۔ بولا کیسی بات۔ بھیا کیا کہتے ہو۔ کیا پولیس

والوں کے چکمے میں آ گئے ، اس میں کوئی نہ کوئی چال ضرور چھپی ہو گی ۔

رملانے اطمینان کے ساتھ کہا اور کوئی بات نہیں مجھے ایک مقدمہ میں شہادت دینی پڑے گی ۔

دیبی دین نے بدگمانی سے سر ہلا کر کہا ، جھوٹا مقدمہ ہو گا ۔

رما ، نہیں دادا ، بالکل سچا معاملہ ہے میں نے پہلے ہی پوچھ لیا ہے ۔

دیبی دین کو اطمینان نہ ہوا ۔ بولا رہن اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا بھیّا ، ذرا سوچ سمجھ کر بات کرنا اگر میرے روپیوں سے ڈرتے ہو تو یہی سمجھ لو کہ اگر دیبی دین نے روپیوں کی پرواہ کی ہوتی تو آج لکھ پتی ہوتا ۔ انہیں ہاتھوں سے سو سو روپے کمائے ہیں ، اور سب اڑا دیئے ہیں ۔ کس مقدمہ میں شہادت دینی ہے کچھ معلوم ہوا ۔

داروغہ جی نے رما کو جواب دینے کا موقعہ نہ دے کر کہا ۔ وہی ڈکیتی والا معاملہ ہے جس میں کئی غریب آدمیوں کی جان گئی تھی ۔ ان ڈاکوؤں نے صوبہ بھر میں ہنگامہ مچا رکھا تھا ۔ ان کے خوف کے مارے کوئی آدمی گواہی دینے پر راضی نہیں ہوتا ۔

دیبی دین نے بے رُخی کے ساتھ کہا ۔ اچھا تو بہ مخبر بن گئے یہ بات ہے ، اس میں تو جو پولیس سکھلائے گی وہی تمہیں کہنا پڑے گا ۔ میں چھوٹی سمجھ کا آدمی ہوں ۔ ان باتوں کا مطلب کیا جانوں ۔ لیکن مجھ سے کوئی مخبر بننے کو کہتا تو نہ بنتا ۔ چاہے کوئی لاکھ روپے دیتا ۔ باہر کے آدمی کو کیا معلوم کہ کون کسور وار اور کون بے کسور ہے ۔ دو چار مجرموں کے ساتھ دو چار بے کسور تو جرور ہی ہونگے ۔

داروغہ ، ہرگز نہیں ، جتنے آدمی گرفتار کئے گئے ہیں سب پکے ڈاکو ہیں ۔

دیبی ، یہ تو آپ کہتے ہیں نا ، ہمیں کیا معلوم ۔

داروغہ ، ہم لوگ بے گناہوں کو پھنسائیں گے ہی کیوں یہ تو سوچو !

دیبی ، یہ سب بھگتے بیٹھا ہوں داروغہ جی ! اس سے تو یہی اچھا ہے کہ آپ اِنکا

چالان کر دیں۔ سال دو سال کی سزا ہی تو ہوگی۔

رملا نے بزدلانہ انداز سے کہا۔ میں نے خوب سوچ لیا ہے دادا۔ پوری مسل دیکھ لی ہے۔ اس میں کوئی بے گناہ نہیں ہے۔

دینی دین نے دل شکستہ ہو کر کہا۔ ہوگا بھائی جان تو پیاری ہوتی ہے یہ کہہ کر وہ لوٹ پڑا۔ اپنے جذبات کو وہ اس سے زیادہ واضح طور پر ظاہر نہ کر سکتا تھا۔

یکا یک اُسے ایک بات یاد آگئی مڑ کر بولا۔ مجھیں کچھ روپے دینا جاؤں بھیّا!

رملا نے خفت کے ساتھ کہا۔ کیا ضرورت ہے۔

داروغہ۔ آج سے انہیں یہیں رہنا پڑے گا۔

دینی دین طنز کے انداز سے بولا۔ ہاں حجور۔ اتنا جانتا ہوں۔ ان کی دعوت ہوگی بنگلہ رہنے کو ملے گا نوکر ملیں گے موٹر ملے گی۔ یہ سب جانتا ہوں کوئی باہر کا آدمی ان سے ملنے نہ پائے گا۔ نہ یہ کسی سے ملنے پائیں گے یہ سب دیکھ چکا ہوں۔

یہ کہتا ہوا دینی دین تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔ گویا یہاں اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ داروغہ نے اسے پکارا۔ مگر اس نے پھر کر نہ دیکھا اس کے چہرے سے مایوسی چھائی ہوئی تھی۔

جگو نے پوچھا۔ بھیا نہیں آرہے ہیں۔

دینی دین نے سڑک کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ بھیّا اب نہیں آویں گے جب اپنے ہی اپنے نہ ہوئے تو بھیّا تو بیگانے ہی ہیں۔

دونوں اس طرح اُداس گھر کی طرف چلے۔ گویا کسی عزیز کی لاش جلا کر لوٹ رہے ہوں۔

(۳۵)

رونے میں کتنا سکون ہے کتنی تقویت۔ کتنا روحانی سرور ہے جو تنہائی میں بیٹھ کر

کسی کی یاد میں، کسی کے فراق میں یا کسی درد سے بیتاب ہو کر سسک سسک کر نہیں رویا، وہ زندگی کی ایک ایسی نعمت سے محروم ہے جس پر صد ہا مسرتیں نثار ہیں، اس میٹھے درد کا لطف انہیں سے پوچھو، جنہیں یہ مبارک موقع ملتے ہیں، ہنسی کے بعد دل پژمردہ ہو جاتا ہے گویا ہم تھک گئے ہوں، مضمحل ہو گئے ہوں، رونے کے بعد ایک نئی فرحت، ایک تازہ شگفتگی، ایک روح افزا تسکین کا احساس ہوتا ہے، جالپا کے پاس اخبار کے دفتر سے خط پہنچا، تو اسے پڑھ کر وہ رو پڑی، ایک ہاتھ میں خط لئے اور دوسرے میں چوکھٹ پکڑے وہ خوب روئی، کیا سوچکر روئی، یہ کون کہہ سکتا ہے شاید اس غیر متوقع کامیابی نے مسرت کی اس گہرائی تک پہنچا دیا، جہاں پانی ہے یا اس بلندی تک جہاں برف ہے آج چھ مہینے کے بعد اسے پژمردہ جانفزا ملا۔ اتنے دنوں وہ دغا شعار امید اور بے رحم مایوسی کا کھلونا بنی رہی، آہ کتنی بار اس کے دل میں شورش ہوئی کہ زندگی کا خاتمہ کردے، اس تاریکی میں اسے امید کی روشنی صاف نظر آرہی تھی، اس نے سوچا وہ کتنے بے درد ہیں، چھ مہینے سے وہاں بیٹھے ہیں۔ ایک خط بھی نہ لکھا، آخر یہی تو سوچ لیا ہوگا کہ بہت رو رو کر مرجائے گی، انہوں نے میری پرواہ ہی کب کی۔ دس بیس روپے تو آدمی یا دوستوں میں خرچ کر دیتا ہے، یہ محبت نہیں ہے محبت دل کی چیز ہے روپے کی نہیں۔

جب تک رمانا کا کچھ پتہ نہ تھا، جالپا سارا الزام اپنے سر رکھتی تھی، لیکن آج اس کا سراغ پاتے ہی یکایک اس کا دل اس کی طرف سے سخت ہو گیا، طرح طرح کے شکوے پیدا ہونے لگے، وہاں کیا سمجھ کر بیٹھے ہوئے ہیں اسی لئے وہ آزاد ہیں خود مختار ہیں، کسی کا دیا نہیں کھاتے، اس طرح اگر میں بغیر کہے سنے کہیں چلی جاؤں تو قیامت آجائے۔ شاید تلوار لے کر میری گردن پر سوار ہو جائے یا زندگی بھر منہ دیکھے۔

اتنے میں رمیش بابو نے دروازہ پر پکارا۔ گوپی، گوپی۔ ذرا ادھر آنا، منشی جی نے

اپنے کمرے میں پڑے پڑے کراہ کر کہا کون ہے بھائی کمرے میں آجاؤ۔ ارے آپ ہیں رمیش بابو
بابوجی میں تو مر کر جیا۔ بس یہی سمجھ لیجئے کہ نئی زندگی پائی کوئی اُمید نہ تھی۔ کوئی آگے ہے نہ پیچھے
دو لونڈے آوارہ ہیں مروں یا جیوں ان سے مطلب نہیں، ان کی ماں میری صورت سے
ڈرتی ہے، بچاری بہو نے میری جان بچائی۔ وہ نہ ہوتی تو اب تک چل بسا ہوتا۔

رمیش بابو نے مصنوعی ہمدردی دکھاتے ہوئے کہا۔ آپ اتنے بیمار ہو گئے اور
مجھے خبر تک نہ دی، میرے یہاں رہتے آپ کو اتنی تکلیف ہوئی۔ بہو نے ایک پرزہ نہ
لکھ دیا۔ رخصت لینی پڑی ہوگی۔

منشی جی۔ چھٹی کے لئے درخواست تو بھیجدی تھی مگر صاحب میں نے ڈاکٹری سرٹیفکٹ
نہیں بھیجا، سولہ روپے کس کے گھر سے لاتا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں بغیر فیس لئے ڈاکٹر
لوگ بات نہیں کرتے۔ یہ تو ڈاکٹروں کا حال ہے دیکھو رہے ہیں آدمی مر رہا ہے مگر
بغیر فیس لئے قلم نہ اٹھائیں گے۔

رمیش بابو نے فکر مندانہ لہجہ میں کہا۔ یہ تو آپ نے بُری خبر سنائی۔ اگر رخصت
نامنظور ہوئی تو کیا کیجئے گا۔

منشی جی نے ماتھا ٹھونک کر کہا۔ ہوگا کیا گھر بیٹھ رہوں گا، صاحب پوچھیں گے تو
صاف کہہ دونگا سرجن نے چھٹی نہیں دی۔ آخر سرکار نے انہیں کس لئے تعینات کیا ہے۔
محض کرسی کی زینت بڑھانے کے لئے۔ مجھے برخاست ہوجانا منظور ہے مگر سرٹیفکٹ
نہ دونگا، دیکھئے لونڈے غائب ہیں آپ کے لئے پان کیسے منگوائیں۔

رمیش نے مسکرا کر کہا۔ میرے لئے آپ تردّد نہ کریں، میں آج پان کھانے کا نہیں
پیٹ بھر مٹھائی کھانے آیا ہوں۔ (جالپا کو پکار کر) بہو جی! تمہارے لئے خوشخبری
لایا ہوں۔ مٹھائی منگواؤ۔

جالپا نے پان کی طشتری ان کے سامنے رکھ دی اور بولی۔ پہلے وہ خبر وہ سنائیے

شاید آپ جس خبر کو نئی سمجھ رہے ہیں وہ پرانی ہو گئی ہو۔

رمیش۔ کہیں ہو نہ رما ناتھ کا پتہ چل گیا۔ کلکتہ میں ہیں۔

جالپا۔ مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا۔

منشی جی جھپٹ کر اٹھ بیٹھے۔ اُن کا بخار گویا بھاگ کر اشتیاق کی آڑ میں چھپا

رمیش کا ہاتھ پکڑ کر بولے معلوم ہو گیا۔ کلکتہ ہی میں ہیں کوئی خط آیا تھا۔

رمیش۔ خط نہیں تھا ایک پولیس انکوائری تھی۔ میں نے کہہ دیا ان پر کیسی طرح کا الزام نہیں ہے۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا بہو جی۔

جالپا نے کل داستان کہہ سنائی۔ اخبار کا خط بھی دکھایا۔ خط کے ساتھ روپوں کی ایک رسید تھی جس پر رما کے دستخط تھے۔

رمیش۔ دستخط تو رما ناتھ کا ہے بالکل صاف کسی طرح کا شبہ نہیں ہو سکتا۔ میں تمہارا قائل ہو گیا بہو جی۔ واہ کیا حکمت نکالی ہے ہم سب کے کان کٹ گئے۔ کسی کو نہ سوجھی اب جو سوچتا ہوں تو دیکھتا ہوں کتنی آسان بات تھی۔ اب تو وہاں کسی کو جانا چاہیئے جو حضرت کو پکڑ کر گھسیٹ لائے۔

یہی بات چیت ہو رہی تھی کہ رتن آ پہنچی۔ جالپا اُسے دیکھتے ہی وہاں سے نکل آئی اور اس کے گلے سے لپٹ کر بولی۔ بہو کلکتے سے خط آ گیا وہیں ہیں۔

رتن۔ میرے سر کی قسم۔

جالپا۔ سچ کہتی ہوں خط دیکھو نا۔

رتن۔ تو تم آج ہی چلی جاؤ۔

جالپا۔ ہاں یہی تو میں بھی سوچتی ہوں تم چلو گی۔

رتن۔ چلنے کو تو میں تیار ہوں۔ لیکن اکیلا گھر کس پر چھوڑوں۔ مجھے اس منی بھوشن پر کچھ شبہ ہونے لگا ہے اس کی نیت اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ بینک میں بیس ہزار

روپے سے کم نہ تھے سب نہ جانے کہاں اڑا دیئے۔ کہتا ہے کو یا کرم میں خرچ ہو گئے حساب مانگتی ہوں تو آنکھیں دکھاتا ہے۔ دفتر کی کنجی اپنے پاس رکھے ہوئے ہے مانگتی ہوں تو ٹال جاتا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ میرے ساتھ کوئی گہری چال چل رہا ہے۔ ڈرتی ہوں میں اِدھر جاؤں اُدھر یہ سب کچھ لے دے کر چلتا بنے۔ بنگلے کے گاہک آ رہے ہیں میں بھی سوچتی ہوں دیہات میں جا کر اطمینان سے پڑی رہوں۔ میں نہ ہوں گی تو شاید روپے بھی مجھے دیکھنے کو نہ ملیں گے۔ گوپی کو لے کر آج ہی چلی جاؤ۔ روپے کا انتظام میں کر دوں گی۔

جالپا۔ گوپی ناتھ تو شاید نہ جا سکیں۔ دادا کی دوا دارو کے لئے بھی تو کوئی چاہیئے۔

رتن۔ وہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں روز سویرے آ جاؤں گی اور شام کو بھی ایک بار دیکھ جایا کروں گی۔

جالپا۔ اور دن بھر ان کے ساتھ کون بیٹھا رہے گا۔

رتن۔ میں تھوڑی دیر بیٹھی بھی رہا کروں گی، مگر تم آج ہی جاؤ۔ بیچارے پر وہاں نہ جانے کیا گزر رہی ہو گی۔ تو یہی طے رہی نہ۔

رتن منشی جی کے کمرے میں گئی تو رمیش بابو کھڑے ہو گئے اور بولے۔ آیئے! دیوی جی، رما بابو کا پتہ تو چل گیا۔

رتن۔ اس میں آدھی کارگزاری میری ہے۔

رمیش۔ آپ کی صلاح سے تو ہوا ہی ہو گا۔ اب انہیں یہاں لانے کی فکر کرنی ہے۔

رتن۔ اس کی سب سے اچھی صورت یہی ہے کہ جالپا جا کر انہیں پکڑ لاویں گوپی کو ساتھ لیتی جائیں۔ آپ کو اس میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے دادا جی!

منشی جی کو اعتراض تو تھا۔ ان کا بس چلتا تو اس موقع پر دس پانچ آدمیوں کو

اور جمع کر لیتے، مگر معاملہ ایسا آ پڑا تھا کہ کچھ بول نہ سکے۔

گوپی کلکتہ کی سیر کا ایسا اچھا موقعہ پا کر کیوں نہ خوش ہوتا۔ بشمبھر دل میں اینٹھ کر رہ گیا۔ خدا نے اسے کم سن نہ بنایا ہوتا تو آج اس کی حق تلفی کیوں ہوتی۔ گوپی ایسے کہاں کے بڑے ہوشیار ہیں۔ جہاں جاتے ہیں وہیں کچھ نہ کچھ کھو آتے ہیں۔ ہاں مجھ سے بڑے ہیں قدرت کے نظام نے اسے مجبور کر دیا۔

رات کو نو بجے جالپا چلنے کو تیار ہوئی۔ ساس سسر کے قدموں پر سر جھکا کر دعائیں لیں۔ بشمبھر ناتھ رو رہا تھا۔ اسے گلے لگا لیا پیار کیا اور موٹر پر بیٹھی۔ رتن اسٹیشن تک پہنچانے کے لئے آئی تھی۔ موٹر چلی تو جالپا نے کہا۔ کلکتہ تو بہت بڑا شہر ہوگا۔ وہاں پتہ کیسے چلے گا۔

رتن۔ پہلے اخبار کے دفتر میں جانا وہاں سے پتہ چل جائیگا۔

جالپا۔ ٹھہروں گی کہاں؟

رتن۔ دھرم شالہ میں یا ہوٹل میں ٹھہرنا۔ روپے کی ضرورت پڑے تو مجھے تار دینا۔ بابو آ جائیں تو میری ناؤ پار لگ جائے۔ یہ منی بھوشن مجھے تباہ کر دے گا۔

جالپا۔ ہوٹل میں بدمعاش تو نہ آتے ہوں گے۔

رتن۔ کوئی ذرا بھی شرارت کرے ٹھوکر مارنا۔ کچھ پوچھنا مت۔ ٹھوکر جما کر تب بات کرنا۔ (کمر سے ایک چھری نکال کر) اسے اپنے پاس رکھو۔ کمر میں چھپائے رکھنا۔ جب کبھی باہر نکلتی ہوں تو اسے اپنے ساتھ رکھتی ہوں۔ اس سے دل بڑا مضبوط رہتا ہے جو مرد کسی عورت کو چھیڑتا ہے تو سمجھ لو وہ پرلے سرے کا نامرد۔ کمینہ اور اوباش ہے۔ تمہاری چھری کی چمک اور تمہارے تیور ہی دیکھ کر اس کی روح فنا ہو جائے گی۔ سیدھا دُم دبا کر بھاگے گا۔ لیکن اگر ایسا موقعہ آ ہی پڑے جب تمہیں چھری سے کام لینے پر مجبور ہو جانا پڑے تو ذرا مت جھجکنا اس کی ذرا فکر مت کرنا کہ کیا ہوگا کیا نہ ہوگا۔ جو کچھ ہونا ہوگا ہو جائے گا۔

اسٹیشن آ گیا۔ قلیوں نے اسباب اُتارا۔ گوپی ٹکٹ لایا۔ جالپا پتھر کی مورتی کی طرح

پلیٹ فارم پر کھڑی رہی، گویا حواس مفلوج ہو گئے ہوں۔ کسی بڑی آزمائش سے پہلے ہماری وہی حالت ہو جاتی ہے جو آسمان کی طوفان آنے سے قبل ہوتی ہے رتن نے گوپی سے کہا۔ ہوشیار رہنا۔

گوپی ادھر کئی مہینوں سے ورزش کرتا تھا چلتا تو مونڈھے اور سینہ کو دیکھا کرتا۔ دیکھنے والوں کو تو وہ جیوں کا تیوں نظر آتا تھا۔ مگر اپنی نگاہ میں وہ کچھ اور ہو گیا تھا شاید اُسے تعجب ہوتا تھا کہ اسے آتے دیکھ کر کیوں لوگ راستہ سے ہٹ نہیں جاتے۔ کیوں اس کے قد و قامت سے مرعوب نہیں ہو جاتے۔ اکڑ کر بولا۔ کسی نے ذرا بھی چوں چپڑ کی تو ہڈی توڑ دونگا۔

رتن مسکرائی۔ یہ تو مجھے معلوم ہے سو مت جانا۔

گوپی۔ پلک تو جھپکے گی نہیں۔ مجال ہے نیند آجائے۔

گاڑی آگئی۔ گوپی نے ایک ڈبے میں گھس کر قبضہ جما لیا۔ جالپا کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے بولی۔ بہن دعا دو کہ انہیں لے کر خیریت سے لوٹ آؤں۔

اس وقت اس کا کمزور دل کوئی سہارا ڈھونڈھ رہا تھا اور دعا کے سوا وہ سہارا اور کہاں ملتا۔

انجن نے سیٹی دی۔ دونوں سہیلیاں گلے ملیں جالپا گاڑی میں جا بیٹھی۔

رتن نے کہا۔ جاتے ہی خط بھیجنا۔

جالپا نے سر ہلا دیا۔

اگر میری ضرورت معلوم ہو تو فوراً خط لکھنا۔ میں سب کچھ چھوڑ کر چلی آؤنگی۔

جالپا نے سر ہلا دیا۔

راستے میں رونا مت!

جالپا ہنس پڑی۔ گاڑی چل دی۔

(۳۶)

دبی دین نے چائے کی دکان اسی دن بند کردی اور دن بھر اس عدالت کی خاک چھانتا پھرتا تھا جس میں ڈکیتی کا مقدمہ پیش تھا، رما ناتھ کی شہادت ہو رہی تھی، تین دن رما کی شہادت برابر ہوتی رہی اور تینوں دن دبی دین نے کچھ کھایا نہ سویا۔ آج بھی اس نے گھر آتے ہی آتے کرتا اتار کر رکھ دیا اور ایک پنکھا لے کر جھلنے لگا، بھاگن لگ گیا تھا اور کچھ کچھ گرمی شروع ہو گئی تھی لیکن اتنی گرمی نہ تھی کہ پسینہ چلے اور پنکھے کی ضرورت ہو۔ اکثر لوگ تو ابھی تک جاڑے کے کپڑے پہنے تھے، لیکن دبی دین پسینے میں تر تھا اس کا چہرہ جس پر معصوم بڑھاپا ہنستا رہتا تھا۔ کھسیا یا ہوا تھا گویا بیگار سے لوٹا ہوا ہو۔

جگّو نے لوٹے میں پانی لاکر رکھ دیا اور بولی۔ چلم بھر دوں۔

دبی دین کی یہ تین دن کی خاطر ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے بڑھیا کبھی چلم رکھنے کو نہ پوچھتی تھی۔ دبی دین اس کا مطلب سمجھتا تھا۔ بڑھیا کو ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ نہیں رہنے دو۔ چلم نہ پیوں گا۔

تو ہاتھ منہ دھو لو گرد پڑی ہوئی ہے۔

دھو لونگا۔ جلدی کیا ہے۔

بڑھیا آج کا واقعہ سننے کے لئے بے قرار تھی۔ ڈر رہی تھی کہ دبی دین جھنجلا نہ پڑے اور اس کی تھکن مٹا دینا چاہتی تھی۔ جس میں دبی دین خوش ہو کر آپ ہی سارا قصہ کہہ چلے۔

تو کچھ جل پان تو کر لو۔ دوپہر کو بھی تو کچھ نہیں کھایا۔ مٹھائی لاؤں۔ پنکھا مجھے دے دو!

دبی دین نے پنکھا دے دیا، بڑھیا جھلنے لگی۔ دو تین منٹ تک آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہنے کے بعد اس نے کہا۔ آج بھیا کی گواہی ختم ہو گئی۔

بڑھیا کا ہاتھ رک گیا۔ تو کل سے وہ گھر آجائیں گے۔

دیبی۔ ابھی نہیں چھٹی ملی جاتی۔ یہی بیان دیوانی میں دینا پڑے گا اور اب وہ یہاں آنے ہی کیوں لگے۔ کوئی اچھی جگہ مل جائے گی۔ گھوڑے پر چڑھے چڑھے گھومیں گے۔ مگر ہے بڑا پکا مطلبی۔ پندرہ آدمیوں کو بے گناہ پھنسا دیا۔ پانچ چھ کو تو پھانسی ہو جائے گی۔ دوسروں کو دس دس بارہ بارہ سال کی سجا دھری رکھی ہے۔ اس کے بیان سے مقدمہ ثبوت ہو گیا۔ کوئی کتنی ہی جرح کرے۔ کیا مجال کہ جرا بھی ہچکچائے۔ اب ایک بھی نہ بچے گا کس نے کیا، کس نے نہیں کیا۔ اس کا حال بھگوان جانیں پر سب مارے جائیں گے گھر سے بھی سب سرکاری روپیہ کھا کر بھاگا تھا۔ میں بڑا دھوکا ہوا۔

جگو نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا۔ اپنی نیکی بدی اپنے ساتھ ہے۔ مطلب کے لئے تو دنیا ہے کون کس کے لئے مرتا ہے۔

دیبی۔ اپنے مطلب کے لئے جو دوسروں کا گلا کاٹے۔ اس کو جہر دے دینا بھی پاپ نہیں ہے۔

یکایک دو آدمی آکر کھڑے ہو گئے۔ ایک گورا خوبصورت لڑکا تھا جس کی عمر پندرہ سولہ سال سے زاید نہ تھی۔ دوسرا ادھیڑ تھا اور صورت سے چپڑاسی معلوم ہوتا تھا۔

دیبی دین نے پوچھا۔ کسے کھوجتے ہو۔

چپڑاسی نے کہا۔ تمہارا ہی نام دیبی دین ہے نا۔ میں اخبار کے دفتر سے آیا ہوں یہ بابو انہیں رماناتھ کے بھائی ہیں جنہیں شطرنج کا انعام ملا تھا۔ یہ انہیں کی تلاش میں دفتر گئے تھے۔ ایڈیٹر صاحب نے تمہارے پاس بھیج دیا۔ تو میں جاؤں ؟

یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ دیبی دین نے گوپی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ صورت رماناتھ سے ملتی تھی بولا۔ آؤ بیٹا بیٹھو۔ کب آئے گھر سے۔

گوپی نے ایک کھٹک کی دکان پر بیٹھنا شان کے خلاف سمجھا کھڑا کھڑا بولا۔

آج ہی تو آیا ہوں۔ بھائی جی ساتھ ہیں دھرم شالہ میں ٹھہرا ہوں۔

دیبی دین نے کھڑے ہو کر کہا۔ تو جا کر بہو کو یہیں لائو نا۔ اوپر تو رما بابو کا کمرہ ہے ہی آرام سے رہو۔ دھرم سالے میں کیوں پڑے رہو گے۔ نہیں چلو میں بھی چلتا ہوں۔ یہاں سب طرح کا آرام ہے۔

اس نے جگو کو یہ خبر سنائی۔ اور اوپر جھاڑو لگانے کو کہہ کر گوپی کے ساتھ دھرم شالے چل دیا۔ بڑھیا نے فوراً اوپر جا کر جھاڑو لگائی۔ لپک کر حلوائی کی دکان سے مٹھائی اور دہی لائی، صراحی میں پانی بھر کر رکھ دیا۔ پھر اپنا منہ ہاتھ دھویا۔ ایک رنگین ساڑھی نکالی گہنے پہنے اور بن ٹھن کر بہو کا انتظار کرنے لگی۔

ذرا دیر میں فٹن بھی آ پہنچی۔ بڑھیا نے جا کر جالپا کو اتارا۔ جالپا پہلے تو ساگ بھاجی کی دکان دیکھ کر کچھ جھجکی، مگر بڑھیا کی مادرانہ خاطر مدارات دیکھ کر اس کی جھجک دور ہو گئی۔ اس کے ساتھ اوپر گئی تو ہر ایک چیز اس طرح اپنی جگہ پر پائی گویا اپنا ہی گھر ہو۔

جگو نے لوٹے میں پانی رکھ کر کہا۔ اس گھر میں بھیا رہتے تھے بیٹی۔ آج پندرہ دن سے گھر سونا پڑا ہوا ہے۔ منہ ہاتھ دھو کر منہ جو ٹھا کر لو۔ بھیا کا حال تو ابھی تمہیں نہ معلوم ہو گا۔

جالپا نے سر ہلا کر کہا۔ کچھ ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم ہوا۔ اخبار کے دفتر میں اتنا معلوم ہوا کہ پولیس نے گرفتار کر لیا۔

دیبی دین بھی اوپر آ گیا تھا۔ بولا۔ گرفتار تو کیا تھا مگر اب تو وہ ایک معاملہ میں سرکاری گواہ ہو گئے ہیں۔ پراگ راج میں ان پر اب کوئی مقدمہ نہ چلے گا اور سنا ہے نوکری چاکری بھی مل جائے گی۔

جالپا نے بے خوفی کے ساتھ کہا۔ وہاں تو ان پر کوئی مقدمہ نہیں ہے۔

دینی دین نے ڈرتے ڈرتے کہا، سُنا ہے کچھ روپے پیسے کا معاملہ تھا۔ جالیا۔ وہ تو کوئی بات نہ تھی، جوں ہی ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان سے کچھ سرکاری رقم خرچ ہو گئی ہے اسی وقت روپے داخل کر دیئے۔ یہ فضول گھبرا کر چلے آئے۔ اور پھر ایسی چپ سادھی کہ اپنی خبر تک نہ دی۔

دینی دین کا چہرہ روشن ہو گیا، گویا کسی درد سے آرام مل گیا ہو۔ بولا، تو یہ ہم لوگوں کو کیا معلوم، بار بار سمجھایا کہ گھر چٹھی پتر بھیج دو۔ لوگ گھبراتے ہونگے مگر مارے شرم کے لکھتے ہی نہ تھے۔ اسی دھوکے میں پڑے ہوئے تھے کہ وہاں ان پر مکدمہ چل رہا ہوگا۔ جانتے تو سرکاری گواہ کیوں بنتے۔

سرکاری گواہ قوم میں کتنی بری نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ لوگ اسے کتنا ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں۔ یہ اس سے چھپا نہ تھا سرکاری گواہ کیوں بنائے جاتے ہیں۔ کس طرح انہیں ترغیبیں دی جاتی ہیں، کس طرح وہ پولیس کے کٹھ پتلے بن کر اپنے ہی دوستوں کا گلا گھونٹتے ہیں۔ یہ اسے معلوم تھا اگر کوئی آدمی اپنی ناہمواریوں پر شرمندہ ہو کر حقیقت کا انکشاف کرے، دغا اور فتنہ انگیزی کا پردہ ہٹا دے تو وہ فرشتہ ہے۔ اس کی حق پسندی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مگر شرط یہی ہے کہ وہ اپنے رفیقوں کے ساتھ اپنے کئے کا پھل بھوگنے کو تیار ہو۔ ہنستا کھیلتا پھانسی پر چڑھ جائے۔ لیکن اپنی جان بچانے کے لئے یا خود غرضی کے زیر اثر سزا سے خائف ہو کر جو اپنے رفیقوں سے دغا کرے آستین کا سانپ بن جائے، وہ نامرد ہے، بے غیرت ہے۔ بے حیا ہے۔ ایسے آدمی کو دُنیا کبھی معاف نہیں کرتی۔ کبھی نہیں۔ یہاں تو معاملہ اور بھی پیچیدہ تھا۔ رمانے سزا کے خوف سے اپنے کردہ گناہوں کا پردہ نہیں کھولا تھا۔ اس میں کم سے کم سچائی تو ہوتی۔ قابل نفرین ہونے پر بھی بات تو سچی ہوتی۔ یہاں تو ان گناہوں کا پردہ کھولا گیا تھا جن کی ہوا تک اسے نہ لگی تھی۔ جالپا کو اس کا یقین نہ آیا۔ ضرور کوئی نہ کوئی بات اور ہوئی ہوگی۔ جس نے رما کو سرکاری گواہ

بننے پر مجبور کر دیا ہوگا۔ شرماتی ہوئی بولی۔ کیا یہاں بھی کوئی بات ہو گئی تھی؟

دینی دین نے اطمینان انگیز لہجہ میں کہا۔ کوئی بات نہیں۔ پراگ راج سے وہ میرے ساتھ ہی یہاں آئے۔ جب سے یہاں سے کہیں گئے نہیں باہر نکلنے ہی نہ تھے۔ بس ایک دن نکلے اور اسی دن پولیس نے پکڑ لیا۔ ایک سپاہی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ڈرے کہ مجھی کو پکڑنے آ رہا ہے بھاگ کھڑے ہوئے۔ سپاہی کو کھٹکا ہوا کہ اس نے شبہ میں گرفتار کر لیا۔ میں بھی ان کے پیچھے تھانے پر پہنچا۔ داروغہ پہلے تو رسوت مانگتے تھے مگر جب میں روپے لے کر پہنچا تو وہاں اور ہی گل کھلا ہوا تھا۔ افسروں نے نہ جانے ان سے کیا بات چیت کی بس سرکاری گواہ بن گئے۔ مجھ سے بھیا نے یہی کہا کہ اس معاملے میں بالکل جھوٹ نہ بولنا پڑے گا۔ میں کیا کرتا چپ ہو رہا۔

جگو۔ نہ جانے سبھوں نے کونسی بوٹی سنگھا دی۔ بھیا تو ایسے نہ تھے دن بھر اماں اماں کرتے رہتے تھے۔ دکان پر سبھی طرح کے لوگ آتے ہیں مرد بھی عورت بھی۔ کیا مجال کہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا ہو۔

دینی۔ کوئی برائی نہ تھی۔ میں نے تو ایسا لڑکا ہی نہیں دیکھا۔

جالپا نے کچھ سوچکر کہا۔ کیا ان کا بیان ہو گیا۔

دینی۔ ہاں تین دن برابر ہوتا رہا۔

جالپا نے پوچھا۔ ان سے میری ملاقات تو ہو جائے گی۔

دینی دین نے مسکرا کر کہا۔ ہاں اور کیا جس میں سارا بھنڈا پھوڑ کر رکھ دو پولیس ایسی گدھی نہیں ہے۔ آجکل کوئی بھی ان سے ملنے نہیں پاتا۔ کڑا پہرہ رہتا ہے۔

اس مسئلہ پر اس وقت زیادہ گفتگو نہ ہو سکی۔ اس گتھی کو سلجھانا آسان نہ تھا۔ جالپا نے گوپی کو بلایا وہ چھجے پر کھڑا سڑک کا تماشہ دیکھ رہا تھا گویا سسرال آیا ہو۔ جالپا نے کہا۔ منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھا لو تو۔

گوپی شرما کر پھر باہر چلا گیا۔

دیبی دین سمجھ گیا کہ ہم لوگوں کے سامنے یہ لڑکا کچھ کھاتے شرماتا ہے بولا۔ تو اب ہم دونوں جاتے ہیں تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو ہم سے کہہ دینا۔ بھیّا کو تو ہم اپنا ہی سمجھتے تھے اور ہمارے کون بیٹھا ہوا ہے۔

جگو نے غرور سے کہا۔ وہ تو ہمارے ہاتھ کا بنایا ہوا کھا لیتے تھے۔

جالپا مسکرا کر بولی۔ اب تمہیں کھانا نہ پکانا پڑے گا ماں جی۔ میں پکا دیا کروں گی۔

جگو نے ٹوکا۔ ہماری برادری میں دوسرے کے ہاتھ کا کھانا منع ہے بہو۔ اب چار دن کے لئے برادری میں کیا نکّو بنیں۔

جالپا۔ ہماری برادری میں بھی تو دوسروں کے ہاتھ کا کھانا منع ہے۔

جگو۔ تمہیں یہاں کون دیکھنے آتا ہے۔ پھر پڑھے لکھے آدمی ان باتوں کا بچار بھی تو نہیں کرتے۔ ہماری برادری تو گنواروں کی ہے۔

جالپا۔ یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ تم پکاؤ اور میں کھاؤں جسے بہو بنایا اس کے ہاتھ کا کھانا پڑے گا۔

اس اپنے پن سے بھرے ہوئے جملے نے دیبی دین کے دل پر چوٹ کی۔ بولا۔ بہو نے بات تو بڑے پتہ کی کہی۔ اس کا جواب سوچ کر دینا ہوگا۔ ابھی چلو ان لوگوں کو آرام کرنے دو۔

دونوں چلے گئے۔ تو گوپی نے آ کر کہا۔ بھیّا اسی کھٹک کے یہاں رہتے تھے کیا۔ کھٹک ہی معلوم ہوتا ہے۔

جالپا نے دھتکار کر کہا۔ کھٹک ہوں یا چمار ہوں لیکن ہم سے اور تم سے سو گنے اچھے ہیں۔ ایک پردیسی آدمی کو چھ مہینے تک گھر میں رکھا۔ کھلایا پلایا۔ ہم میں ہے اتنی ہمت۔ یہاں تو کوئی مہمان آ جاتا ہے تو وہ بھی بھاری ہو جاتا ہے۔ اگر یہ لوگ نیچے ہیں تو ہم ان

سے کہیں نیچے ہیں۔

گوپی منہ ہاتھ دھو چکا تھا۔ مٹھائی کھاتا ہوا بولا۔ کسی کو ٹھہرا لینے سے کوئی اونچا نہیں ہو جاتا۔ چمار کتنا ہی دان پُن کرے پر رہے گا چمار ہی۔

جالپا۔ میں اس چمار کو اس پنڈت سے اچھا سمجھوں گی۔ جو دوسروں کو دغا دے۔

جل پان کر کے گوپی تو شہر گھومنے چلا گیا۔ جالپا نے کچھ نہ کھایا۔ اس کے سامنے ایک مشکل مسئلہ درپیش تھا۔ رما کو اس دلدل سے کیسے نکالے۔ اس رسوائی اور جگ ہنسائی کے خیال سے ہی اس کا ضمیر مجروح ہو اٹھتا تھا۔

ان بے گناہوں کا خون کس کی گردن پر ہوگا۔ ملزموں میں نہ جانے کون گنہگار ہے۔ کون بے گناہ ہے سبھی سزا پا جائیں گے۔ شاید دو چار کو پھانسی ہو جائے۔ یہ خون ناحق کس کی گردن پر ہوگا۔

اس نے پھر سوچا۔ لوگ کہتے ہیں یہ ڈھکوسلا ہے۔ کون جانتا ہے کسی پر ہتیا پڑتی ہے یا نہیں۔ یہ بھی مان لیا کہ کسی پر ہتیا نہ پڑے گی۔ لیکن اپنی غرض کے لئے دوسروں کو خطرہ میں ڈالنا کتنا شرمناک ہے۔ رمانے اسے قبول ہی کیوں کیا۔ اگر مقدمہ چلنے کا خوف بھی تھا تو سال دو سال کی قید کے سوا اور کیا ہوتا۔ محض اس سزا سے بچنے کے لئے یہ دغا۔ اب معلوم بھی ہو جائے کہ میونسپلٹی کچھ نہیں کر سکتی تو کیا ہو سکتا ہے۔ ان کی شہادت تو ہو ہی گئی۔

یکایک ایک نقطہ کسی باریک کیل کی طرح اس کے دل میں چبھ گیا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ اپنا بیان تبدیل کر دیں۔ انہیں معلوم ہو جائے کہ ان پر کوئی مقدمہ نہ چلے گا تو شاید خود ہی اپنا بیان بدل دیں۔ مگر یہ معاملہ ان کے کانوں تک کیسے پہنچے۔

وہ اضطراب کے عالم میں نیچے آئی۔ اور دیوی دین سے بولی۔ کیوں دادا ان کے پاس کوئی خط بھی نہیں پہنچ سکتا۔ پہرہ والوں کو دس پانچ روپے دینے سے تو شاید خط پہنچ جائے۔

دیبی دین نے نفی میں گردن ہلا کر کہا۔ مشکل ہے۔ پہرہ پر بڑے بھیجے ہوئے آدمی رکھے گئے ہیں، میں دو بار گیا تھا سبھوں نے پھاٹک پر کھڑا بھی نہ ہونے دیا۔

اس بنگلے کے آس پاس مکان دکان تو ہوں گے۔

ہاں ہیں کیوں نہیں۔ ایک طرف تو دوسرا بنگلہ ہے۔ دوسری طرف آموں کا باغ ہے سامنے سڑک ہے۔

شام کو وہ گھومنے گھامنے تو نکلتے ہی ہوں گے۔

ہاں نکلتے تو ہیں۔ لیکن پولیس کے دو ایک انسپکٹر ساتھ رہتے ہیں۔

اگر کوئی باغ میں چھپ کر بیٹھے تو کیا ہو۔ جب انہیں اکیلے دیکھے خط پھینک دے وہ ضرور اٹھائیں گے۔

دیبی دین نے سوچ کر کہا۔ ہاں ہو سکتا ہے۔ لیکن اکیلے ملیں تب تو۔

ذرا اور اندھیرا ہوا تو جالپا نے دیبی دین کو ساتھ لے لیا اور رما ناتھ کا بنگلہ دیکھنے چلی۔ ایک خط لکھ کر جیب میں رکھ لیا تھا بار بار دیبی دین سے پوچھتی۔ اب کتنی دُور ہے سوچتی ہوں کہیں رما تنہا ٹہلتے ہوئے مل جائیں تو کیا پوچھنا ہے۔ خط کو رومال میں باندھ کر ان کے سامنے پھینک دوں۔

دفعتہً اسے ایک اندیشہ پیدا ہوا۔ کہیں وہ خط پا کر بھی اپنا بیان نہ بدلیں تو کیا ہوگا۔ کون جانے اب میری یاد بھی انہیں ہے یا نہیں۔ کہیں مجھے دیکھ کر وہ منہ پھیر لیں تو کیا ہو۔ اس خیال سے وہ سہم اٹھی۔

اس نے دیبی دین سے پوچھا۔ کیوں دادا، وہ کبھی ہم لوگوں کا ذکر بھی کرتے تھے

دیبی دین نے سر ہلا کر کہا کبھی نہیں۔ ہاں اداس بہت رہتے تھے۔

اس جواب نے جالپا کو اور بھی تردّد میں ڈال دیا۔ شہر کی گھنی بستی سے یہ لوگ دُور نکل آئے تھے چاروں طرف سناٹا تھا۔ دن کی تیز زردی کے بعد اس وقت ہوا

بھی آرام کر رہی تھی۔ سڑک کے کنارے درخت اور میدان چاندنی کی گرد آلود روشنی میں بے جان سے معلوم ہوتے تھے۔ جالپا کو یہ گمان ہونے لگا کہ اس کی کوشش کا کچھ حاصل نہیں ہے اس کی بادیہ پیمائی بالکل بے سود ہے۔ اس بستی میں اس کی حالت بے کس لڑکی کی سی ہے جو مٹھی بھر اناج کے لئے در بدر پھرتا ہو۔ وہ جانتا ہے۔ اگلے دروازہ پر بھی اسے کچھ نہ ملے گا شاید گالیاں ہی ملیں۔ پھر بھی دستِ سوال پھیلا دیتا ہے۔ یہ اُمید کا سہارا نہیں مایوسی کا سہارا ہے۔

یکایک سڑک کے داہنی طرف بجلی کی روشنی نظر آئی۔

دیبی دین نے ایک بنگلے کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ وہی ان کا بنگلہ ہے۔

جالپا نے مایوسانہ نظروں سے ادھر دیکھا۔ بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی آدمی نہ تھا۔ پھاٹک پر تالا پڑا ہوا تھا۔ بولی یہاں تو کوئی نہیں ہے۔

دیبی دین نے پھاٹک کے اندر جھانک کر کہا۔ شاید بنگلہ چھوڑ دیا۔ دیکھوں میں پتہ لگاتا ہوں۔

بنگلے کی دائیں طرف آموں کے باغ میں روشنی نظر آئی۔ شاید کھٹک باغ کی رکھوالی کر رہا تھا۔ دیبی دین نے باغ میں آکر پکارا۔ کون ہے۔ یہاں کس نے یہ باغ لیا ہے۔

ایک آدمی آموں کے جھرمٹ میں سے نکل آیا۔ دیبی دین نے اسے پہچان کر کہا۔ ارے تم ہو جنگلی۔ تم نے یہ باغ لیا ہے۔ جنگلی ٹھنگنا سا گٹھیلا آدمی تھا دیبی دین کی آواز پہچان کر بولا۔ ہاں داداے تو لیا مگر کچھ ہے نہیں۔ گھاٹا ہی رہے گا۔ تم یہاں کیسے آ گئے۔

دیبی۔ کچھ نہیں یوں ہی چلا آیا اس بنگلہ والے آدمی کہاں گئے۔

جنگلی نے اِدھر اُدھر چوکنی آنکھوں سے دیکھ کر ان باتوں میں کہاں۔ اس میں وہی مخبر لگا ہوا تھا آج سب چلے گئے۔ سنتے ہیں پندرہ بیس دن میں آ دیں گے پڑھے لکھے

آدمی بھی ایسے دگاباج ہوتے ہیں دادا سراسر جھوٹی گواہی دی۔ نہ جانے اس کے بال بچے ہیں یا نہیں۔ بھگوان سے بھی نہ ڈرا۔

جالپا وہیں کھڑی تھی۔ دیو دین نے جنگی کو اور زہر اگلنے کا موقعہ نہ دیا۔ بولا تو پندرہ بیس دن میں آئیں گے۔ خوب معلوم ہوا ہے۔

ہاں۔ وہی پہرے والے کہہ رہے تھے۔

کچھ معلوم ہوا کہاں گئے ہیں۔

وہی موقع دیکھنے گئے ہیں جہاں واردات ہوئی تھی۔

دیو دین چلم پینے لگا اور جالپا سڑک پر آکر ٹہلنے لگی۔ رما کی یہ توہین سن کر اس کا دل پاش پاش ہوا جاتا تھا۔ اُسے رما پر غصہ نہ آیا۔ رنج بھی نہ ہوا۔ بلکہ اسے ہاتھوں کا سہارا دیکر اس دلدل سے نکالنے کے لئے اس کا دل بے قرار ہو گیا۔ رما چاہے اسے دتکار ہی کیوں نہ دے اُسے ٹھکرا ہی کیوں نہ دے۔ مگر وہ اسے مصیبت کے اس غار میں نہ گرنے دے گی۔

جب دونوں یہاں سے چلے تو جالپا نے پوچھا۔ اس آدمی سے کہہ دیا ہے کہ جب وہ آئیں تو ہمیں خبر دے دے۔

ہاں کہہ دیا ہے۔

(۳۷)

ایک مہینہ گذر گیا۔ گوپی ناتھ پہلے تو کئی دن کلکتہ کی سیر کرتا رہا۔ مگر چار پانچ دن میں ہی یہاں سے اس کا جی ایسا اُچاٹ ہوا کہ گھر کی رٹ لگانی شروع کی۔ آخر جالپا نے اُسے لوٹا دینا ہی اچھا سمجھا۔ یہاں تو وہ چھپ چھپ کر رویا کرتا تھا۔

جالپا کئی بار رما کے بنگلہ تک ہو آئی۔ وہ جانتی تھی کہ ابھی رما نہیں آئے ہیں پھر

بھی وہاں کا ایک چکر لگا آنے میں اُسے ایک عجیب تسلی ہوئی تھی۔

جالیا کچھ پڑھتے پڑھتے یا بیٹھے بیٹھے تھک جاتی تو ایک لمحہ کے لئے کھڑکی کے سامنے آکھڑی ہوتی۔ ایک دن شام کو وہ کھڑکی کے سامنے آئی تو سڑک پر موٹروں کی قطار نظر آئی۔ تعجب ہوا اتنی موٹریں کہاں جاتی ہیں غور سے دیکھنے لگی کل چھ موٹریں تھیں ان میں پولیس کے افسر بیٹھے تھے۔ آخری موٹر پر اس کی نگاہ پڑی تو سارے جسم میں ایک برقی رَو سی دوڑ گئی وہ ایک محویت کے عالم میں کھڑکی سے زینے تک دوڑی ہوئی گئی۔ گویا موٹروں کو روک لینا چاہتی تھی۔ لیکن اتنی ہی دیر میں اسے معلوم ہو گیا کہ میرے نیچے پہنچتے پہنچتے موٹریں نکل جائیں گی۔ وہ پھر کھڑکی کے سامنے آگئی۔ رما اب بالکل سامنے آ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں کھڑکی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جالیا نے اشارہ سے کچھ کہنا چاہا لیکن حیا مانع ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ رما کی موٹر کچھ دھیمی ہو گئی ہے۔

دیبی دین کی آواز بھی سنائی دی۔ مگر موٹر رکی نہیں۔

جالیا نے زینہ پر آکر کہا۔ دادا!

دیبی دین نے سامنے آکر کہا۔ بھیا آ گئے وہ کیا موٹر جا رہی ہے۔

یہ کہتا ہوا وہ اُوپر گیا۔ جالیا نے شوخی تجسّس کو شرم سے دباتے ہوئے کہا۔ تم سے کچھ کہا۔

دیبی۔ اور کیا کہتے۔ کھالی رام رام کی۔ میں نے خیریت پوچھی۔ دونوں ہاتھوں سے دلاسا دیتے چلے گئے۔ تم نے دیکھا نہیں۔

جالیا نے سر جھکا کر کہا۔ دیکھا کیوں نہیں کھڑکی پر کھڑی تھی۔

انہوں نے بھی تمہیں دیکھا ہو گا۔

کھڑکی کی طرف تو تاکتے تھے۔

بہت چکرائے ہوں گے کہ یہ کون ہے۔

کچھ معلوم ہوا مقدمہ کب پیشی ہو گا۔

کل ہی تو۔

تب تو جو کچھ کرنا ہے آج ہی کر لینا چاہیئے۔ میرا خط کسی طرح انہیں مل جاتا تو کام بن جاتا۔

دیو دین نے اس طرح دیکھا گویا کہہ رہا ہے تم اس کام کو جتنا آسان سمجھتی ہو اتنا آسان نہیں ہے۔

جالپا نے اس کے دل کی کیفیت سمجھ کر کہا۔ کیا تمہیں شبہ ہے کہ وہ اپنا بیان تبدیل کرنے پر راضی نہ ہونگے۔

دیو دین کہ اب اسے تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ بولا۔ ہاں بہوجی! مجھے اس کا بہت بڑا اندیشہ ہے اور سچ پوچھو تو ہے بھی جوکھم۔ اگر وہ بیان بدل بھی دیں تو پولیس کے پنجے سے چھوٹ نہیں سکتے۔ وہ کوئی دوسرا الزام لگا کر انہیں پھر پکڑے گی اور کوئی نیا مقدمہ چلا دے گی۔

جالپا نے ایسی نظروں سے دیکھا گویا اسے اس کا بالکل اندیشہ نہیں ہے۔ پھر بولی دادا میں انہیں پولیس کے پنجے سے بچانے کا ٹھیکہ نہیں لیتی۔ میں صرف یہی چاہتی ہوں کہ ممکن ہو تو انہیں رسوائی سے بچاؤں۔ اگر وہ سچ مچ ڈکیتیوں میں شریک ہوتے تب بھی میں یہی چاہتی کہ آخر تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہیں۔ میں یہ کبھی پسند نہ کرتی کہ وہ دوسروں کو دغا دے کر مخبر بن جائیں۔ لیکن یہ معاملہ تو بالکل جھوٹ ہے۔ میں یہ کسی طرح نہیں برداشت کر سکتی کہ وہ اپنی غرض کے لئے جھوٹی شہادت دیں۔ اگر انہوں نے اپنا بیان نہ بدلا تو میں عدالت میں جا کر ساری قلعی کھول دوں گی۔ نتیجہ کچھ بھی ہو۔ وہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے قطع تعلق کر لیں۔ میری صورت نہ دیکھیں۔ یہ مجھے منظور ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اتنے بے گناہ کا خون ان کی گردن پر ہو۔

دیبی دین نے اُسے عقیدت کی نگاہوں سے دیکھو کہا۔ تم سب کچھ کر لوگی بہو جی۔ اب مجھے بسواس ہو گیا۔ جب تم نے کلیجہ اتنا مضبوط کر لیا ہے تو تم سب کچھ کر سکتی ہو۔

تو یہاں سے نو بجے چلیں۔

میں تیار ہوں۔

(۳۸)

وہ رما ناتھ جو پولیس کے خوف سے باہر نہ نکلتا تھا جو دیبی دین کے گھر میں چور وں کی طرح پڑا زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ آج دو مہینوں سے رئیسانہ عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا ہے۔ آسائش کے سبھی سامان موجود ہیں۔ خدمت کے لئے چوکیداروں کی ایک فوج کھانا پکانے کے لئے کاشمیری باورچی۔ بڑے بڑے افسر اس کی دلجوئی کرتے رہتے ہیں۔ اس کے منہ سے بات نکلی نہیں کہ پوری ہوئی۔ اتنے ہی دنوں میں اس کے مزاج میں اتنی نفاست آگئی ہے گویا وہ خاندانی رئیس ہو۔ اسے کبھی اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ کتنے ہی بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ رہا ہوں اسے اپنی حالت پر غور کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا جاتا۔ رات کو وہ افسروں کے ساتھ سنیما یا تھیٹر دیکھنے جاتا ہے۔ شام کو موٹروں کی سیر ہوتی ہے۔ دلچسپی کے نت نئے سامان مہیا ہوتے رہتے ہیں۔ جس دن مجسٹریٹ نے ملزموں کو سشن سپرد کیا سب سے زیادہ خوشی رما کو ہوئی۔ گویا اس کی خوش نصیبی کا تارا طلوع ہو رہا ہے۔

پولیس کو معلوم تھا کہ سشن جج کی عدالت میں یہ گھر کی کھیتی نہ ہوگی۔ اتفاق سے جج صاحب ہندوستانی تھے۔ اور حق پروری کے لئے بدنام۔ پولیس ہو یا ملزم ان کی نگاہ میں دونوں برابر تھے۔ وہ کسی کے ساتھ رعایت نہ کرتے تھے۔ اس لئے

پولیس نے ایک بار رما کو ان مقامات سے روشناش کرا دینا ضروری سمجھا۔ جہاں واردا تیں ہوئی تھیں۔ ایک زمیندار کے سجے سجائے بنگلہ میں یہ جماعت فروکش ہوئی۔ دن بھر لوگ شکار کھیلنے رات کو گراموفون سنتے تاش کھیلتے یا بجرے پر ندی کی سیر کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شہزادا شکار کھیلنے آیا ہے۔ ان دلچسپیوں میں رما کو کوئی آرزو تھی تو یہ کہ جالپا بھی یہاں ہوتی۔ اب تک وہ محتاج تھا مفلس تھا اس کی خواہشیں گویا نیم جان ہو رہی تھیں۔ نسیم کے ان ٹھنڈے جھونکوں نے انھیں بیدار کر دیا۔ وہ اس خیال سے خوش تھا کہ یہ مقدمہ ختم ہوتے ہی اسے کوئی عہدہ مل جائے گا تب وہ جا کر جالپا کو منا لائے گا۔ اور زندگی کے لطف اٹھائے گا وہاں وہ ایک نئی زندگی ہوگی۔ اس کے اصول کچھ اور ہوں گے معیار کچھ اور ہوں گے۔ اس میں سخت پابندیاں ہوں گی۔ اور بیدارانہ بندشیں۔ اب اس کی زندگی کا کچھ مقصد ہوگا۔ کچھ نصب العین ہوگا محض کھانا سونا اور روپے کے لئے ہائے ہائے کرنا ہی مآل زندگی نہ ہوگا۔ اسی مقصد کے ساتھ اس بے اصولانہ زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ نفس کی گہرائیوں نے اسے یہ دن دکھایا تھا اور اب تک نئے بے لوث زندگی کا خواب دکھا رہی تھی۔ شرابیوں کی طرح ایسے اشخاص بھی روز ہی پاک ارادے کرتے ہیں۔ لیکن ان ارادوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔ نئی نئی ترغیبیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ اور آغازِ اصلاح کی معیاد ٹلتی چلی جاتی ہے۔ نئی سحر کا طلوع کبھی نہیں ہوتا۔

ایک مہینہ دیہات کی سیر کرنے کے بعد رما اپنے نازبرداروں کے ساتھ اپنے بنگلہ پر جا رہا تھا راستہ دیبی دین کے گھر کے سامنے سے تھا۔ کچھ دور ہی سے اپنا کمرہ دکھائی دیا۔ اس کی نگاہیں خواہ مخواہ اوپر اٹھ گئیں۔ کھڑکی کے سامنے کوئی کھڑا تھا اس نے سوچا اس وقت دیبی دین وہاں کیا کر رہا ہے ذرا غور سے دیکھا یہ تو کوئی عورت معلوم دیتی ہے۔ مگر عورت کہاں سے آئی۔ دیبی دین نے وہ کمرہ کرایہ پر تو نہیں

اٹھا دیا۔ ایسا تو شاید وہ کیا کرے گا۔ موٹر حسب اور قریب آئی تو اس عورت کا چہرہ صاف نظر آنے لگا۔ رما چونک پڑا۔ یہ تو جالپا ہے بے شک جالپا ہے مگر نہیں۔ جالپا یہاں کیسے آوے گی۔ میرا پتہ ٹھکانہ اسے کہاں معلوم۔ کہیں بڈھے نے اسے خط تو نہیں لکھ دیا ہے تو جالپا ہی۔ نائب داروغہ موٹر چلا رہا تھا۔ رما نے بڑی منت کے ساتھ کہا۔ سردار صاحب ایک لمحہ کے لئے رک جایئے میں ذرا دیر دین سے ایک بات کرلوں نائب نے موٹر دھیمی کرلی۔ لیکن پھر سوچ کر اُسے آگے بڑھا دیا۔

رما نے تیز ہوکر کہا۔ آپ تو مجھے قیدی سمجھ رہے ہیں۔

نائب نے خفیف ہوکر کہا۔ آپ تو جانتے ہیں ڈپٹی صاحب کتنا جامے سے باہر ہوجاتے ہیں۔

بنگلہ پر پہنچکر رما سوچنے لگا کہ جالپا سے کیسے ملوں۔ وہ جالپا ہی تھی۔ اس میں اسے کچھ ذرا بھی شبہ نہ تھا۔ آنکھوں کو کیسے دھوکا دیتا۔ دل میں ایک طوفان اُٹھا ہوا تھا کیا کرے کیسے جائے۔ اسے کپڑے اتارنے کی یاد بھی نہ رہی تھی۔ پندرہ منٹ تک وہ کمرے کے دروازے پر کھڑا رہا۔ کوئی حکمت نہ سوجھی۔ لاچار پلنگ پر لیٹ رہا ذرا دیر میں وہ پھر اُٹھا۔ اور سامنے صحن میں نکل آیا پھاٹک پر چوکیدار کھڑا تھا۔ سڑک پر اسی وقت بجلی روشن ہوگئی۔ رما کو چوکیدار پر ایسا غصہ آیا کہ گولی ماردے۔ سوچنے لگا اگر مجھے کوئی اچھی جگہ مل گئی تو ایک ایک سے سمجھونگا۔ نہیں تو ڈسمس کرا کے چھوڑ دوں گا کیسا شیطان کی طرح سر پر سوار ہے منہ تو دیکھو ذرا معلوم ہوتا ہے بکری کی دُم ہے۔ واہ رے آپ کی پگڑی۔ کوئی ٹوکری ڈھونے والا قلی ہے ابھی کُتا بھونک پڑے تو آپ دُم دبا کر بھاگیں گے۔ مگر یہاں ایسے ڈٹے کھڑے ہیں گویا کسی قلعہ کے دروازے کی حفاظت کر رہے ہیں۔

ایک چوکیدار نے آکر کہا۔ انسپکٹر صاحب نے بلایا ہے۔ رما جسکے کپڑے اُتارے

منگوائے ہیں۔ رما نے جھلّا کر کہا۔ مجھے فرصت نہیں ہے۔ پھر سوچنے لگا جالپا اس وقت یہاں کیسے آئی۔ اکیلی آئی ہے یا اور کوئی ساتھ ہے۔ ظالم نے بڈھے سے ایک منٹ بھی بات نہ کرنے دیا۔ جالپا پوچھے گی تو ضرور کہ کیوں بھاگے تھے۔ صاف صاف کہہ دونگا اس وقت اور کر ہی کیا سکتا تھا مگر ان تھوڑے دنوں کی تکلیف نے زندگی کا مسئلہ تو حل کر دیا۔ اب لطف سے زندگی تو کٹے گی۔ کوشش کر کے اسی طرف اپنا تبادلہ کروالوں گا۔ یہ سوچتے سوچتے رما کو خیال آیا کہ جالپا بھی میرے ساتھ یہاں رہے تو کیا ہرج ہے جیسے باہر والوں سے ملنے کی ممانعت ہے۔ جالپا کے لئے رکاوٹ ہو سکتی ہے لیکن اس وقت اس مسئلہ کو چھیڑنا مناسب نہیں کل اس کا تصفیہ کر دونگا۔ دیبی دین بھی عجیب آدمی ہے پہلے تو کئی بار آیا۔ مگر آج اس نے بھی چپ سادھ لی۔ کم سے کم اتنا تو ہو سکتا تھا کہ آکر پہرہ والے کانسٹبل کی معرفت مجھے جالپا کے آنے کی خبر دیتا پھر میں دیکھتا کون جالپا کو نہیں آنے دیتا۔

رسویا تھالی لایا گوشت ایک قسم کا تھا۔ رما تھالی دیکھتے ہی جھلّا اٹھا۔ ان دنوں لذیذ کھانا دیکھ کر ہی اُسے بھوک لگتی تھی۔ جب تک چار پانچ قسم کا گوشت نہ ہو، چٹنی اچار نہ ہو اسے کھانے سے رغبت نہ ہوتی تھی۔ بگڑ کر بولا۔ کیا کھاؤں تمہارا سر۔ تھالی اٹھالے جاؤ۔

رسوئیے نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ حضور اتنی جلد اور چیزیں کیسے بناتا۔ ابھی کل دو گھنٹے تو آئے ہوئے ہیں۔

دو گھنٹے تمہارے لئے تھوڑے ہوتے ہیں۔

اب حضور سے کیا کہوں۔

مت بکو۔

حضور۔

مت بکو۔ ڈیم

رسوئیے نے پھر کچھ نہ کہا۔ بوتل لایا برف توڑ کر گلاس میں ڈالی اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

رما کو اس وقت ایسا غصّہ آرہا تھا کہ رسوئیے کو نوچ کھائے۔ اس کا مزاج ان دنوں بہت تیز ہو گیا تھا۔

شراب کا دور شروع ہوا تو رما کا غصّہ اور بھی تیز ہوا۔ لال لال آنکھیں نکال کر بولا۔ چاہوں تو ابھی تمہارا کان پکڑ کر نکال دوں۔ ابھی اسی دم۔ تم نے سمجھا کیا ہے۔

اس کا غصّہ بڑھتا ہوا دیکھ کر رسویا چپکے سے سرک گیا۔ رما نے گلاس لیا اور دو چار لقمے کھا کر باہر صحن میں ٹہلنے لگا۔ دُھن سوار تھی کیسے یہاں سے نکل جاؤں۔ یکا یک اُسے ایسا معلوم ہوا کہ تار کے باہر درختوں کی آڑ میں کوئی ہے۔ ہاں کوئی کھڑا اس کی طرف تاک رہا ہے شاید اشارے سے اپنی طرف بُلا رہا ہے۔ رما کا دل دھڑکنے لگا۔ کہیں مفسدوں نے اس کی جان لینے کی تو نہیں ٹھانی ہے۔ یہ خدشہ اُسے ہمیشہ لگا رہتا تھا۔ اسی خوف سے وہ رات کو بنگلے کے باہر بہت کم نکلتا تھا۔ حفظِ جان کے اندیشے نے اُسے اندر چلے جانے کی تحریک کی۔ اسی وقت ایک موٹر سڑک سے نکلی اس کی روشنی میں رما نے دیکھا وہ اندھیرا سایہ کسی عورت کا ہے اس کی ساڑھی صاف نظر آرہی تھی۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ وہ عورت اس کی طرف آرہی ہے۔ پھر خیال آیا کوئی مرد اس صورت میں میرے ساتھ دغا تو نہیں کر رہا ہے۔ وہ جیوں جیوں پیچھے ہٹتا تھا وہ سایہ اس کی طرف بڑھتا چلا آتا یہاں تک کہ تار کے پاس آکر اس نے کوئی چیز رما کی طرف پھینکی۔ رما چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا مگر دیکھا تو صرف ایک لفافہ تھا اس لئے کچھ تسکین ہوئی۔ وہ سایہ بھی تاریکی میں غائب ہو گیا تھا۔ رما نے لپک کر وہ لفافہ اٹھا

لیا خوف بھی تھا اور تعجب بھی۔ خوف کم تھا تعجب زیادہ۔ لفافہ کو جیب میں چھپائے وہ کمرے میں آیا۔ دونوں طرف کے دروازے بند کر لئے اور لفافہ کو ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا۔ سرنامہ دیکھتے ہی اس کے دل میں پھریریاں سی اڑنے لگیں۔ تحریر جا لپا کی تھی فوراً لفافہ کھولا۔ ایک ہی سانس میں سارا خط پڑھ گیا اور ایک لمبی سانس لی۔ اسی سانس کے ساتھ توہمات کا وہ بوجھ جس نے چھ ماہ سے اس کی روح کو دبا رکھا تھا وہ سارا دردِ دل جو اس کے خونِ حیات کو چوسے ڈالتا تھا۔ وہ ساری کمزوری شرم اور خفت جیسے چھومنتر ہو گئی۔ اسے اتنی تقویت اتنا غرور اور اپنے اوپر اتنا اعتماد کبھی نہ ہوا تھا۔ پہلی ترنگ یہ سوار ہوئی۔ ابھی چل کر داروغہ سے کہہ دوں۔ مجھے اس مقدمہ سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن پھر خیال آیا بیان تو اب ہو ہی چکا۔ جتنی رسوائی ہونی تھی ہو چکی۔ اب گناہ کی لذت سے کیوں ہاتھ دھوؤں۔ مگر ان ظالموں نے مجھے کیسا دھوکا دیا ہے کیسا چکمہ دیا ہے اور ابھی تک مغالطہ میں ڈالے ہوئے ہیں سب کے سب میری دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ مگر ابھی تک اصلی راز مجھ سے چھپائے ہوئے ہیں۔ اب بھی ان پر مجھے اعتبار نہیں ہے اگر اسی بات پر اپنا بیان بدل دوں تو نا طقہ بند ہو جائے۔ یہی تو ہوگا مجھے کوئی جگہ نہ ملے گی۔ بلا سے ان لوگوں کے منصوبے تو خاک میں مل جائیں گے۔ اس دغا بازی کی سزا تو مل جائے گی۔ اور کچھ بھی نہ سہی اتنی بڑی بدنامی سے تو بچ جاؤں گا۔ یہ سب شرارت ضرور کریں گے۔ لیکن جھوٹا الزام لگانے کے سوا کر ہی کیا سکتے ہیں۔ جب میرا یہاں رہنا ثابت ہی نہیں تو مجھ پر الزام ہی کیا لگ سکتا ہے سبھوں کے منہ میں کالکھ لگ جائے گی ایک ایک کو اپنی جان کی خیر منانی پڑے گی۔ انہیں چکمہ دوں گا کہہ دوں گا اگر آج مجھے کوئی اچھی جگہ مل جائے گی تو میں شہادت دوں گا۔ ورنہ صاف کہہ دوں گا اس معاملہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ نہیں تو مجھے سے چھوٹے موٹے نکلنے میں نائب داروغہ بنا کر بھیج دیں اور وہاں سڑا کروں۔ تو نگا انسپکٹری اور

کل دس بجے تک میرے پاس تقرری کا پروانہ آجائے۔ وہ چلا کہ اسی وقت دروغہ سے کہے لیکن پھر رک گیا۔ ایک بار جالیا سے ملنے کے لئے اس کی جان تڑپ رہی تھی۔ جالیا سے اتنی محبت اتنی شیفتگی اتنی عقیدت اسے کبھی نہ ہوئی تھی۔ گویا وہ کوئی غیبی طاقت ہے جسے دیوتاؤں نے اس کی حفاظت کے لئے بھیجا ہو۔

دس بج گئے تھے۔ رمانا تھ نے بجلی گل کر دی اور برآمدے میں آکر زور سے کواڑ بند کر لئے جس میں پہرے والے سپاہی کو معلوم ہو اندر سے کواڑ بند کر کے سو رہے ہیں۔ وہ اندھیرے برآمدے میں ایک منٹ تک کھڑا رہا تب آہستہ سے اترا اور کانٹے دار کے پاس آکر سوچنے لگا۔ اس پار کیسے جاؤں شاید جالیا ابھی باغیچہ میں ہو۔ دیبی دین ضرور اس کے ساتھ ہوگا۔ صرف یہ تار اس کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ اسے پھاندجانا غیر ممکن تھا اس نے تاروں کے بیچ میں ہو کر نکل جانے کا ارادہ کیا اپنے سب کپڑے سمیٹ لئے اور کانٹوں کو بچاتے ہوئے سر اور کندھے کو تار کے بیچ میں ڈالا۔ مگر نہ جانے کیونکر کپڑے پھنس گئے۔ ہاتھ سے کپڑوں کو چھڑانا چاہا تو آستین کانٹوں میں پھنس گئی۔ دھوتی بھی الجھی ہوئی تھی۔ بے چارہ بڑی مصیبت میں پڑا نہ اس پار جا سکتا تھا نہ اس پار۔ ذرا سی بھی غلطی ہوئی اور کانٹے اس کے جسم میں چبھ جائیں گے۔

مگر اس وقت اسے کپڑوں کی پرواہ نہ تھی اس نے گردن اور آگے بڑھائی۔ اور کپڑوں میں لمبا چیرا لگاتا ہوا اس پار نکل گیا۔ سارے کپڑے تار تار ہو گئے۔ پیٹھ میں بھی کھروچے لگے۔ مگر اس وقت کوئی بندوق کا نشانہ باندھ کر بھی اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا تو وہ پیچھے نہ ہٹتا۔ پھٹے ہوئے کپڑوں کو اس نے وہیں پھینک دیا۔ گلے کی چادر پھٹ جانے پر بھی کام دے سکتی تھی۔ اسے اوڑھ لیا دھوتی سمیٹ لی اور باغیچہ میں گھومنے لگا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ شاید رکھوالا کھٹک کھانے گیا ہوا تھا اس نے دو۲ تین بار آہستہ آہستہ جالیا کا نام لے کر پکارا۔ کسی کی آہٹ نہ ملی۔

سمجھ گیا جا لیا جلی گئی، وہ انہی بیروں دیبی دین کے گھر کی طرف چلا۔ اسے مطلق خوف نہ تھا بلا سے کسی کو معلوم ہو جائے کہ میں بنگلے سے نکل آیا ہوں۔ پولیس میرا کر ہی کیا سکتی ہے، میں قیدی نہیں ہوں، کسی کی غلامی نہیں کھائی ہے۔

آدھی رات ہو گئی تھی۔ دیبی دین آدھہ گھنٹہ پہلے لوٹا تھا اور کھانا کھانے جا رہا تھا کہ ایک ننگ دھڑنگ آدمی کو دیکھ کر چونک پڑا۔ رمانے چادر سر پہ باندھ لی تھی اور دیبی دین کو ڈرانا چاہتا تھا۔

دیبی دین نے ہکبکا کر کہا۔ کون ہے؟

پھر رمانا تھ کو پہچان گیا اور جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ تم نے تو بھیا کھوب بھیس بنایا ہے کپڑے کیا ہوئے۔

تار سے نکل رہا تھا سب اس کے کانٹوں میں اُلجھ کر پھٹ گئے۔

رام رام بدن میں تو کانٹے نہیں چبھے۔

کچھ نہیں۔ دو ایک کھروچنے لگے ہیں رہیں بہت بچ کر نکلا۔

بہو کا خط تو مل گیا تھا۔

ہاں اسی وقت مل گیا تھا۔ کیا وہ بھی تمہارے ساتھ تھیں۔

وہ میرے ساتھ تو نہیں تھیں، میں ان کے ساتھ تھا جب سے تمہیں موٹر پہ آتے دیکھا، تبھی سے جانے جانے لگا کے ہوئے تھیں۔

تم نے گھر میں کوئی خط لکھا تھا۔

میں نے کوئی خط وط نہیں لکھا بھیا۔ جب وہ آئیں تو مجھے خود اچنبھا ہوا کہ بغیر جانے بوجھے کیسے آگئیں۔ پیچھے انہوں نے بتایا وہ شطرنج والا نقشہ انہیں نے پراگ راج سے بھیجا تھا اور انعام بھی وہیں سے آیا تھا۔

رما حیرت میں آگیا۔ جالپا کی دانشمندی نے استعجاب میں ڈال دیا۔ اس کے

ساتھ ہی اپنی شکست کے خیال نے اُسے کچھ ملول بھی کر دیا۔ یہاں بھی اس کی ہار ہوئی۔

بڑھیا اُوپر گئی ہوئی تھی۔ دین دین نے زینے کے پاس جا کر کہا۔ ارے کیا کرتی ہے بہو سے کہہ دے ایک آدمی ان سے ملنے آیا ہے۔

یہ کہہ کر دین دین نے رما کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ چلو اب سرکار میں تمہاری پیشی ہو گی۔ رہبت بھلے گئے تھے بغیر وارنٹ کے پکڑے گئے۔

رما کا ولولہ اور اشتیاق اُڑا جاتا تھا۔ اس کی شرم اس کے سر پہ سوار ہوتی جاتی تھی۔ جالپا کے سوالوں کا اس کے پاس کیا جواب تھا۔ جس خوف سے وہ بھاگا تھا اس نے بالآخر اس کا پیچھا کر کے اسے مغلوب کر ہی دیا۔ وہ جالپا کے سامنے آنکھیں کیونکر سیدھی کر سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ چھڑا لیا اور زینہ کے پاس ٹھٹھک گیا۔ دین دین نے پوچھا کیوں رک گئے۔

رما نے سر کھجلاتے ہوئے جواب دیا۔ چلو میں آتا ہوں۔ بڑھیا نے اوپر ہی سے کہا۔ پوچھو کون آدمی ہے۔ کہاں سے آیا ہے۔

دین دین نے دلگی کی۔ کہتا ہے اب جو کچھ کہونگا بہو سے کہونگا۔

کوئی چٹھی لایا ہے۔

نہیں۔

سناٹا ہو گیا۔ دین دین نے ایک لمحہ کے بعد کہا۔ کہہ دوں لوٹ جائے۔

جالپا زینہ پر آ کر بولی۔ کون آدمی ہے پوچھتی تو ہوں۔

کہتا ہے بڑی دور سے آیا ہوں۔

ہے کہاں۔

یہ کیا کھڑا ہے۔

اچھا بلا لو۔

رما چادر اوڑھے کچھ جھجکتا کچھ جھینپتا کچھ ڈرتا زینہ پر چڑھا رجا لیا اسے دیکھتے ہی فوراً دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ دیبی دین وہاں نہ ہوتا تو وہ دو قدم آگے بڑھی ہوتی۔ جا لیا کی آنکھوں میں کبھی اتنا سرور نہ تھا جسم میں کبھی اتنی چستی نہ تھی رخسار دل پر کبھی اتنی چمک نہ تھی، سینہ میں کبھی اتنا ارتعاش نہ تھا۔ آج اس کی تمنا پوری ہوئی۔

(۳۹)

ساری رات باتوں میں گذر گئی۔ دونوں ہی کو اپنی چھ مہینے کی داستان کہنی تھی۔ رما نے اپنا وقار جمانے کے لئے اپنی خستہ حالی کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا۔ جالپا نے اپنی داستان میں اپنی تکلیفوں کا ذکر تک نہ کیا وہ ڈرتی تھی انہیں رنج ہوگا۔ لیکن رما کو اسے رُلانے میں مزا آرہا تھا۔ وہ کیوں بھاگا کس لئے بھاگا۔ یہ سارا قصہ اس نے درد ناک آواز میں سنایا اور جالپا نے سسک سسک کر سنا۔ وہ اپنی لفاظی سے اس پر رُعب جمانا چاہتا تھا۔ اب تک ہر ایک معاملے میں اس کی ہار ہوتی تھی، جو بات اسے محال معلوم ہوئی تھی اسے جالپا نے چٹکیوں میں پورا کر دکھایا تھا۔ شطرنج والے واقعہ کو وہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کر سکتا تھا۔ لیکن وہاں بھی جالپا ہی غالب رہی۔ پھر اس کے لئے اس کے سوا اور کیا تدبیر رہ گئی تھی کہ اپنی تکلیفوں کو رائی کا پربت بنا کر دکھائے۔

جالپا نے سسک کر کہا۔ تم نے یہ ساری کڑیاں جھیلیں اور مجھ کو ایک خط نہ لکھا کیوں لکھتے ہم سے ناتا ہی کیا تھا۔ منہ دیکھنے کی محبت تھی آنکھ اوٹ پہاڑ اوٹ۔

رما نے حسرت ناک لہجہ میں کہا۔ یہ بات نہیں جالپا۔ دل پر جو کچھ گذرتی تھی دل ہی جانتا ہے۔ لیکن لکھنے کا منہ بھی تو ہو۔ جب روپوش ہو کر گھر سے بھاگا تو اپنا قصۂ غم کیا لکھنے بیٹھتا۔ میں نے سوچ لیا تھا جب تک خوب روپے نہ کما لوں گا ایک لفظ بھی نہ لکھوں

گا۔

جالپا نے چشم پُرآب میں طنز بھر کر کہا، ٹھیک ہی تھا روپے آدمی سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں، ہم تو روپے کے یار ہیں۔ تم چاہے چوری کرو ڈاکہ مارو، جھوٹی گواہی دو، یا بھیک مانگو کسی طرح روپے لاؤ۔ تم نے میری عادت کو کتنا ٹھیک سمجھا ہے کہ واہ!

رما نے جھینپتے ہوئے کہا، نہیں نہیں جالپا یہ بات نہ تھی، میں یہی سوچتا تھا کہ ان پھٹے حالوں جاؤں گا کیسے، سچ کہتا ہوں مجھے سب سے زیادہ خوف تمہیں سے لگتا تھا سوچتا تھا تم مجھے کتنا دغاباز، مکار اور کچے دل کا سمجھ رہی ہو گی۔ شاید میرے دل میں یہ خیال تھا کہ روپے کی تھیلی دیکھ کر تمہارا دل کچھ تو نرم ہوگا۔

جالپا نے اسی ستم ظریفانہ لہجہ میں کہا، تو تمہارا وہ خیال غلط تھا، میں شاید اس تھیلی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں۔ آج مجھے معلوم ہو گیا تم نے مجھے کتنا خود غرض سمجھتے ہو۔ اس میں تمہاری کوئی خطا نہیں، ساری خطا میری ہے، اگر میں بھلی ہوتی تو آج یہ دن کیوں آتا، جو آدمی تیس چالیس روپے مہینہ کا نوکر ہو اس کی بیوی اگر دو چار روپے خرچ کرے، ہزار دو ہزار کے زیور پہنے تو وہ اپنی اور اپنے شوہر کی تباہی کا سامان کر رہی ہے اگر تم نے مجھے اتنا بندۂ زر سمجھا تو کوئی بے انصافی نہیں کی، مگر ایک بار جس آگ میں جل چکی اس میں پھر نہ کودوں گی، ان چند مہینوں میں میں نے ان گناہوں کا کفارہ ادا کیا ہے اور جو کچھ باقی ہے وہ آخری دم تک کرتی رہوں گی۔ یہ میں نہیں کہتی کہ عیش و آرام سے میرا جی بھر گیا، یا میرے گہنے کپڑے سے میں اوب گئی، یا سیر تماشہ سے مجھے نفرت ہو گئی، یہ ساری تمنائیں جوں کی توں ہیں، اگر تم اپنے قوتِ بازو سے اپنی جانفشانی سے انہیں پورا کر سکو تو کیا کہنا، لیکن نیت کھوٹی کر کے یا ضمیر کا خون کر کے ایک لاکھ بھی لاؤ تو میں اسے ٹھکرا دوں گی، جس وقت مجھے معلوم ہوا کہ تم پولیس کے گواہ بن گئے ہو مجھے اتنا رنج ہوا کہ دیبی دادا کو ساتھ لے کر تمہارے بنگلے تک گئی اسی

دن تم باہر چلے گئے تھے۔ میں اتنے آدمیوں کا خون اپنی گردن پر نہیں لینا چاہتی۔ تمہیں بیان واپس لینا پڑے گا۔

رما فکرمند ہو کر بولا۔ جب سے تمہارا خط ملا، میں اسی معاملہ پر غور کر رہا ہوں۔ لیکن بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ایک بات کہہ کر مکر جانے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔

بیان تو بدلنا ہی پڑے گا۔

آخر کیسے؟

مشکل کیا ہے۔ جب انہیں معلوم ہو گیا کہ میونسپلٹی تمہارے اوپر کوئی مقدمہ نہیں چلا سکتی تو پھر کس بات کا ڈر۔

ڈر نہ ہو۔ حجاب بھی تو کوئی چیز ہے جس منہ سے ایک بات کہی، اسی منہ سے مکر جاؤں۔ یہ تو مجھ سے نہ ہوگا۔ پھر مجھے کوئی اچھی جگہ مل جائے گی۔ آرام سے زندگی بسر ہوگی۔ مجھ میں گلی گلی ٹھوکر کھانے کا بوتا نہیں ہے۔

جالپا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہی تھی انسان کتنا خود غرض ہوتا ہے۔

رما نے پھر پہلو بدلا۔ اور کچھ میری شہادت پر ہی تو سارا فیصلہ نہیں ہوا جاتا۔ میں بدل بھی جاؤں تو پولیس نہایت آسانی سے کوئی دوسرا گواہ کھڑا کر دے گی۔ ملزموں کی جان تو کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ ہاں میں مفت میں مارا جاؤں گا۔

جالپا نے ترش ہو کر کہا۔ کیسی بے شرمی کی باتیں کرتے ہو جی۔ کیا تم اتنے گئے گزرے ہو کہ تمہیں اپنی روٹیوں کے لئے دوسروں کا گلا کاٹنا پڑے۔ میں اسے نہیں برداشت کر سکتی مجھے مزدوری کرنا، بھوکوں مر جانا منظور ہے لیکن کسی کا برا چیتے کر میں جنت کا راج بھی نہیں لے سکتی۔

رما چڑھ کر بولا۔ تو کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں یہاں قلی گیری کروں۔

جالپا۔ نہیں میں یہ نہیں چاہتی۔ لیکن اگر قلی گیری بھی کرنی پڑے تو وہ خون چیڑی ہوئی روٹیاں کھانے سے کہیں بڑھ کر ہے۔

رما نے تحمل کے ساتھ کہا۔ جالپا تم مجھے جتنا کمینہ سمجھتی ہو اتنا کمینہ میں نہیں ہوں۔ بُری بات ہر ایک کو بُری لگتی ہے۔ مجھے بھی اس بات کا رنج ہے کہ میرے ہاتھوں اتنے آدمیوں کا خون ہو رہا ہے۔ لیکن حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ تم مجھے کیوں اس اونچائی پر چڑھانا چاہتی ہو جہاں پر پہنچنے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔

جالپا نے پُر ملامت تبسّم کے ساتھ کہا۔ جس آدمی میں خون کرنے کی طاقت ہو اس میں خون نہ کرنے کی طاقت کا نہ ہونا تعجب کی بات ہے۔ جس میں دوڑنے کی طاقت ہو اس میں کھڑے ہونے کی طاقت نہ ہو اسے کون باور کرے گا۔ جب ہم کوئی کام کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں تو طاقت آپ ہی آپ آجاتی ہے۔ تم بیٹھے کر لو کہ تمہیں بیان بدلنا ہے بس اور ساری باتیں آپ ہی آپ آجائیں گی۔

رما سر جھکائے سنتا رہا۔

جالپا نے پھر اسی رو میں کہا۔ اگر تمہیں یہ پاپ کی کھیتی کرنی ہے تو مجھے آج ہی یہاں سے رخصت کر دو۔ میں آج منہ میں کالکھ لگا کر چلی جاؤں گی۔ پھر تمہیں دق کرنے نہ آؤں گی۔ تم زندگی کے مزے اٹھانا۔ میں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھر لوں گی۔

رما کے دل میں کچھ چوٹ لگی۔ سر کھجلا کر بولا۔ چاہتا تو میں بھی ہوں کہ کسی طرح میری گلو خلاصی ہو جائے۔

جالپا نے جواب دیا تو پھر کرتے کیوں نہیں۔ اگر تمہیں کہتے شرم آتی ہے تو میں کہوں یہی اچھا ہوگا میں تمہارے ساتھ چلی چلوں گی اور تمہارے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے سارا ماجرا کہہ سناؤں گی۔

رما کا پس و پیش غائب ہو گیا۔ اپنی اتنی ذلت وہ کرانا نہ چاہتا تھا بولا۔ تمہارے

پچلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جالیا میں اُن لوگوں کو سمجھا لونگا۔

جالیا نے مزید اطمینان کے لئے پوچھا۔ تو وعدہ کرتے ہو۔ اپنا بیان بدل دو گے؟

رما نے سرگرمی سے کہا۔ ہاں کہتا تو ہوں۔

میرے کہنے سے یا اپنے دل سے۔

تمہارے کہنے سے نہیں اپنے دل سے۔ مجھے خود ایسی باتوں سے نفرت ہے کچھ جھجک تھی وہ تم نے نکال دی۔

پھر اور باتیں ہونے لگیں۔ کیسے پتہ چلا کہ رما نے روپے خرچ کر ڈالے۔ روپے ادا کیسے ہو گئے۔ رتن پر کیا گزری؟ گوپی کیوں اتنی جلدی بھاگ گیا۔ دونوں کچھ کچھ پڑھ رہے ہیں یا اسی طرح آوارہ پھر رہے ہیں۔ اماں تو بہت نہیں روتی ہیں۔ دادا کے کیا رنگ ڈھنگ ہیں۔ یہ ساری باتیں ہوئیں۔ پھر زندگی کے منصوبے باندھے جانے لگے۔

جالیا نے کہا۔ چلو وہاں رتن سے تھوڑی زمین لے لیں اور کھیتی باڑی کریں!

رما نے کہا۔ اس سے کہیں اچھا ہے کہ یہاں چائے کی دکان کھول لیں۔ اس پر دونوں میں مباحثہ ہوا۔ آخر رما کو ہار ماننی پڑی۔ یہاں رہ کر وہ گھر کی دیکھ بھال نہ کر سکتا تھا۔ بھائیوں کی نگرانی نہ کر سکتا تھا۔ اور ماں باپ کی کچھ خدمت نہ کر سکتا تھا۔ آخر گھر والوں کے ساتھ بھی تو اس کا کچھ فرض ہے۔ رما لاجواب ہو گیا۔

(۴۰)

رما منہ اندھیرے بنگلہ پر پہنچا کسی کو شبہ نہ ہوا۔

ناشتہ کر کے رما نے خط صاف کیا اور داروغہ کے پاس پہنچا۔ تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ داروغہ نے پوچھا۔ خیریت تو ہے نوکروں نے کوئی شرارت تو نہیں کی۔

رما نے کھڑے کھڑے جواب دیا۔ نوکروں نے شرارت نہیں کی۔ ہاں آپ نے اور

آپ کے افسروں نے اور ماتحتوں نے مجھے چرکا دیا ہے۔

داروغہ نے کچھ پریشان ہو کر پوچھا۔ آخر بات کیا ہے کچھ کہئے تو؟

رما۔ بات یہی ہے کہ میں اس معاملے میں اب مطلق شہادت نہیں دونگا۔ آپ لوگوں نے مجھے دغا دی اور وارنٹ کی دھمکی دے کر مجھے شہادت پر مجبور کیا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے اوپر کسی قسم کا الزام نہیں ہے۔ میں پولیس کی طرف سے شہادت نہیں دینا چاہتا۔ میں آج جج صاحب سے صاف کہہ دوں گا۔

داروغہ نے اُسے مرعوب کرنے کی کوشش کر کے کہا۔ آپ نے خود غبن تسلیم کیا تھا۔

رما۔ وہ میزان کی غلطی تھی، غبن نہ تھا۔

یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔

اس سے آپ کو کوئی بحث نہیں۔ میں شہادت نہ دونگا۔ جن تاریخوں کا یہ وقوعہ ہے۔ ان تاریخوں میں میں الہ آباد میں تھا۔ میونسپل آفس میں میری حاضری درج رجسٹر ہے۔

داروغہ نے اس معاملہ کو ہنسی میں اڑا کر کہا۔ اچھا صاحب پولیس نے آپ کو دھوکہ دیا۔ لیکن اس کا خاطر خواہ انعام تو دینے کو حاضر ہے۔ کوئی اچھی جگہ مل جائے گی موٹر پر بیٹھے سیر کرو گے۔ خفیہ پولیس کی کوئی جگہ مل گئی تو چین ہی چین ہے۔ سوچو سرکار کی نظروں میں کتنا رسوخ بڑھ گیا۔ یوں مارے مارے پھرتے یوں کہو کہ تمہاری ترقی کا دروازہ کھل گیا۔ اچھی کارگذاری دکھائی تو ایک دن رائے بہادر ہو جاؤ گے۔ تمہیں ہمارا احسان ماننا چاہیئے اور آپ اُلٹے خفا ہوتے ہیں۔

رما پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ بولا۔ میں ایسی ترقی سے درگذرا۔ وہ آپ ہی کو مبارک رہے۔

اتنے میں ڈپٹی اور انسپکٹر دونوں آپہنچے، رما کو دیکھ کر انسپکٹر صاحب نے فرمایا۔ ہمارے بابو صاحب تو آج پہلے ہی سے تیار بیٹھے ہیں۔ بس آج کی کارگزاری پر وارا نیارا ہے۔

رما۔ جی ہاں۔ آج وارا نیارا کردوں گا۔ اتنے دنوں تک آپ لوگوں کے اشاروں پر چلا۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر چلوں گا۔

انسپکٹر نے دروغہ کا منہ دیکھا۔ دروغہ نے ڈپٹی کا منہ دیکھا۔ یہ لونڈا کیا کہتا ہے

انسپکٹر صاحب نے استعجاب سے کہا۔ کیا معاملہ ہے۔ حلف سے کہتا ہوں۔ آپ کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔

رما۔ میں نے اپنا بیان تبدیل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ بے گناہوں کا خون نہیں کرنا چاہتا۔

انسپکٹر نے اسے نگاہِ ترحم سے دیکھ کر کہا۔ آپ بے گناہوں کا خون نہیں کر رہے ہیں۔ صاحب اپنی تقدیر کی عمارت کھڑی کر رہے ہیں۔ حلف سے کہتا ہوں ایسے موقع بہت کم آدمیوں کو ملتے ہیں۔ آج کیا بات ہوئی کہ آپ اتنے خفا ہوگئے۔ آپ کو کچھ معلوم ہے دروغہ جی! اگر کسی نے آپ کے مزاج کے خلاف کوئی حرکت کی ہو تو اس کی گوشمالی کیجئے۔

دروغہ۔ میں ابھی جاکر تحقیقات کرتا ہوں۔

رما۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ مجھے کسی سے شکایت نہیں ہے۔ میں اپنے فائدے کے لئے اپنے ضمیر کا خون نہیں کرنا چاہتا۔

ایک منٹ سناٹا رہا۔ کسی کو کوئی بات نہ سوجھی۔ دروغہ کوئی دوسرا چکمہ سوچ رہے تھے۔ انسپکٹر صاحب کوئی دوسری ترغیب۔

دفعتہً ڈپٹی صاحب نے کہا۔ رما بابو یہ اچھا بات نہ ہوگا۔

رمانے دلیری کے ساتھ کہا۔ آپ کے لئے نہ ہوگا۔ میرے لئے تو سب سے اچھی بات ہے۔

ڈپٹی۔ نہیں آپ کے لئے اس سے بُرا دوسرا بات نہیں ہے۔ ہم آپ کو چھوڑے گا نہیں۔ تم کو ایسا لیبن دے گا کہ تم عمر بھر نہ بھولے گا۔ آپ کو وہی گواہی دینا ہوگا جو پہلے دے چکا ہے۔ اگر کچھ بھی گول مال کیا ہم تمہارے ساتھ دوسرا برتاؤ کرے گا۔ ایک رپورٹ میں تم یوں دکلائیوں کو نیچے اوپر رکھ کر) چلا جائے گا۔

رما سہم اُٹھا۔ اس تخویف نے اسے لرزہ براندام کردیا۔ کہیں یہ سب کوئی جھوٹا مقدمہ چلاکر اسے پھنسا دیں تو کون اس کی فریاد سُنے گا۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ ڈپٹی صاحب جو اخلاق اور مروّت کے پتلے بنے ہوئے ہیں یک بارگی اتنے طیش میں آجائیں گے پھر بھی خودداری کے ساتھ بولا۔ آپ مجھ سے جبراً شہادت دلوائیں گے۔

ڈپٹی نے سر پٹیک کر کہا۔ ہاں جبراً دلائے گا۔

رما۔ واہ! اچھی دل لگی ہے۔

ڈپٹی۔ تم نے ابھی پولیس کی چال نہیں دیکھی ہے۔ ہم ابھی دو گواہ دے کر تم پر بغاوت کا کیس چلا سکتا ہے۔ بس چلا جائے گا۔ سات سال کے لئے چکی پیستے پیستے ہاتھ میں چھالے پڑ جائیں گے۔ یہ چکنا چکنا منہ نہیں رہے گا۔

رما جیل سے ڈرتا تھا۔ جیل کی زندگی کے خیال سے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے تھے۔ جیل ہی کے خوف سے اس نے یہ شہادت دینی منظور کی تھی۔ وہی خوف اس وقت بھی اس کے دل میں رعشہ پیدا کرنے لگا۔ ڈپٹی نفسیات کا ماہر تھا۔ آسن کا پتہ پا گیا۔ اسی لہجہ میں بولا۔ حلوا پوری نہیں پائے گا۔ دھول ملا ہوا آٹا کا روٹی۔ گوبھی کے سڑے ہوئے پتوں کا ساگ کھانے کو ملے گا۔ چار مہینہ بھی کال کوٹھری ہو گیا تو تم بچ نہیں سکتا۔ وہیں مر جائے گا۔ بات بات پر وارڈر گالی دے گا۔ جوتوں سے پیٹے گا تم سمجھتا کیا ہے۔

رما کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اپنی کمزوری پر اتنا ملال ہوا کہ رو پڑا۔ کانپتی

ہوئی آواز سے بولا۔ آپ لوگوں کی یہی خواہش ہے تو یہی سہی۔ بھیج دیجیئے جیل مریں تو بلاؤں کا گلا تو چھوٹ جائے گا۔ جب آپ یہاں تک مجھے تباہ کرنے پر آمادہ ہیں تو میں بھی مرنے کو تیار ہوں۔ جو کچھ ہونا ہوگا ہو جائے گا۔

اس کا دل ضعف کی اس حالت کو پہنچ گیا تھا جب ذرا سی ہمدردی، ذرا سی شفقت سینکڑوں دھمکیوں سے زیادہ کارگر ہو جاتی ہے۔ انسپکٹر صاحب نے اس کی نبض پہچان لی۔ اس کی حمایت کرتے ہوئے بولے۔ حلف سے کہتا ہوں آپ لوگ آدمی کو پہچانتے تو ہیں نہیں لگتے ہیں رعب جمانے۔ اس قسم کی شہادت دینا ہر ایک ذی فہم آدمی کو ناگوار گزرے گا۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ بابو کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم سے منحرف ہو جائیں گے۔ آپ لوگ اپنا کام کیجئے۔ بابو صاحب کی طرف سے مطمئن رہیئے۔ میں ان کا ذمہ لیتا ہوں۔

اس نے رما کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ آپ ڈپٹی صاحب کی گیدڑ بھبکیوں میں آگئے۔ آیئے میرے ساتھ چلیئے۔ ایسے ایسے ریکارڈ سناؤں کہ طبیعت پھڑک اٹھے۔

رما نے رُندھے ہوئے لڑکے کی طرح ہاتھ چھڑا کر کہا۔ مجھے دق نہ کیجئے انسپکٹر صاحب اب تو مجھے جیل خانے میں مرنا ہے۔

انسپکٹر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو بھائی جان۔ جیل خانے میں مریں آپ کے دشمن۔

ڈپٹی نے تسمہ بھی باقی نہ چھوڑنا چاہا۔ اس طرح بولا۔ گویا رما سے کبھی جان پہچان نہیں ہے۔ صاحب ہم تمہارے ساتھ سب طرح کا سلوک کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن جب تم ہمارا اینڈ کھود دو گے تو ہم بھی اپنا کارروائی کرے گا۔ ضرور سے کرے گا۔ کبھی نہیں چھوڑ نہیں سکتا۔

اسی وقت سرکاری ایڈوکیٹ اور بیرسٹر موٹر سے اترے۔

(۴۱)

رتن اپنے خطوں میں جالیا کو تشفی دیتی رہتی تھی، مگر اپنے بارے میں کچھ نہ لکھتی تھی جو خود ہی مبتلائے غم ہو اُسے اپنی مصیبت کی کہانی کیا سنائے جس نے روپوں کی کبھی کوئی حقیقت نہ سمجھی، وہ ایک ہی مہینہ میں روٹیوں کی محتاج ہو رہی تھی۔ پہلے بھی اس کی زندگی پُرعافیت نہ تھی۔ لیکن اسے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ مریل گھوڑے پر سوار ہو کر بھی سفر پورا کیا جا سکتا ہے۔ اگر سڑک اچھی ہو تو کرجا کر اور کھانے پینے کا سامان ساتھ ہو، گھوڑا بھی تیز ہو تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ رتن کی حالت بھی اسی سوار کی سی تھی۔ اسی سوار کی طرح وہ آہستہ آہستہ زندگی کے مرحلے طے کرتی جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہ گھوڑے پر جھنجلاتی ہوگی۔ دوسرے سواروں کو آگے بڑھتے دیکھ کر اُسے خواہش ہوتی ہوگی کہ اس کا گھوڑا بھی اتنا ہی تیز خرام ہوتا۔ لیکن وہ رنجیدہ نہ تھی۔ اپنے نصیبوں کو نہ روتی تھی۔ وہ اس گائے کی طرح تھی جو ایک میلی سی پگھیا کے بندھن میں پڑ کر اپنی ناند کے بھوسے کھلی میں مگن رہتی تھی سامنے ہرے بھرے میدان ہیں اس میں اشتہا انگیز گھاس لہرا رہی ہے مگر رسی توڑ کر کبھی ادھر نہیں جاتی۔ اس کے اس رسی اور لوہے کی زنجیر میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

عالمِ شباب میں محبت کی اتنی پیاس نہیں ہوتی جتنی خودنمائی کی یہ پیاس بعد کو آتی ہے۔ رتن کو خودنمائی کے سبھی سامان ملے ہوئے تھے۔ اس کا شباب میں مست دل اپنی زیبائش میں خوش تھا ہنسی مذاق۔ سیر و تفریح۔ کھانا پینا یہی اس کی زندگی تھی اس سے گہرے پانی میں اُسے جانے کی نہ خواہش تھی نہ غرض۔ فارغ البالی بہت کچھ رنج و محن کا ازالہ کرتی رہتی ہے۔ اس کے پاس اپنی مصیبتوں کو بھلانے کے لئے کتنے ہی سامان ہیں۔ سنیما ہیں سیر و سیاحت ہے۔ کتابوں کا مطالعہ ہے شر دود نشار ہے پالتو جانور ہیں لیکن افلاس کو بھلانے کا انسان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ روئے اپنی تقدیر کو، کوسے اور دنیا سے مایوس ہو کر خودکشی کرلے۔ رتن کی تقدیر نے پلٹا کھایا تھا۔

اور یہ ہوا اپنے ہی ہاتھوں۔ پنڈت جی ان آدمیوں میں تھے جنہیں موت کی فکر نہیں ہوتی۔ انہیں کسی طرح یہ خیال ہوگیا تھا کہ دائم المریض آدمی اگر احتیاط اور پرہیز سے رہے تو اس کی عمر دراز ہوسکتی ہے وہ پرہیز اور احتیاط کے دائرے سے باہر کبھی نہیں جاتے تھے۔ پھر موت کو ان سے کیا دشمنی تھی جو خواہ مخواہ ان کے پیچھے پڑتی۔ اپنی وصیت لکھنے کا خیال انہیں اس وقت آیا جب قریب المرگ ہوئے۔ لیکن رتن وصیت کا نام سنتے ہی اتنی پریشان اور غمگین ہوئی کہ پنڈت جی نے اسے اس وقت ملتوی کرنا ہی مناسب سمجھا۔ تب سے انہیں اتنا ہوش نہ آیا کہ وصیت لکھواتے۔

پنڈت جی کی وفات کے بعد رتن دنیا سے اس قدر بیزار ہوگئی کہ اسے کسی بات کی بھی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ یہ وہ موقع تھا جب اسے خاص طور پر ہوشیار رہنا چاہیئے تھا۔ گویا دشمنوں نے اسے گھیر رکھا ہو۔ مگر اس نے سب کچھ منی بھوشن پر چھوڑ دیا اور اس منی بھوشن نے رفتہ رفتہ اس کا سارا اثاثہ ہضم کرلیا۔ ایسا سوانگ بھرا کہ سادہ لوح رتن کو اس کی فتنہ انگیزیوں کی بھنک تک نہ ملی۔ پھندا جب خوب کس گیا تو اس نے ایک دن رتن سے آکر کہا۔ آج بنگلہ خالی کرنا ہوگا۔ میں نے اسے بیچ دیا ہے۔

رتن نے تیز ہو کر کہا۔ میں نے تو تم سے کہا تھا ابھی بنگلہ نہ بیچوں گی۔

منی بھوشن نے ظاہرداری کا پردہ اتار پھینکا اور بولا۔ آپ میں یہ بہت بڑا عیب ہے کہ آپ ایک بات کہہ کر اسے بھول جاتی ہیں۔ اسی کمرے میں میں نے آپ سے یہ ذکر کیا تھا اور آپ نے یہ حامی بھری تھی۔ جب میں نے بنگلہ بیچ دیا تو آپ یہ رنگ لائیں۔ بنگلہ آج خالی کرنا ہوگا اور آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔

میں ابھی یہیں رہنا چاہتی ہوں۔

میں آپ کو یہاں نہ رہنے دوں گا۔

میں تمہاری لونڈی نہیں ہوں۔

آپ کی خبر گیری کا بار مجھ پر ہے۔ اپنے خاندان کے حفظ و وقار کے لئے میں آپ کو اپنے
ہاتھ لے جاؤں گا۔

رتن نے ہونٹ چبا کر کہا۔ میں اپنی عصمت کی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔ تمہاری مدد
ضرورت نہیں۔ میری اجازت کے بغیر تم کوئی چیز فروخت نہیں کر سکتے۔

منی بھوشن نے گولی سی ماری۔ آپ کا اس گھر پہ اور چچا صاحب کی جائداد پر کوئی
نہیں ہے۔ یہ میری ملکیت ہے۔ آپ مجھ پر صرف گذارے کا دعویٰ کر سکتی ہیں۔

رتن نے حیرت میں آ کر کہا۔ تم کچھ بھنگ تو نہیں کھا گئے ہو؟

منی بھوشن نے بے دردانہ انداز سے کہا۔ میں اتنی بھنگ نہیں کھاتا کہ بے سر پیر کی
باتیں کرنے لگوں۔ آپ تو پڑھی لکھی ہیں ایک بڑے وکیل کی بیوی ہیں۔ قانون کی بہت
باتیں جانتی ہوں گی۔ مشترکہ خاندان کی بیوہ کا شوہر کی جائداد پر کوئی حق نہیں ہوتا۔
صاحب اور میرے والد میں کبھی علیحدگی نہیں ہوئی۔ چچا صاحب یہاں تھے ہم لوگ
دور میں تھے مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہم میں علیحدگی تھی۔ اگر چچا صاحب
اپنی جائداد آپ کو دینا چاہتے تو کوئی وصیت ضرور لکھ جاتے۔ اور اگرچہ قانوناً اس
وصیت کی کوئی وقعت نہ ہوتی، مگر ہم اس کا احترام کرتے۔ مرحوم کا کوئی وصیت نہ
کرنا ثابت کر رہا ہے کہ وہ آپ کے ساتھ کوئی خاص سلوک نہ کرنا چاہتے تھے۔ آج آپ کو بنگلہ
خالی کرنا ہوگا۔ دوسرے سامان بھی نیلام کر دیئے جائیں گے۔ آپ کی مرضی ہو میرے ساتھ
چلیں یا یہیں رہیں۔ یہاں رہنے کے لئے آپ کو دس پندرہ روپے کا مکان کافی ہوگا۔ گذارہ
کے لئے پچاس روپے مہینہ کا انتظام میں نے کر دیا ہے۔ کل مطالبات ادا کرنے کے بعد
اس سے زیادہ گنجائش ہی نہیں ہے۔

رتن نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر وہ مفلوج سی بیٹھی رہی۔ پھر موٹر منگوائی اور
سارا دن وکیلوں کے پاس دوڑتی پھرتی۔ کتنے ہی وکیلوں سے پنڈت جی کا یارانہ تھا۔ ہر

ایک نے اس کی حالت سن کر رنج کیا۔ اور وکیل صاحب کے وصیت نہ لکھ جانے پر تعجب کرتے رہے۔ اب اس کے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا، وہ یہ ثابت کر دے کہ وکیل صاحب اور ان کے بھائی میں علیحدگی ہو گئی تھی اور یہ ثابت کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ نور تن کا اس جائداد پر قبضہ ہو جائے گا۔ ورنہ اس کے لئے کوئی چارہ نہ تھا۔

رتن شام کو گھر لوٹ آئی۔ اس نے فیصلہ کیا جو کچھ میرا نہیں ہے اسے لینے کے لئے میں جھوٹ کا سہارا نہ لوں گی۔

اتنے دنوں میں وہ اپنے کو اس گھر کی مالکن سمجھتی رہی۔ یہ کتنی بڑی غلطی تھی۔ شوہر کی زندگی میں جو لوگ اس کا منہ تاکتے تھے وہ آج اس کے مخدوم بنے ہوئے ہیں۔ یہ ذلت رتن جیسی خوددار عورت کے ناقابلِ برداشت تھی۔ مانا کمائی پنڈت جی کی تھی۔ لیکن یہ گاؤں تو اسی نے خریدا تھا۔ کئی مکان تو اس نے اپنے ہاتھوں بنوا لئے۔ اس نے ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال نہ کیا تھا کہ ایک دن یہ جائداد اس کی زندگی کی کفیل ہوگی۔ اسے اس جائداد کے خریدنے میں اس کی ترقی اور تنظیم میں وہی مسرت ہوتی تھی جو ماں اپنی اولاد کے پھلتے پھولتے دیکھ کر حاصل کرتی ہے۔ اس میں غرض کا شائبہ بھی نہ تھا محض اپنے پن کا غرور تھا۔ وہی محبت تھی۔ لیکن شوہر کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے پالے اور گود کے کھلائے ہوئے بچے بھی اس کی گود سے چھین لئے گئے۔ اس کا ان پر اب کوئی اختیار نہیں۔ اگر وہ جانتی کہ ایک دن یہ مسئلہ ضرور پیش ہوگا تو وہ چاہے روپے کو لٹا دیتی، خیرات کرتی مگر ملکیت کی بیخ اپنے سینے میں نہ گاڑتی۔ کیا گرمیوں میں وہ مسوری یا نینی تال نہ جا سکتی تھی۔ ایک کیا دو دو چار نوکر اور نہ رکھے جا سکتے تھے۔ اگر وہ زیور ہی بنواتی تو ایک ایک مکان کی قیمت کا ایک ایک زیور بنوا سکتی تھی۔ مگر اس نے نفس کو کبھی پاؤں نہ پھیلانے دیا۔ کیا اسی نفس کشی کا یہی صلہ تھا۔ جو چیز کل تک اس کی تھی آج اس کی طرف وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی۔ کل تک وہ دوسروں کی پرورش کرتی تھی آج وہ خود دوسروں کی محتاج

ہے۔

دفعتہً اس کے خیال میں ایک تغیر ہوا۔ وہ کیوں اپنے کو بیکس سمجھے، کیوں غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ دنیا میں لاکھوں ہی عورتیں دیدہ ریزی کرکے اپنی گذر بسر کرتی ہیں۔ کیا وہ کپڑا نہیں سی سکتی۔ کسی چیز کی چھوٹی موٹی دکان نہیں رکھ سکتی۔ لڑکوں کو بھی پڑھا سکتی ہے رہی تو ہوگا لوگ ہنسیں گے مگر اسے ہنسی کی کیا پرواہ۔ یہ اس کی ہنسی نہیں ہے اپنی قوم کے رسم ورواج کی ہنسی ہے۔

شام کو دروازے پر کئی ٹھیلے والے آگئے۔ منی بھوشن نے آکر کہا۔ میں نے ایک مکان طے کرلیا ہے آپ جو چیزیں کہیں لدوا کر بھیجدوں۔

رتن نے بے اعتنائی کے ساتھ کہا۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ نہ تم میرے لئے کوئی مکان ہی لو۔ جس چیز پر میرا کوئی اختیار نہیں وہ میں ہاتھ سے کبھی نہیں چھو سکتی۔ میں اپنے گھر سے لے کر کچھ نہیں آئی تھی۔ اسی طرح لوٹ جاؤں گی۔

منی بھوشن نے شرمندہ ہوکر کہا۔ آپ کا سب کچھ ہے۔ یہ آپ کیسے کہتی ہیں کہ آپ کا کچھ اختیار نہیں۔ آپ وہ مکان دیکھ لیں، میں تو سمجھتا ہوں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

رتن نے طنزیہ انداز سے کہا۔ اتنا بڑا مکان لے کر میں کیا کروں گی۔ میرے لئے ایک کوٹھری کافی ہے جو دو روپیہ میں مل جائے گی۔ سونے کے لئے زمین ہی ہے احسان کا بوجھ سر پر جتنا ہی کم ہو اتنا ہی اچھا۔

منی بھوشن نے عاجزی سے کہا۔ آخر آپ چاہتی کیا ہیں کچھ تو کہئے۔

رتن نے جواب دیا۔ میں کچھ نہیں چاہتی۔ میں اس گھر کا ایک تنکا بھی اپنے ساتھ نہ لے جاؤں گی۔ جس چیز پر میرا کوئی اختیار نہیں، وہ میرے لئے ویسی ہی ہے جیسے کسی غیر کی چیز۔ تم ان چیزوں کے مالک ہوتے جاؤ میں ذرا بھی بُرا نہیں مانتی۔ رحم کی چیز نہ زبردستی لی جاسکتی ہے نہ زبردستی دی جاسکتی ہے۔ دنیا میں ہزاروں بیوہ عورتیں پڑی ہوئی ہیں میں

بھی انہیں میں سے ایک ہوں۔ میں بھی انہیں کی طرح مزدوری کروں گی۔ اور نہ کرسکوں گی تو
گڈھے میں ڈوب مروں گی۔ جو اپنا پیٹ بھی نہ پال سکے اسے زندہ رہ کر دوسروں کے ا
بار بننے کا کوئی حق نہیں ہے۔

یہ کہتی ہوئی رتن گھر سے نکلی۔ اور دروازے کی طرف چلی۔ منی بھوشن نے اس
راستہ روک لیا۔ اگر آپ کی مرضی نہ ہو تو میں ابھی بنگلہ نہ بیچوں۔

رتن نے جلتی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا
آنسوؤں کے اُمنڈتے ہوئے سیلاب کو روک کر بولی۔ میں نے کہہ دیا اس گھر کی کسی چیز
میرا دعویٰ نہیں ہے۔ میں کرائے کی لونڈی تھی۔ لونڈی کا گھر سے کیا تعلق۔ نہ جانے کس
پاپی نے یہ قانون بنایا تھا اگر ایشور کہیں ہے اور اس کے یہاں انصاف ہوتا ہے تو
دن اسی کے سامنے اس پاپی سے پوچھوں گی۔ کیا تیرے گھر میں ماں بہن نہ تھیں۔ تجھے
اس کی توہین کرتے شرم نہ آئی۔ اگر میری زبان میں اتنی طاقت ہوتی کہ اس کی آواز
سارے ملک میں پہنچا سکتی تو میں اپنی بہنوں سے کہتی۔ بہنو! کسی مشترکہ خاندان میں نہ
مت کرنا۔ اور اگر کرنا تو جب تک اپنا گھر الگ نہ بنا لینا آرام کی نیند مت سونا۔ یہ
تمہارے لئے پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا بستر ہے۔ تمہیں پار لے جانے والی کشتی
تمہیں نگل جانے والا جانور ہے۔

شام ہو گئی تھی۔ گرد سے بھری ہوئی بھاگن کی ہوا چلنے والوں کی آنکھوں میں
دھواں جھونک رہی تھی۔ رتن چادر سنبھالتی ہوئی سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ راستہ میں
پہچان کی عورتوں نے اسے ٹوکا۔ کئی نے اپنی موٹر روک لی اور اسے بیٹھنے کو کہا۔
رتن کو ان کی ہمدردی اس وقت تیر سی لگ رہی تھی۔ وہ تیزی سے قدم
اٹھاتی ہوئی جالپا کے گھر جا رہی تھی۔ آج اس کی اصلی زندگی کا آغاز
تھا۔

(۴۲)

ٹھیک دس بجے جالپا اور دیپ دین کچہری پہنچ گئے۔ تماشائیوں کی کافی بھیڑ تھی۔ اوپر کی گیلری تو بھری ہوئی تھی، ہزاروں آدمی سامنے کے میدان میں کھڑے تھے، جالپا اوپر گیلری میں جا بیٹھی۔ دیپ دین برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔

اجلاس پر جج کے ایک طرف پولیس کے کئی عملے کھڑے تھے، سامنے کٹہرے کے باہر دونوں طرف کے وکیل کھڑے مقدمہ پیش ہونے کا انتظار کر رہے تھے ملزموں کی تعداد پندرہ سے کم نہ تھی، سب کٹہرے کے بغل میں زمین پر بیٹھے ہوئے تھے، سبھی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور پیروں میں بیڑیاں، کوئی لیٹا تھا کوئی بیٹھا تھا، دو نیچے لڑا رہے تھے، دو میں کسی مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی، سبھی لبشاش تھے، انتشار ما یوسی یا غم کا کسی کے چہرے پر نشان نہ تھا۔

گیارہ بجتے بجتے مقدمہ کی پیشی ہوئی پہلے پولیس کی شہادتیں ہوئیں، آخر میں کوئی تین بجے رما ناتھ کچہری میں لایا گیا، تماشائیوں میں سنسنی پھیل گئی، کوئی تنبولی کی دکان سے پان کھاتا ہوا بھاگا۔ کسی نے اخبار کو مروڑ کر جیب میں رکھا۔ اور اجلاس کی طرف دوڑا جالپا بھی سنبھل کر بارجے میں کھڑی ہو گئی۔ وہ چاہتی تھی ایک بار رما کی آنکھیں اُٹھ جاتیں اور وہ اسے دیکھ لیتی، لیکن رما سر جھکائے کھڑا تھا، گویا آنکھیں اٹھاتے ڈر رہا تھا، اس کے چہرے کا رنگ اُڑ رہا تھا، کچھ سہما ہوا، گھبرایا ہوا اس طرح کھڑا تھا، گویا اسے کسی نے باندھ رکھا ہے اور بھاگنے کی راہ نہیں ہے، جالپا کا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا جیسے اس کی تقدیر کا فیصلہ ہو رہا ہے۔

رما کا بیان شروع ہوا، پہلا ہی جملہ سن کر جالپا کانپ اُٹھی۔ دوسرے جملے نے اس کی تیوریوں پر بل ڈال دیے، تیسرے جملے نے اس کے چہرے کا رنگ فق کر دیا، اور چوتھا جملہ سننا تھا کہ وہ ایک لمبی سانس کھینچ کر پیچھے رکھی ہوئی کرسی پر گر پڑی

مگر پھر دل نہ مانا ، اب خفگی پر جھک کر دہ ابد بنہرکان ہی لگا دیئے ۔ دہی پولیس کی سکھائی ہوئی شہادت تھی ، جس کا خلاصہ وہ دیبی دین کے منہ سے سن چکی تھی ، عدالت میں سناٹا چھایا ہوا تھا ، جالپا نے کئی بار کھانسا کہ شاید رما کی آنکھیں اب بھی اوپر اٹھ جائیں ، لیکن رما کا سر اور بھی جھک گیا ۔ معلوم نہیں اس نے جالپا کے کھانسنے کی آواز پہچان لی یا ندامت کا جذبہ پیدا ہو گیا ۔ اس کی آواز کچھ اور دھیمی ہو گئی ۔

ایک خاتون نے جو جالپا کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی ، ناک سکوڑ کر کہا ۔ جی چاہتا ہے کہ اس شیطان کے گولی مار دے ۔ ایسے ایسے خود غرض لوگ بھی اس بدنصیب دیش میں پڑے ہیں جو تھوڑے فائدے کے لئے بے گناہوں کا گلا دباتے بھی نہیں ہچکچاتے ۔

جالپا نے کوئی جواب نہ دیا ۔

ایک دوسری خاتون نے جو آنکھوں پر عینک لگائے ہوئے تھیں تلملا کر کہا ۔ اس بدنصیب ملک کا ایشور ہی مالک ہے ، گورنری تو لالہ کو کہیں مل نہیں جاتی ، زیادہ سے زیادہ کلرکی مل جائے گی ۔ اس کے لئے اپنا ایمان بیچے ڈالتا ہے ، معلوم ہوتا ہے کوئی نہایت کمینہ آدمی ہے ۔

تیسری عورت نے عینک والی دیوی سے مسکرا کر پوچھا ۔ آدمی تو فیشن ایبل اور پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے ، بھلا تم اسے پا جاؤ تو کیا کرو ۔

عینک والی عورت نے جوش سے کہا ۔ ناک کاٹ لوں ، بس نکٹا بنا کر چھوڑ دوں ، جانتی ہو میں کیا کروں ۔

نہیں ، شاید گولی مار دو گی ۔

نہیں گولی نہ ماروں گی ، سر بازار کھڑا کر کے پانچ جوتے لگواؤں ، چاند گنجی ہو جائے ، تمہیں ذرا بھی رحم نہ آئے گا ۔

یہ کچھ کم رحم ہے ۔ اس کی پوری سزا تو یہ ہے کہ کسی اونچی پہاڑی سے ڈھکیل دیا جائے۔
ایک ضعیفہ نے ان دیویوں کو ملامت کرتے ہوئے کہا ۔ کیوں مفت میں منہ خراب کرتی ہو ۔ یہ غریب نفرت کے قابل نہیں ۔ رحم کے قابل ہے ۔ دیکھتی نہیں ہو اس کا چہرہ کیسا زرد ہو گیا ہے ۔ جیسے کوئی اس کا گلا دبائے ہوئے ہے ۔ اپنی ماں یا بہن کو دیکھ لے تو ضرور رو پڑے ۔ آدمی کا دل بُرا نہیں ہے ۔ پولیس نے مار پیٹ کر سیدھا کیا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے ایک ایک لفظ اس کے دل کو چیر چیر کر نکل رہا ہے ۔

عینک والی خاتون نے طعنہ مارا ۔ جب اپنے پاؤں میں کانٹا چبھتا ہے جبھی آہ نکلتی ہے ۔

جالپا اب وہاں نہ ٹھہر سکی ۔ ایک ایک لفظ چنگاری کی طرح اس کے دل پر لگتا تھا ۔ دل میں ایسا اُبال آتا تھا کہ اسی وقت اٹھ کر کہہ دے کہ یہ شخص بالکل جھوٹ بول رہا ہے اور اسی وقت اس کا ثبوت دے دے ۔ اس غصہ جائز کو پوری طرح طاقت سے دبائے ہوئے تھی ۔ اس کا ضمیر اس کے تحمل پر اسے نفرین کر رہا تھا ۔ کیوں وہ اسی وقت ساری کیفیت بیان نہیں کر دیتی ۔ پولیس اس کی دشمن ہو جائے گی ہو جائے ۔ عدالت کو کچھ خیال ہو گا ۔ ممکن ہے غریبوں کی جان بچ جائے ۔ کم سے کم عوام کو تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ جھوٹی شہادت ہے اس کے منہ سے ایک بار آواز نکلتے نکلتے رہ گئی ۔

آخر وہ وہاں سے اٹھ کر باہر چلی آئی ۔

دیپا دین اسے اُترتے دیکھ کر برآمدے میں چلا آیا اور ہمدردانہ لہجہ میں بولا ۔ کیا گھر چلتی ہو بہو جی !

جالپا نے آنسوؤں کی یورش کو روک کر کہا ۔ ہاں اب یہاں نہیں بیٹھا جاتا ۔

احاطہ سے باہر نکل کر دیپا دین نے جالپا کو تشفی دینے کے ارادے سے کہا ۔ پولیس نے جسے ایک بار بُوٹی سنگھا دی ، اس پر کسی دوسری بات کا اثر نہیں ہو سکتا ۔

جالیا نے کچھ جواب نہ دیا۔ کچھ دور تک دونوں خاموش چلتے رہے۔ یکایک جالیا نے کہا۔ کیوں دادا! اب اور تو کہیں اپیل نہ ہوگی۔ قیدیوں کا یہیں فیصلہ ہو جائیگا۔

دینی دین اس سوال کا مطلب سمجھ گیا۔ بولا ——— نہیں ہائی کورٹ میں اپیل ہو سکتی ہے۔

پھر تھوڑی دور تک دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ جالیا ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی اور بولی۔ دادا میرا جی چاہتا ہے آج جج صاحب سے مل کر سارا واقعہ کہہ دوں۔ شروع سے جو کچھ ہوا سب کہہ سناؤں۔ میں ثبوت دوں گی تب تو مانیں گے۔

دینی دین نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ جج صاحب سے؟

جالیا نے کہا۔ ہاں!

دینی دین پس و پیش کے ساتھ بولا۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہو جی! حاکم کا واسطہ نہ جانے چت پڑے یا پٹ۔

جالیا بولی۔ وہ کیا پولیس والوں سے کہہ نہیں سکتا کہ تمہارا گواہ فرضی ہے۔ کہہ تو سکتا ہے۔

تو آج میں اسی سے ملوں۔ مل تو لینا ہے۔

چلو دریافت کریں گے۔ لیکن جوکھم کی بات ہے۔

کیا جوکھم ہے بتاؤ۔

بھیا پر کہیں جھوٹی گواہی کا الزام لگا کر سزا کر دے تو۔

تو کچھ نہیں جو جیسا کرے ویسا بھوگتے۔

دینی دین نے جالیا کی اس بے دردی پر متحیر ہو کر کہا۔ ایک دوسرا کھٹکا بھی ہے سب سے بڑا ڈر اسی کا ہے۔

جالپا نے پوچھا وہ کیا؟

دیی دین۔ پولیس والے بے مروّت ہوتے ہیں۔ کسی کی عزّت اُتار لینا تو اُن کے لئے دل لگی ہے۔ جج صاحب پولیس کمشنر کو بلا کر یہ سب حال ضرور کہیں گے۔ کمشنر سوچے گا یہی عورت سارا کھیل بگاڑ رہی ہے اسی کو گرفتار کر لو۔ جج اگر انگریز ہوتا تو نڈر ہو کر پولیس کو تنبیہ کرتا۔ ہمارے بھائی تو ایسے مقدموں پر منہ کھولتے ڈرتے ہیں کہ کہیں اور ان سے بُرا نہ مان جائے۔ جج صاحب پولیس کمشنر سے ضرور کہیں گے پھر بُرا ہو گا کہ مقدمہ اٹھا لیا جائے یہی ہو گا کہ قلعی نہ کھلنے پائے۔ کبھی کبھی جب گواہ بدلنے لگتا ہے تو پولیس والے اس کے ساتھ بڑی بدعت کرتے ہیں۔

جالپا کو اپنی گرفتاری کا خوف نہ تھا۔ لیکن یہ خوف ضرور تھا کہ رما پر کہیں آفت نہ آجائے۔ اس خوف نے اس کی ہمّت لپست کر دی۔ اس وقت ایسا تکان معلوم ہوا گویا سینکڑوں میل کی منزل مار کر آئی ہو۔

کچھ دور اور چلنے کے بعد اس نے دیی دین سے پوچھا۔ اب تو ان سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔

دیی دین نے سر ہلا کر کہا۔ کسی طرح نہیں۔ پہرہ اور کڑا کر دیا جائے گا۔ چاہے وہ بنگلہ ہی چھوڑ دیا جائے اور اب ان سے ملاقات ہو ہی گئی تو کیا اب کسی طرح اپنا بیان بدل نہیں سکتے۔ دروغ حلفی میں پھنس جائیں گے۔

کچھ دور اور چل کر جالپا نے کہا۔ میں سوچتی ہوں گھر چلی جاؤں۔ یہاں رہ کر اب کیا کروں گی۔

دیی دین نے پُر درد نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ نہیں نہیں بہو ابھی ہیں نہ جانے دوں گا۔ تم چلی جاؤ گی تو یہاں پل بھر بھی ہمارا جی نہ لگے گا۔ بڑھیا تو رو رو کر جان دے دیگی۔ ابھی یہاں رہو دیکھو کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ بھیّا کو میں اتنے کچے دل کا

آدمی نہیں سمجھتا تھا۔ نہ جانے لوگ کیسے سرکاری نوکری پر جان دیتے ہیں۔ مجھے تو کوئی سو روپے بھی طلب تک دے تو نوکری نہ کروں۔ اپنے روزگار کی بات ہی دوسری ہے۔ اس میں آدمی کبھی تھکتا ہی نہیں۔ نوکری میں تو جہاں پانچ چھ گھنٹے ہوئے کہ بدن ٹوٹنے لگا جمائیاں آنے لگیں۔

راستہ میں اور کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ جالپا کا دل اپنی شکست ماننے کے لئے کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔ وہ ناکام ہو کر ایک ناظر کی بے تعلقی سے اس تماشے کو دیکھنے پر قناعت نہ کرسکتی تھی۔ وہ اس تماشے میں شریک ہو کر اپنا پارٹ ادا کرنے کے لئے بے قرار ہو رہی تھی۔ کیا ایک بار پھر رما سے ملاقات ہوگی اس کے دل میں ان آتشیں الفاظ کا ایک شعلہ سا دھک رہا تھا۔ جو وہ اس سے کہنا چاہتی تھی۔ اسے رما پر ذرا بھی رحم نہ آتا تھا۔ اس سے شمہ بھر بھی ہمدردی نہ ہوتی تھی وہ اس سے کہنا چاہتی تھی تمہاری دولت اور تمہارا عہدہ تمہیں مبارک ہو۔ جالپا کی نظروں میں اس کی کوئی وقعت نہیں جس نے ان حقیر چیزوں کے لئے اپنا ضمیر بیچ دیا۔ اسے میں انسان نہیں سمجھتی۔ تم انسان نہیں ہو۔ تم حیوان بھی نہیں ہو۔ نامرد ہو، روسیاہ ہو۔

جالپا کا چہرہ فرطِ غضب سے چمک اٹھا۔ غرور سے اس کی گردن تن گئی وہ شاید سمجھتے ہوں گے جالپا جس وقت مجھے چھپے دار پگڑی باندھے گھوڑے پر سوار دیکھے گی پھولی نہ سمائے گی۔ جالپا اتنی کور باطن نہیں ہے۔ تم گھوڑے پر نہیں آسمان پر اڑو میری نظروں میں قاتل ہو۔ میں نے چلتے چلتے سمجھایا تھا اس کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ جالپا تمہاری محتاج نہیں ہے۔

(۴۳)

ایک مہینہ گذر گیا جالپا کئی دن تک بہت بے قرار رہی۔ کئی بار جنون سا ہوا کہ

سارا واقعہ کسی اخبار میں چھپوا دے۔ لیکن دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی کوئی طاقت اس کی زبان بند کر دیتی تھی۔ رما کی طرف سے وہ بے تعلق ہوگئی تھی۔ اس کے اوپر اب اسے غصہ آتا تھا رحم بھی نہ آتا تھا۔ صرف ایک بے نیازی تھی۔ اس کے مرجانے کی خبر پاکر شاید اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آتے۔ ہاں اس سے تقدیر کا ایک کھیل سمجھ کر تھوڑی دیر کے لئے رنجیدہ ہو جاتی۔ شادی کا وہ رشتہ جو دو ڈھائی سال پہلے اس کے گلے میں پڑا تھا وہ ٹوٹ چکا تھا۔ صرف اس کا نشان باقی تھا۔ اس درمیان میں اس نے رما کو کئی بار اپنے مکان کے سامنے سے جاتے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کسی کی تلاش کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ان آنکھوں میں کچھ شرم تھی۔ کچھ عذرِ تقصیر تھا۔ لیکن جالپانے کبھی اس کی طرف آنکھ نہ اٹھائی۔ وہ شاید اس وقت آکر اس کے پیروں پر گر پڑتا۔ تب بھی وہ اس سے مخاطب نہ ہوتی۔ رما کی اس نفرت انگیز خود غرضی نے جالپا کے دل کو مجروح کر دیا تھا۔ پھر بھی اس رشتۂ اُلفت کا نشان ابھی قائم تھا۔ رما کی وہ محبت آمیز بے خودی جسے دیکھ کر ایک دن وہ خوشی سے متوالی ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی اس کے باطن میں چھپائی ہوئی تاریکی میں ایک غمناک ٹمٹماتی ہوئی شمع مزار کی طرح چمک اٹھتی۔ لیکن پھر اسی تاریکی اور غم کا پردہ پڑ جاتا۔

وہی جالپا جو پہلے بات بات پر ضد کیا کرتی تھی۔ اب خدمت، ایثار اور حلم کی مورت بنی ہوئی تھی۔ جگو منع کرتی رہتی پر وہ اندھیرے سارے گھر میں جھاڑو لگا آئی۔ جگو کا برتن کر ڈالتی۔ آٹا گوندھ کر رکھ دیتی۔ بڑھیا کو صرف روٹی بنانا باقی رہ جاتی بڑھیا اسے ٹہل ٹہال کر رسوئی میں سے جاتی اور کچھ نہ کچھ کھلا دیتی۔ دونوں میں ماں بیٹی کی سی محبت ہو گئی تھی۔

مقدمہ کی کارروائیاں ختم ہو چکی تھیں۔ دونوں طرف کے وکیلوں کی بحث ختم ہو چکی تھی۔ صرف فیصلہ سنانا باقی تھا۔ آج اسی فیصلہ کی تاریخ تھی۔ آج علی الصبح گھر کے کام دھندے سے فرصت پاکر جالپا روزانہ اخبار والے کی آواز پر کان لگائے

بیٹھی تھی۔ گویا آج اس کی تقدیر کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ اتنے میں دیبی دین نے اخبار لاکر اس کے سامنے رکھ دیا۔ جالپا اخبار پر ٹوٹ پڑی اور آج کا فیصلہ پڑھنے لگی۔ فیصلہ کیا تھا ایک خیالی افسانہ تھا جس کا ہیرو رما تھا۔ جج نے بار بار اس کی تعریف کی تھی سارا مقدمہ اسی کے بیانات پر مبنی تھا۔

دیبی دین نے پوچھا۔ فیصلہ چھپا ہے۔

جالپا نے اخبار پڑھتے ہوئے کہا۔ ہاں ہے تو۔

کس کی سزا ہوئی۔

کوئی نہیں چھوٹا۔ ایک کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ پانچ کو دس دس سال کی اور آٹھ کو پانچ پانچ سال کی۔ پھانسی اسی دنیش کو ہوگی۔

یہ کہہ کر اس نے اخبار پھینک دیا اور ایک لمبی سانس لے کر بولی۔ ان بیچاروں کے بال بچوں کا نہ جانے کیا حال ہوگا۔

دیبی دین نے سرگرمی سے کہا۔ تم نے جس دن مجھ سے ذکر کیا تھا اسی دن سے میں ان سبھوں کا پتہ لگا رہا ہوں۔ اوروں کا تو ابھی تک بیاہ ہی نہیں ہوا ہے۔ صرف دنیش کے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ بڑھیا ماں ہے اور بیوی ہے۔ یہاں کسی اسکول میں ماسٹر تھا۔

جالپا نے پوچھا۔ اس کے گھر کا کچھ پتہ لگا سکتے ہو!

دیبی نے کہا۔ ہاں ذرا مشکل ہے۔

جالپا۔ تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ ابھی تو وقت ہے۔ چلو دیکھ آئیں۔

دیبی۔ پہلے میں دیکھ آؤں۔ اس طرح اٹھ کر میرے ساتھ کہاں کہاں دوڑتی پھروگی۔

جالپا نے مجبورانہ انداز سے سر جھکا لیا اور کچھ نہ بولی۔

دیبی دین چلا گیا۔ جالپا پھر اخبار دیکھنے لگی۔ مگر اس کا دھیان دنیش کی طرف لگا ہوا

تھا۔ غریب پھانسی پا جائے گا۔ جس وقت اس نے پھانسی کا حکم سنا ہوگا اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اس کی بوڑھی ماں اور بیوی یہ خبر سن کر چھاتی پیٹنے لگی ہوں۔ بیچارہ اسکول ماسٹر ہی تو تھا۔ مشکل سے روٹیاں چلتی ہوں گی۔ اس کی مصیبتوں کے تخیل سے اسے رما کے ساتھ ایسی نفرت پیدا ہوئی کہ ضبط نہ کر سکی۔ دل میں اُبال سا اُٹھ رہا تھا کہ رما اس وقت آجائے تو اس کی ملامت کرے کہ وہ بھی یاد کرے۔ تم انسان نہیں ہو۔ تم انسان کی صورت میں خونخوار درندے ہو۔ تم اتنے خبیث النفس ہو کہ آج کمینہ سے کمینہ آدمی بھی تمہارے اوپر تھوک رہا ہے تمہیں کسی نے پہلے ہی کیوں نہ قتل کر دیا۔ ان آدمیوں کی جان تو جاتی ہی، مگر تمہارے منہ میں کالکھ تو نہ لگتی۔

شام ہوگئی لیکن دیبی دین نہ آیا۔ رفتہ رفتہ آٹھ بج گئے۔ دفعتاً ایک موٹر دروازے پر آکر رک گئی۔ رما نے اتر کر جگو سے پوچھا۔ کیوں دادی سب خیر و عافیت تو ہے۔ دادا کہاں گئے ہیں۔

جگو نے ایک بار اس کی طرف دیکھا۔ اور منہ پھیر کر بولی۔ کہیں گئے ہوں گے میں کیا جانوں۔

رما نے سونے کی چار چوڑیاں جیب سے نکال کر جگو کے پیروں پر رکھ دیں اور بولا۔ یہ تمہارے لئے لایا ہوں دادی پہنو۔ ڈھیلی تو نہیں ہیں۔ جگو نے چوڑیاں اٹھا کر زمین پر پٹک دیں اور آنکھیں نکال کر بولی۔ بھگوان کی دیا سے بہت چوڑیاں پہن چکی ہوں۔ اور اب بھی سیر دو سیر سونا پڑا ہوگا لیکن جو کھایا پہنا اپنی محنت کی کمائی سے۔ کسی کا گلا نہیں دبایا، پاپ کی کمائی لے کر تم بہو کو دینے آئے ہو۔ سمجھتے ہوگے تمہارے روپوں کی تھیلی دیکھ کر وہ لٹو ہو جائے گی۔ اتنے دنوں اس کے ساتھ رہ کر بھی تمہاری لولی آنکھ اسے نہ پہچان سکی۔ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو انہیں پیروں جہاں سے آئے ہو وہیں لوٹ جاؤ۔ اس کے سامنے جا کر کیوں اپنا پانی اتروا ؤگے۔ تم آج پولیس کے ہاتھوں زخمی ہو کر آئے ہوتے تو بہو تمہاری

پوجا کرتی، تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیتی ۔ وہ ان عورتوں میں ہے جو چاہے مصیبتیں سہیں مگر کسی کی برائی نہیں دیکھ سکتی۔ اگر تم میرے لڑکے ہوتے تو تمہیں زہر دے دیتی ۔ کیوں مجھے کھڑے جلا رہے ہو۔ چلے کیوں نہیں جاتے، میں نے تم سے کچھ لے تو نہیں لیا ہے ۔

رما سر جھکائے خاموش سنتا رہا۔ تب دل گرفتہ ہو کر بولا۔ دادی میں نے برائی کی ہے اور اس کے لئے مرتے دم تک شرمندہ رہوں گا۔ لیکن تم مجھے جتنا کمینہ سمجھ رہی ہو اتنا کمینہ نہیں ہوں اگر تمہیں معلوم ہوتا کہ پولیس نے میرے ساتھ کیسی کیسی زیادتیاں کیں تو مجھ سے اتنی ناراض نہ ہوتیں ۔

جالپا کے کانوں میں ان آوازوں کی بھنک پڑی۔ اس نے زینہ سے جھانک کر دیکھا رمانا تھ کھڑا ہے ۔ سر پر بنارسی ریشمی صافہ تھا۔ ریشم کا بڑھیا کوٹ ۔ آنکھوں پر سنہری عینک اس ایک ہی مہینہ میں اس کا جسم چوگنا ہو گیا تھا۔ رنگت بھی نکھر آئی تھی۔ ایسی رونق اس کے چہرے پر کبھی نظر نہ آئی تھی۔ رما کی گفتگو کے آخری الفاظ اس کے کانوں میں پڑ گئے۔ باز کی طرح ٹوٹ کر دھم دھم کرتی نیچے آئی اور بولی۔ اگر سختیوں سے اتنا دب سکتے ہو تو تم بے غیرت ہو۔ تمہیں اپنے آپ کو مرد کہنے کا کوئی حق نہیں ہے ۔ کیا سختیاں کی تھیں۔ ذرا ہم بھی سنوں۔ لوگوں نے ہنستے ہنستے سر کٹائے ہیں۔ اپنے بیٹوں کو مرتے دیکھا ہے ۔ کولہو میں پیلے جانا منظور کیا ہے ۔ مگر حق سے جو بھر بھی منحرف نہیں ہوئے ۔ تم کیوں دھمکی میں آ گئے ۔ کیوں نہیں سینہ کھول کر کھڑے ہو گئے کہ اسے گولی کا نشانہ بنا لو۔ مگر میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ کیوں نہیں سر جھکا دیا۔ روح اس لئے جسم کے اندر رکھی گئی ہے کہ جسم اس کی حفاظت کرے۔ اس لئے نہیں کہ اس کو تباہ کر دے ۔ آخر اس کا کیا انعام ملا۔ ذرا معلوم تو ہو۔

رما نے دبی ہوئی آواز سے کہا۔ ابھی تو وعدے ہی وعدے ہیں۔

جالپا نے ناگن کی طرح پھنکار کر کہا۔ یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ ایشور سے یہی

دعا کرتی رہی تھی۔ لیکن تم جیسے موم کے پتلوں کو پولیس کبھی ناراض نہیں کرے گی۔ جاؤ شوق سے زندگی کے مزے لوٹو۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا اور آج پھر کہتی ہوں کہ میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں نے سمجھ لیا کہ تم مر گئے۔ تم بھی سمجھ لو کہ میں مر گئی۔ بس جاؤ میں عورت ہوں اگر کوئی سختیاں کر کے مجھ سے ایسی شرمناک حرکت کرانے کی کوشش کرے تو چاہے اسے نہ مار سکوں مگر اپنی گردن پر چھُری چلا لوں گی۔ کیا تم میں عورتوں کے برابر بھی ہمت نہیں ہے۔

رما نے عاجزی سے گڑگڑا کر کہا۔ تم میرا کوئی عذر نہ سنو گی۔

جالپا نے بے اعتنائی سے کہا۔ نہیں۔

تو میں منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جاؤں۔

تمہاری خوشی۔

تم معاف نہ کرو گی۔

کبھی نہیں۔ کسی طرح نہیں۔

رما ایک لمحہ تک سر جھکائے کھڑا رہا۔ تب آہستہ آہستہ برآمدے کے نیچے جا کر جگو سے بولا۔ دادا آویں تو کہہ دینا مجھ سے ذرا دیر کے لئے مل لیں۔ جہاں کہیں آ جاؤں۔

جگو نے اگھل کر کہا۔ کل ہیں چلے آنا۔

رما نے موٹر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ یہاں اب نہ آؤں گا دادی۔

موٹر چلی گئی تو جالپا نے حاسدانہ انداز سے کہا۔ موٹر دکھانے کو آئے تھے جیسے خرید ہی تو لائے ہیں۔

جگو نے سرزنش کی۔ نہیں اتنا بے لگام نہ ہونا چاہیئے تھا۔ بہوؤں پر چوٹ لگتی ہے تو آدمی کو کچھ نہیں سوجھتا۔

جالپا نے بیدردی سے کہا۔ ایسے حیادار نہیں ہیں دادی! اسی عیش کے لئے تو

ایمان بیچا ہے، پوچھا نہیں دادا سے مل کر کیا کر دگے۔ وہ ہوتے تو ایسی پھٹکار سناتے کہ چھٹی کا دو یاد آجاتا۔

جگو ممتا سے بھرے ہوئے لہجے میں بولی، تمہاری جگہ میں ہوتی تو میرے منہ سے ایسی باتیں نہ نکلتیں۔ تمہارا کلیجہ بڑا سخت ہے، دوسرا مرد ہوتا تو کیا اس طرح چپکا چپکا سنتا۔ میں تو تھر تھر کانپ رہی تھی کہ کہیں تمہارے اوپر ہاتھ نہ چلاویں، مگر ہیں بڑے غمخوار۔

جالیا نے اسی بے رحمی سے کہا۔ اسے غمخوار نہیں کہتے دادی۔ یہ بے حیائی ہے۔

دیبی دین نے آکر کہا، کیا یہاں بھیا آئے تھے۔ مجھے موڑ پر راستے میں دکھائی دیئے تھے۔

جگو نے کہا۔ ہاں آئے تھے کہہ گئے ہیں دادا ذرا مجھ سے مل لیں۔

دیبی دین نے بے دلی سے کہا۔ ہاں مل لونگا، کچھ اور بات چیت ہوئی۔

جگو جھینپتی ہوئی بولی۔ بات چیت کیا ہوئی، پہلے میں نے پوجا کی، میں چپ ہو تو بہو نے اچھی طرح مالا پھول چڑھایا۔

جالیا نے بیباکی سے کہا۔ آدمی جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔

جگو۔ اپنا ہی سمجھ کر ملنے آئے تھے۔

جالیا۔ کوئی بلانے تو گیا نہ تھا۔

یہ کہہ کر اس نے دیبی دین سے پوچھا کہ ونیش کا کچھ پتہ لگا دادا۔

دیبی دین نے کہا۔ ہاں سب پوچھ آیا، ہوڑے میں گھر ہے پتہ ٹھکانہ سب معلوم ہے۔

جالیا۔ تو اس وقت چلوگے یا کل کسی وقت۔

دیبی۔ تمہاری جیسی خوشی۔ جی چاہے اسی وقت چلو میں تیار ہوں۔

جالیا تھک گئے ہوگے۔

دیں۔ ایسے کاموں میں تھکن نہیں ہوتی۔

آٹھ بج گئے تھے۔ سڑک پر موٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ سڑک کی دونوں پٹریوں پر ہزاروں عورت مرد بنے ٹھنے ہنستے ہوئے بولتے جاتے تھے۔ جالپا نے سوچا۔ دُنیا کیسی اپنے راگ رنگ میں مست ہے جیسے اس کے لئے مرنا ہو مرے۔ وہ اپنی عادت نہ چھوڑے گی۔ ہر ایک اپنا چھوٹا سا مٹی کا ہی گھروندا بنائے بیٹھا ہے۔ ملک تباہ ہو جائے۔ اسے غم نہیں اس کا گھروندا بچا رہے۔ جالپا کا بھولا بھالا دل اس وقت بازار کو بند دیکھ کر خوش ہوتا۔ لوگ غم سے سر جھکائے یا غصّہ سے تیوریاں بدلے نظر آتے۔ وہ نہ جانتی تھی کہ خلقت کے اس سمندر میں ایسی چھوٹی چھوٹی کنکریوں نے گرنے سے ایک ہلکورا بھی نہیں اُٹھتا۔ آواز تک نہیں ہوتی۔

(۴۴)

رما موٹر پر بیٹھ کر چلا تو اسے کچھ سوجھتا نہ تھا۔ جاتے ہوئے راستے اس کے لیے انجان ہو گئے تھے۔ اُسے جالپا پر غصّہ نہ آتا تھا۔ ذرا بھی نہیں۔ جگو پر بھی اُسے غصّہ نہ آتا تھا۔ غصّہ آتا تھا اپنی کمزوری پر اور اپنی بے شرمی اور بے غیرتی پر۔ پولیس والوں کے زیر اثر اس کے ضمیر پر پردہ پڑ گیا تھا۔ وہ کتنی بڑی بے انصافی کرنے جا رہا تھا۔ اس کا اُسے صرف اس دن خیال آیا تھا جب جالپا نے اسے تنبیہہ کی تھی۔ وہ پھر پولیس والوں کے چکمے میں آ گیا۔ افسروں نے بڑی بڑی امیدیں بندھا کر اسے بہلا رکھا۔ اس کے بعد اسے جالپا سے ملنے کا موقع نہ ملا۔ پولیس کا رنگ اس پر جمتا گیا۔ آج وہ ایک جڑاؤ ہار جیب میں رکھے جالپا کو اپنی کامیابی کی خوشخبری دینے گیا تھا۔ وہ جانتا تھا جالپا پہلے کچھ ناک بھوں سکوڑے گی۔ مگر یہ بھی جانتا تھا کہ یہ ہار دیکھ کر وہ ضرور خوش ہو جائے گی۔ کل ہی صوبہ متحدہ کے ہوم سکریٹری کے نام پولیس کمشنر کا سفارشی خط اسے مل جائے گا۔ دو چار دن اور لطف صحبت اُٹھانے

کے بعد وہ گھر کی راہ لے گا۔ دیبی دین اور جگو کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ ان کا احسان وہ کیونکر بھول سکتا تھا۔ یہی منصوبہ دل میں باندھ کر وہ جالپا کے پاس گیا تھا۔ جیسے کوئی بے چاری پھول اور شیرینی لے کر دیوتا کی پوجا کرنے جائے۔ لیکن دیوتا نے اس کے تھال کو ٹھکرا دیا۔ اس کے پھولوں کو پیروں سے کچل ڈالا۔ اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملا۔ آج پولیس کے دائرۂ اثر سے بالکل باہر نکل کر آزادی کی فضا میں اس کا ضمیر بیدار ہو گیا تھا۔ اب اپنی خباثت اسے اصلی روپ میں نظر آئی۔ اس کے دل میں ایک ہیجان پیدا ہوا کہ اسی وقت جج کے پاس جائے اور وہ سارا واقعہ کہہ سنائے۔ کیا جج اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کر سکتا۔ ابھی تو سب ہی ملزم حوالات میں ہیں۔ پولیس والوں کے دانت پیسنے کا اسے مطلق خوف نہ تھا۔ جالپا کی وہ غصے میں بھری ہوئی صورت اس کی صورت اس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ اُف! کتنے طیش میں تھی۔ اگر وہ جانتا کہ جالپا اتنی برہم ہو جائے گی تو چاہے دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جاتی اپنا بیان ضرور بدل دیتا۔ اگر کہیں جج نے کچھ سماعت نہ کی اور ملزموں کو بری نہ کیا تو جالپا اس کا منہ نہ دیکھے گی۔ پھر وہ زندہ ہی کیوں رہے۔ کس لئے رہے۔

اس نے موٹر روکی۔ اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہاں آ گیا یکایک چوکیدار نظر آ گیا۔ رما نے اس سے جج کے بنگلہ کا پتہ پوچھا۔ چوکیدار ہنس کر بولا۔

حضور تو بہت دور نکل آئے۔ یہاں سے تو چھ سات میل سے کم نہ ہوگا۔ وہ اِدھر اُدھر چورنگی کی طرف رہتے ہیں۔

رما چورنگی کی طرف چلا۔ نو بج گئے تھے۔ معلوم نہیں جج سے ملاقات بھی ہو گی یا نہیں۔ کچھ بھی ہو آج ان سے بغیر اپنی سرگذشت کہے وہ نہیں لوٹے گا۔ اگر انہوں نے کچھ سماعت کی تو اچھا ہی ہے۔ نہیں تو وہ کل ہائی کورٹ کے ججوں سے کہے گا۔ کوئی تو سنے گا۔ وہ سارا واقعہ اخباروں میں چھپوا دے گا تب تو سب کی آنکھیں کھلیں گی۔

موٹر تیس میل کی رفتار سے جا رہی تھی۔ دس ہی منٹ میں چورنگی آ پہونچی۔ یہاں ابھی تک وہی چہل پہل تھی۔ مگر رما اس زناٹے سے موٹر لئے جا رہا تھا۔ یکایک ایک پولیس مین نے لال بتی دکھلائی۔ رما نے موٹر روک لی اور سر باہر نکال کر دیکھا تو وہی داروغہ جی۔

داروغہ نے پوچھا۔ کیا ابھی تک بنگلے پر نہیں گئے۔ کہئے بیگم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے تو سمجھا تھا وہ آپ کے ساتھ ہوں گی۔ خوش تو خوب ہوئی ہوں گی۔

رما نے بات بنا کر کہا۔ جی ہاں بہت خوش ہوئیں۔

میں نے تو کہا ہی تھا عورتوں کی ناراضگی کی یہی دوا ہے۔ آپ کانپے جاتے تھے میری حماقت تھی۔

چلئے اب میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ ایک بازی تاش اڑے اور ذرا سرور جمے۔ انسپکٹر صاحب بھی آتے ہونگے۔ اب آپ مسز رما ناتھ کو بنگلے پر ہی کیوں نہیں بلا لیتے۔

رما نے کہا۔ ابھی تو مجھے ایک ضرورت سے دوسری طرف جانا ہے۔ آپ موٹر لے جائیں۔ میں پاؤں پاؤں چلا آؤں گا۔

داروغہ نے موٹر کے اندر آ کر کہا۔ نہیں صاحب مجھے تو کوئی جلدی نہیں ہے۔ آپ جہاں چاہیں چلئے میں ذرا بھی مخل نہ ہوں گا۔

رما نے کچھ ترش ہو کر کہا۔ میں سمجھ رہا ہوں۔ لیکن میں ابھی بنگلے پر نہیں جا رہا ہوں۔

داروغہ نے مسکرا کر کہا۔ میں سمجھ رہا ہوں۔ لیکن میں ذرا بھی مخل نہ ہونگا۔

رما نے جھلا کر کہا۔ آپ جو کچھ سمجھ رہے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں۔

داروغہ نے کچھ نادم ہو کر کہا۔ اچھا صاحب خطا ہوئی معاف کیجئے۔ لیکن ابھی آپ اپنے کو خطرے سے باہر سمجھیں۔ آپ کو کسی ایسی جگہ نہ جانے دونگا جہاں مجھے پورا اطمینان نہ ہوگا۔ میں آپ ہی کے فائدے کے خیال سے یہ عرض کر رہا ہوں۔

رمانے ہونٹ چبا کر کہا۔ بہتر ہو آپ میرے فائدے کا اتنا خیال نہ کریں۔ آپ لوگوں نے مجھے ملیا میٹ کر دیا۔ اور اب بھی گلا نہیں چھوڑتے۔ مجھے اب اپنے حال پر مرنے دیجئے میں اس غلامی سے تنگ آگیا ہوں۔

یہ کہتا ہوا وہ موٹر سے اتر پڑا۔ اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ دروغہ نے کئی بار پکارا لیکن اس نے پیچھے پھر کر دیکھا تک نہیں۔ کچھ دور جا کر وہ ایک موڑ پر گھوم گیا اسی سڑک پر جج کا بنگلہ تھا۔ سڑک پر کوئی آدمی نہ تھا۔ رما کبھی اس بازو، کبھی اس بازو پر جا جا کر بنگلوں کے سائن بورڈ پڑھتا چلا جاتا تھا۔ یکایک جج کا نام دیکھ کر وہ رک گیا۔ اندر جانے کی ہمت نہ پڑی، خیال آیا جج نے پوچھا تم نے جھوٹی گواہی کیوں دی تو کیا جواب دوں گا۔ یہ کہنا کہ پولیس نے مجھ سے زبردستی گواہی دلوائی ترغیبیں دیں، تشدد کیا شرمناک معلوم ہوتا تھا۔ اگر وہ پوچھے کہ تم نے محض دلو تین سال کی سزا سے بچنے کے لئے اتنے بے گناہوں کا خون سر پر لے لیا تو اس کا میرے پاس کیا جواب ہے۔ خواہ مخواہ ذلیل ہونا پڑے گا بے وقوف بنایا جاؤں گا وہ انہیں پاؤں لوٹ پڑا۔ اس ذلت کا مقابلہ کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

(۴۵)

رما آدھی رات گئے سویا تو نو بجے دن تک آنکھ نہ کھلی۔ وہ خواب دیکھ رہا تھا، دنیش کو پھانسی ہو رہی ہے۔ اسی وقت دروغہ نے آکر کہا۔ آج تو آپ خوب سوئے بابو صاحب کل کب سوئے۔

رمانے لیٹے ہی لیٹے جواب دیا۔ ذرا دیر بعد لوٹ آیا۔ اس مقدمہ کی اپیل تو ہائی کورٹ میں ہوگی۔

دروغہ۔ اپیل کیا ہوگی۔ ضابطہ کی پابندی ہوگی۔ آپ نے مقدمہ کو اتنا مضبوط

کر دیا ہے کہ اب وہ کسی کے ہلائے ہل نہیں سکتا۔

دفعتاً ڈپٹی اور انسپکٹر پولیس دونوں آپہونچے۔ ڈپٹی صاحب نے کہا۔ ابھی تو آپ سویا ہوا ہے کمشنر صاحب آپ سے بہت خوش ہے۔

یہ دیکھئے انہوں نے آپ کو یہ سفارشی چٹھی دی ہے۔ بس یہی سمجھ لیجئے کہ آپ کی تقدیر کھل گئی۔

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک لفافہ رما کی طرف بڑھا دیا۔ رمانے لفافہ کھول کر دیکھا۔ یکایک اسے پھاڑ کر پرزہ پرزہ کر ڈالا۔ تینوں آدمی حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگے۔

داروغہ نے تیز ہو کر کہا۔ یہ آپ نے کیا حماقت کی۔

انسپکٹر۔ حلف سے کہتا ہوں، کمشنر صاحب کو معلوم ہوگا تو بہت ناراض ہوں گے۔

ڈپٹی۔ اس کا کچھ مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر آپ اتنے ناراض کیوں ہیں۔

رما۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اس خط کی ضرورت نہیں اور نہ میں نوکری چاہتا ہوں۔ میں آج ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔

ڈپٹی۔ جب تک ہائی کورٹ کا فیصلہ نہ ہو جائے آپ کہیں نہیں جا سکتے۔

رما۔ کیوں؟

ڈپٹی۔ کمشنر صاحب کا یہ حکم ہے۔

رما۔ میں کسی کا غلام نہیں ہوں۔

انسپکٹر۔ بابو صاحب! آپ ناحق بنا بنایا کھیل بگاڑ رہے ہیں جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ دس پانچ دن میں ہائی کورٹ سے فیصلہ کی تصدیق ہو جائے گی۔ آپ کی

بہتری اسی میں ہے کہ جو صلہ مل رہا ہے اسے شکریہ کے ساتھ قبول کیجئے اور آرام سے زندگی کے دن بسر کیجئے۔ خدا نے چاہا تو ایک دن آپ بھی کسی اونچے منصب پر ہوں گے۔ یہ واضح رہے کہ افسروں کی ذرا سی نگاہ بدل جائے تو آپ کا کہیں پتہ نہ لگے۔ حلف سے کہتا ہوں پولیس کے ایک ذرا سے اشارے پر دس سال کی سزا ہو جائے گی۔ آپ ہیں کس زعم میں۔ ہم آپ کے ساتھ دغا نہیں کرنا چاہتے۔ ہاں اگر ہمیں بھی پولیس کی چالیں چلنی پڑیں گی۔ جیل کو آسان نہ سمجھئے گا۔ خدا دوزخ میں لے جائے۔ پر جیل کی سزا نہ دے۔ حلف سے کہتا ہوں کہ جیل دوزخ سے بھی بدتر ہے۔

دروغہ۔ یہ بے چارے اپنی بیوی سے مجبور ہیں۔ وہ شاید ان کی جان کی گاہک ہو رہی ہے۔

انسپکٹر۔ کیا ہوا۔ کل تو آپ وہ ہار لے گئے تھے۔ پھر بھی ان کا منہ سیدھا نہ ہوا۔

رما نے کوٹ کی جیب سے ہار نکال کر میز پر رکھ دیا اور بولا۔ وہ ہار یہ رکھا ہے

ڈپٹی۔ کوئی مغرور عورت ہے۔

انسپکٹر۔ کچھ ان کی بھی مزاج پرسی کرنی پڑے گی۔

دروغہ۔ یہ تو بابو صاحب کے سلیقے اور برتاؤ پر منحصر ہے۔

ڈپٹی۔ اس کھٹک سے بھی مچلکہ لینا چاہیئے۔

رما ناتھ کے سامنے ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ ممکن تھا وہ اپنے کو فرض پر قربان کر دیتا۔ دو چار سال کی سزا کے لئے بھی تیار ہو جاتا۔ شاید اس نے ان سختیوں کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کر لیا تھا۔ لیکن اپنے ساتھ جالپا کو بھی مصیبت میں ڈالنے کا ارادہ کسی طرح نہ کر سکتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ پولیس کے پنجے میں کچھ اس طرح پھنس گیا ہے کہ اس کے بے داغ بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ وہ پولیس سے ہرگز بچنش نہیں پا سکتا۔ اس خیال نے اس کی تیزی اور تندی غائب کر دی۔

یکسانہ انداز سے بولا۔ آخر آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟
انسپکٹر نے درد غہ کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔ گویا کہہ رہے ہیں۔ آ گیا پنجے میں اور بولے بس ہم اتنا ہی چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے مہمان بنے رہیں اور مقدمہ ہائیکورٹ سے طے ہو جانے کے بعد خوش خوش رخصت ہو جائیں۔ کیونکہ اس کے بعد ہم آپ کی حفاظت کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ ابھی جو خط آپ نے پھاڑ کر پھینک دیا ہے اس کی نقل دوبارہ مل سکتی ہے۔ اگر آپ دوُر اندیش ہیں تو اس سے اپنی زندگی کی اصلاح میں کام لیں گے نہیں تو ادھر اُدھر کے دھکے کھائیں گے۔ اور آپ کے اوپر گناہ بے لذت کی مثل صادق آئے گی۔ اس کے سوا ہم آپ سے کچھ نہیں کہتے۔
تینوں افسر رخصت ہو گئے۔ اور رما ایک سگار جلا کر ان معاملات پر غور کرنے لگا۔

(۴۶)

ایک مہینہ اور نکل گیا۔ ہائی کورٹ میں مقدمہ کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ رما پر پھر پولیس کا رعب غالب آ گیا ہے اور وہ پھر سابق دستور افسروں کے اشاروں پر ناچتا ہے وہ اب پہلے سے کہیں زیادہ شراب پینے لگا ہے اور اس کی مزید دلچسپی کے لئے پولیس نے زہرہ نام کی ایک نازنین کو بھی مقرر کر دیا ہے۔ زہرہ حسین ہے خوش گلو ہے اور مزاج شناس ہے۔ اس نے اپنی ہمدردانہ باتوں سے رما ناتھ کو گرویدہ کر لیا ہے۔ اس کی سادگی اور خلوص نے زہرہ کو بھی اس سے مانوس کر دیا ہے۔ اب تک اُسے جن لوگوں سے سابقہ پڑا تھا وہ سبھی اسے ایک آلۂ تفریح سمجھتے تھے۔ رما وہ پہلا آدمی تھا جو اُس کوچہ سے ناواقف ہونے کے باعث اسے اپنا شریک غم بنانا چاہتا تھا۔
ایک دن اس نے دورانِ گفتگو میں زہرہ سے کہا۔ تم مجھ پر اتنی مہربان ہو کہ

میں ڈرتا ہوں کہ تمہاری محبت میں گرفتار نہ ہو جاؤں، مگر تم سے وفا کی اُمید ہو سکتی ہے

زہرہ نے دل میں خوش ہو کر اپنی مخمور آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ہم وفا کیا جانیں ہمارا تو پیشہ ہی حُسن فروشی ہے۔

رما۔ کیا اس میں کوئی شک بھی ہے۔

زہرہ۔ مطلق نہیں۔ آپ لوگ ہمارے پاس محبت سے لبریز دل لے کر آتے ہیں مگر ہم اتنے بے وفا ہیں کہ اس کی ذرا بھی قدر نہیں کرتے رہے یہی بات نہ ؟

رما۔ بے شک!

زہرہ۔ معاف کیجئے گا۔ آپ مردوں کی طرفداری کر رہے ہیں۔ حق یہ ہے کہ آپ لوگ ہمارے پاس محض تفریح کے لئے آتے ہیں۔ محض غم غلط کرنے کے لئے۔ محض نفسانی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے جہاں آپ کو وفا کی تلاش ہی نہیں وہاں وفا سے کیونکر! لیکن اتنا ہی جانتی ہوں کہ ہم میں جتنی بے چاریاں مردوں کی بے مہری اور بے وفائی سے مایوس ہو کر خون جگر پیتی ہیں ان کا پتہ اگر دنیا کو چلے تو آنکھیں کھل جائیں یہ ہماری حماقت ہے کہ تماش بینوں سے وفا کی امید رکھتے ہیں مگر پیاسا آدمی اندھے کنوئیں کی طرف دوڑے تو میرے خیال میں اس کا کوئی قصور نہیں۔

آج تو حضرت خوب مزے میں آئے۔ خدا نے چاہا تو چار دن کے بعد بیوی کا نام بھی نہ لیں گے۔

داروغہ نے خوش ہو کر کہا۔ یہ تو میں نے پہلے ہی سمجھ رکھا تھا۔ لطف تو یہ ہے کہ اس کی بیوی مایوس ہو کر چلی جائے۔ ایسے گاؤدیوں کو سبز باغ دکھانا تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

زہرہ کی آمدورفت بڑھنے لگی۔ بالآخر رما خود اپنے ہی جال میں پھنس گیا۔ اس نے زہرہ سے الفت کا سوانگ بھر کر افسروں کی نگاہوں میں اپنا وقار جمانا چاہا تھا

لیکن زہرہ اب اُسے وفا اور محبت کی دیوی سی معلوم ہوتی تھی، وہ جالیپا کی سی حسین نہ سہی، اظہار محبت میں اس سے کہیں زیادہ ہوشیار، نازوادا میں اس سے کہیں زیادہ پختہ کار اور سحر آفرینی میں کہیں زیادہ مشتاق تھی۔ رفتہ رفتہ رما کے دل میں نئے نئے منصوبے پیدا ہونے لگے۔

ایک دن اس نے زہرہ سے کہا۔ زہرہ کی جدائی کی گھڑی آرہی ہے۔ دو چار دن میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ پھر تو تمہیں میری یاد بھی نہ آئے گی۔

زہرہ نے محبت آمیز لہجہ میں کہا۔ اب تمہیں نہ جانے دوں گی۔ یہیں کوئی اچھی سی نوکری کر لینا۔ پھر ہم دونوں آرام سے رہیں گے۔

رما مخمور ہو کر بولا۔ یہ دل سے کہتی ہو زہرہ؟ دیکھو تمہیں میرے سر کی قسم! دغا مت دینا۔

زہرہ۔ اگر یہ خوف ہے تو نکاح پڑھا لو۔ نکاح کے نام سے نفرت ہو تو شادی کر لو۔ اب اس کے سوا اپنی محبت کا کیا ثبوت دوں۔

خلوص میں ڈوبے ہوئے ان الفاظ نے رما کو متوالا کر دیا۔ اس نے سوچا یہ نازنین جس پر بڑے بڑے رئیس فدا ہیں میرے لئے اتنی بڑی قربانی کرنے کو تیار ہے اس کی خوش نصیبی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ جس کان میں دوسروں کو بالو کے ذرّے ملتے ہیں اس میں اسے سونے کے ڈلے مل گئے۔ کیا یہ حسنِ تقدیر نہیں ہے۔ رما کے دل میں کئی روز تک کشمکش ہوتی رہتی۔ جالیپا کے ساتھ آنے والی زندگی کا خیال کر کے وہ مایوس ہو جاتا تھا۔ وہ زندگی کتنی خشک اور صبر آزما ہو گی۔ جالیپا قدم قدم پر فرض اور حق کا جھنڈا لے کر کھڑی ہو جائے گی اور اسے زاہدوں کی سی زندگی بسر کرنی پڑے گی۔ فقیرانہ زندگی میں رما کے لئے کوئی کشش نہ تھی۔ عام آدمیوں کی طرح وہ بھی عیش و آرام چاہتا تھا۔ زندگی کے مزوں سے اس کی طبیعت سیر نہ ہوئی تھی۔

تیسوئی جالپا کی طرف سے ہٹ کر اس کا عیش پرور دل زہرہ کی طرف دوڑا۔ اسے ناز فروشوں کی مثالیں یاد آنے لگیں۔ جن کی عصمت کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی رنگین مزاج اور وفا شعار بیویوں کی مثالیں بھی آپہنچیں۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ انسان کی طبیعتیں جُدا جُدا ہیں۔ پردہ کے باہر آجانے سے کوئی گنہگار نہیں ہو جاتا۔ اور نہ پردے کے اندر بیٹھ کر کوئی عصمت مآب ہو جاتا ہے یہ سب زندگی کے اتفاقات ہیں۔

زہرہ روز آتی اور بندھن میں ایک گانٹھ دے کر چلی جاتی۔ ان حالات میں کئی متنقل مزاج نوجوانوں کے بھی آسن ڈول جاتے۔ رما تو عیش کا بندہ تھا۔ اب تک وہ محض اس لئے بے راہ نہ ہوا تھا کہ جوں ہی اس نے پر نکالے صیاد نے اسے پنجرے میں قید کر لیا۔ کچھ دن پنجرے سے باہر آجانے پر بھی اسے پرواز کی ہمت نہ ہوئی۔ اب اس کے سامنے ایک نیا اور وسیع منظر تھا۔ وہ چھوٹا سا کھمبوں والا پنجرہ نہیں بلکہ پھولوں سے لہراتا ہوا باغ جہاں کی قید میں بھی آزادی کا مزا تھا۔

(۴۷)

رما جیوں جیوں زہرہ کے دامِ الفت میں پھنستا جاتا تھا پولیس کے افسر اس کی طرف سے بے فکر ہوتے جاتے تھے۔ اس کے اوپر جو قیدیں لگائی گئی تھیں وہ رفتہ رفتہ ترک ہوتی جاتی تھیں۔ ایک دن رما ڈپٹی صاحب کے ساتھ سیر کرنے نکلا تو موٹر دیبا دین کی دکان کے سامنے سے گزری۔ رما نے اپنا سر اندر کھینچ لیا کہ کسی کی اس پر نظر نہ پڑ جائے۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ جالپا ہے یا چلی گئی۔ لیکن دیبا دین کو دیکھ کر اس کا سر آپ ہی آپ شرم سے جھک جاتا۔ وہ کسی دلیل سے اپنے اطوار کی حمایت نہ کر سکتا تھا۔ اس کی خیریت اسی میں تھی کہ وہ ان لوگوں سے اب ملنا جُلنا

چھوڑدے۔ شہر میں تین آدمیوں کے سوا جو تھے آدمی سے .. ... اس کی ملاقات یا راہ ورسم نہ تھی جس کی حرف گیری کی اسے پرواہ ہوتی۔

موٹر ادھر اُدھر گھومتی ہوئی ہوڑہ کے پل کی طرف جا رہی تھی کہ یکایک رمانے ایک عورت کو سر پر گنگا جل کا کلسا رکھے گھاٹوں کے اوپر چڑھتے دیکھا کہ اس کے کپڑے بہت میلے ہو رہے تھے اور اتنی لاغر تھی کہ کلسے کے بوجھ سے اس کی کمر دہری ہو رہی تھی۔ اس کی چال کچھ کچھ جالپا سے ملتی ہوئی معلوم ہوئی۔ رمانے سوچا جالپا یہاں کیا کرنے آئے گی۔ کوئی دوسری عورت ہوگی۔ اس کی صورت دیکھ کر مزید اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ مگر ایک ہی لمحہ میں کار اور آگے بڑھ گئی۔ اور رما کو اس کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کا کلیجہ دھک سے ہو گیا یہ جالپا ہی تھی۔ اس نے کھڑکی کی بغل میں سر جھکا دیا۔ بیشک جالپا تھی۔ مگر کتنی لاغر اندام گویا کوئی بیکس ضعیفہ ہو۔ چہرہ پر رونق تھی نہ وہ سادگی اور زدہ غرور۔ رما سے درد نہ تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ جالپا اس حالت میں اور اس کے جیتے جی۔ غالباً دیبی دین نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ اور وہ مزدوری کر کے بسر کر رہی ہے مگر نہیں دیبی دین اتنا بے مروّت نہیں ہے۔ جالپانے خود اس کے سایۂ حمایت میں رہنا منظور نہ کیا ہوگا غالی ظرف تو ہے ہی۔ مگر کیسے معلوم ہو کیا بات ہے۔

موٹر دور نکل آئی تھی۔ رما کی ساری شوقین مزاجی۔ ساری شوریدہ سری غائب ہو گئی۔ اس میلے کپڑے والی ستم رسیدہ جالپا کی صورت آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔ کس سے پوچھے کہاں جائے۔ جالپا کا نام بھی زبان پر آ جائے تو سب کے سب بدگمان ہو جائیں اور اسے قید تنہائی میں ڈال دیں۔ ہائے جالپا کے چہرے پر کتنی حسرت تھی۔ آنکھوں میں کتنی بے کسی۔

کچھ دیر کے بعد زہرہ آئی۔ مسکراتی اور لچکتی۔ رما اس سے کچھ بھی مخاطب ہوا۔
زہرہ نے پوچھا۔ آج کسی کی یاد آ رہی ہے کیا۔

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی گول مکھن سی نرم باہیں اس کی گردن میں ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ رما نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی۔ اس طرح اس کے سینہ پر اپنا سر رکھ دیا۔ گویا اب یہی اس کا سہارا ہے۔

زہرہ نے دردمندانہ لہجہ میں پوچھا۔ سچ بتاؤ آج اتنے اداس کیوں ہو۔ کیا مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو۔

رما نے رقت آمیز انداز سے کہا۔ نہیں زہرہ تم نے مجھ بدنصیب پر جتنا رحم کیا ہے اس کے لئے میں ہمیشہ تمہارا احسان مند رہوں گا۔ تم نے اس وقت مجھے سنبھالا جب میری زندگی کی ٹوٹی ہوئی کشتی غوطے کھا رہی تھی وہ دن میری زندگی کے سب سے مبارک دن ہیں اور میں اپنے سینے میں انہیں ہمیشہ محفوظ رکھونگا۔ مگر بدنصیبوں کے لئے دنیا میں آسائش کہاں۔ میں نے آج جالپا کو جس صورت میں دیکھا ہے وہ میرے دل کو بھالوں کی طرح چھید رہا ہے آج وہ پھٹے اور میلے کپڑے پہنے سر پہ پانی کا کلسا لئے چلی جا رہی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر میرے جگر کے ٹکڑے ہو گئے۔ مجھے اپنی زندگی میں کبھی صدمہ نہ ہوا تھا کچھ نہیں کہہ سکتا اس پر کیا گذری ہے

زہرہ نے پوچھا۔ وہ تو اس مالدار کھٹک کے گھر پر تھیں۔

رما۔ ہاں تھی تو مگر نہیں کہہ سکتا کیوں وہاں سے چلی گئی۔ میرے ساتھ ڈپٹی صاحب تھے ان کے سامنے میں اس سے کچھ پوچھ نہ سکا۔ میں جانتا ہوں وہ مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتی اور شاید مجھے حقیر سمجھتی۔ مگر کم سے کم مجھے اتنا معلوم تو ہو جاتا کہ وہ اس وقت کس حالت میں ہے۔ زہرہ تمہیں اپنے دل میں جا ہے جو سمجھ رہی ہو لیکن میں اس خیال میں مست ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے اور محبت کرنے والے سے ہم کم سے کم ہمدردی کی امید ضرور رکھتے ہیں۔ یہاں ایک بھی ایسا آدمی نہیں جس سے میں اپنے دل کا درد کہہ سکوں۔ تم بھی مجھے گمراہ کرنے کے لئے ہی بھیجی گئی

تھیں۔ مگر تمہیں مجھ پر رحم آ گیا شاید تم نے ایک گرے ہوئے آدمی کو ٹھوکر مارنا مناسب نہ سمجھا۔ اگر خدانخواستہ آج ہم میں اور تم میں کسی وجہ سے بدمزگی ہو جائے تو کیا کل تم مجھے مصیبت میں دیکھ کر ذرا بھی ہمدردی نہ کرو گی۔ کیا مجھے بھوکوں مرتے دیکھ کر میرے ساتھ اس سے بہتر سلوک نہ کرو گی۔ جو آدمی کتوں کے ساتھ کرتا ہے کیا اس وقت تم میرے ساتھ ذرا بھی ہمدردی نہ کرو گی۔ زہرہ تم اگر چاہو تو جالپا کا پورا پورا پتہ لگا سکتی ہو وہ کہاں ہے کیا کرتی ہے میری طرف سے اس کے دل میں کیا خیال ہیں۔ گھر کیوں نہیں جاتی رہیاں کب تک رہنا چاہتی ہے اگر تم کسی طرح جالپا کو گھر جانے پر راضی کر سکو تو میں عمر بھر تمہاری غلامی کروں گا۔ اس خستہ حالی میں میں اُسے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے ایسا صدمہ ہو رہا ہے کہ شاید میں آج رات کو یہاں سے بھاگ جاؤں۔ مجھ پر کیا گذرے گی اس کا مجھے مطلق غم نہیں ہے۔ میں دلیر نہیں ہوں۔ خطرہ کے سامنے ہمیشہ میرا حوصلہ پست ہو جاتا ہے۔ لیکن میری بے غیرتی بھی یہ چوٹ نہیں سہہ سکتی۔

زہرہ طوائف تھی۔ بھلے بُرے سبھی طرح کے آدمیوں سے اسے سابقہ پڑ چکا تھا۔ آدمیوں کا مزاج پہچانتی تھی۔ اس پردیسی نوجوان میں اسے وہ چیز ملی جس کا دوسروں میں کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کی زندگی میں زہرہ کو یہ پہلا آدمی ملا تھا جس نے اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ ایسے وفادار محبت کے پتلے کو وہ مایوس نہ کر سکتی تھی۔ رما کی باتیں سن کر اسے ذرا بھی حسد نہ ہوا۔ بلکہ اس کے دل میں ایک خود غرضانہ امانت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس موقع پر رما کو خوش کر کے ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنا سکتی تھی۔ جالپا سے اُسے کوئی خوف نہ تھا۔ جالپا کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو۔ زہرہ اپنی عشوہ طرازی اپنی دل لبھانے والی اداؤں سے اس کا رنگ پھیکا کر سکتی تھی۔ اس نے بارہا گلوزار کھنڈرائیوں کو رُلا کر چھوڑ دیا تھا پھر جالپا کس شمار میں تھی۔

زہرہ نے اس کی دلجوئی سے کہا۔ تو اس کے لئے تم اتنے رنجیدہ کیوں ہو۔

زہرہ تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہے ۔ میں کل ہی جالپا کو تلاش کروں گی ۔ وہ یہاں رہنا چاہیں گی تو ان کے آرام کا سامان مہیا کر دوں گی ۔ جانا چاہیں گی تو ریل پر بٹھا دوں گی ۔

رما نے بڑی عاجزی سے کہا ۔ ایک بار میں اس سے مل لیتا تو میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ۔

زہرہ نے فکرمند ہو کر کہا ۔ یہ تو مشکل ہے ۔ تمہیں یہاں سے کون جانے دے گا ۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میں جالپا کو پارک میں کھڑی کر آؤں ۔ تم ڈپٹی صاحب کے ساتھ وہاں جاؤ اور کسی بہانے سے اس سے مل لو ۔

رما کچھ کہنا چاہتا تھا کہ داروغہ جی نے پکارا ۔ مجھے بھی خلوت میں آنے کی اجازت ہے ۔ دونوں سنبھل کر بیٹھے اور دروازہ کھول دیا ۔ داروغہ جی مسکراتے ہوئے آئے ۔ اور زہرہ کی بغل میں بیٹھ کر بولے ۔ یہاں آج سناٹا کیسا ؟ کیا آج خزانہ خالی ہے ؟ زہرہ آج اپنے دستِ حنائی سے ایک جام بھر دو ۔ رما ناتھ بھائی جان ناراض نہ ہونا ۔

رما نے ترش ہو کر کہا ۔ اس وقت رہنے دیجئے داروغہ جی آپ تو پیئے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

داروغہ نے زہرہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا ۔ بس ایک جام زہرہ ۔ اور پھر ایک رات اور آج میری مہمانی قبول کرو ۔

رما نے گرم ہو کر کہا ۔ آپ اس وقت یہاں سے چلے جائیں ۔ میں یہ گوارا نہیں کر سکتا ۔

دونوں آدمیوں میں حجت ہونے لگی ۔ داروغہ کا اصرار تھا کہ زہرہ اس کے ساتھ جائے ۔ رما کہتا تھا اس وقت وہ ہرگز نہیں جا سکتی ۔ اگر وہ گئی تو میں اس کا اور آپ کا دونوں کا خون پی جاؤں گا ۔ آخر داروغہ صاحب نے زہرہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا ۔ رما اب ضبط نہ کر سکا اس نے داروغہ کو دھکا دے کر باہر نکال دیا ۔ اور

دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ دردمند مضبوط آدمی تھا لیکن اس وقت نشہ نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ باہر برآمدہ میں کھڑے ہو کر گالیاں بکنے لگا اور دروازہ پر ٹھوکریں مارنے لگا۔

رما نے زہرہ سے کہا۔ کہو تو جا کر بچہ کو برآمدے کے نیچے ڈھکیل دوں!

زہرہ بکنے دو۔ آپ ہی چلا جائے گا شاید چلا گیا تم نے بہت اچھا کیا کہ سور کو نکال باہر کیا۔ مجھے لیجا کر دق کرتا۔

زہرہ۔ اور جو وہ کل سے مجھے نہ آنے دے۔

رما۔ اگر اس نے ذرا بھی شرارت کی تو گولی مار دوں گا۔ وہ دیکھو طاق پر پستول رکھا ہوا ہے۔ تم اب میری ہو زہرہ! میں نے اپنا سب کچھ تمہارے قدموں پر نثار کر دیا۔ کسی دوسرے آدمی کو ہمارے بیچ میں آنے کا حق نہیں ہے۔ جب تک میں نہ مروں۔

(۴۸)

رما سارا دن بیتاب رہا۔ کبھی مایوسی کی اندھیری گھاٹیاں سامنے آجاتیں کبھی اُمید کی لہراتی ہوئی ہریالی۔ زہرہ جالپا کی تلاش میں گئی بھی ہو گی یہاں سے تو بڑے لمبے چوڑے وعدے کر کے گئی تھی۔ مگر اسے کیا غرض ہے۔ آ کر کہدے گی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ کہیں جا کر ڈپٹی صاحب سے سارا راز فاش کر دے تو بیچاری جالپا پر بیٹھے بٹھائے آفت آجائے۔ مگر زہرہ اتنی سفلہ مزاج نہیں ہے اگر زہرہ جیسی عورت اتنی بے وفا ہو سکتی ہے تو یہ دنیا رہنے کے قابل نہیں۔ رما کو وہ دن یاد آئے جب اس کے دفتر سے آتے ہی جالپا اس کی جیب ٹٹولتی تھی اور وہ روپے نکال لیتی تھی، وہی جالپا آج اتنی پاک نفس ہو گئی۔ تب وہ پیار کرنے کی چیز تھی۔ اب وہ پرستش کی چیز ہے۔

رما کو اپنی اس غلطی پر افسوس ہو رہا تھا جو اس نے جالپا کی بات نہ مان کر کے کی تھی۔ اگر اس نے اس کی مرضی کے مطابق جج کے اجلاس میں اپنا بیان بدل دیا ہوتا دھمکیوں

میں نہ آتا تو اس کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ جالیا کے ساتھ وہ ساری مصیبتیں جھیل لے جاتا۔ اس محبت اور عقیدت کا خود بہن کر وہ مخالفوں کا کامیابی سے مقابلہ کرتا۔ اگر اسے پھانسی بھی ہو جاتی تو وہ ہنستے کھیلتے اس پر چڑھ جاتا۔

مگر پہلے اس سے چاہے جو غلطی ہوئی ہو، اس وقت تو وہ غلطی سے نہیں جالیا کی خاطر سے یہ تکلیف جھیل رہا تھا۔ آخر پولیس والوں کے دل میں اپنا اعتبار پیدا کرنے کے لئے وہ اور کیا کرتا۔ یہ شیطان جالیا کو ستاتے۔ اس کو رسوا کرتے، اس پر جھوٹے مقدمہ چلاتے۔ وہ حالت تو اور بھی ناقابلِ برداشت ہوتی، وہ خود پست ہمت ہے اور ذلت برداشت جالیا شاید جان ہی دے دیتی۔

اسے آج معلوم ہوا کہ وہ جالیا کو ترک نہیں کر سکتا اور زہرہ کو ترک کرنا بھی اس کے لئے محال معلوم ہوتا تھا۔ کیا وہ دونوں کو خوش رکھ سکتا ہے، کیا ان حالات میں جالیا اس کے ساتھ رہنا قبول کرے گی، ہرگز نہیں، وہ شاید کبھی اسے معاف نہ کرے گی۔ جالیا کو اگر یہ بھی معلوم ہو جائے کہ رما اس کی خاطر اذیتیں بھوگ رہا ہے تو بھی وہ اسے الزام سے سبکدوش نہ کرے گی۔

وہ دن بھر اسی ادھیڑ بن میں پڑا رہا۔ نہانے اور کھانے کا وقت ٹل گیا۔ اسے کسی بات کی پرواہ نہ تھی۔ اخبار سے دل بہلانا چاہا، ناول لے کر بیٹھا مگر کسی کام میں دل نہ لگا۔ آج داروغہ جی بھی نہیں آئے۔ یا تو رات کے واقعہ سے ناراض ہو گئے یا نادم۔ رما نے کسی سے اس کے متعلق پوچھا بھی نہیں۔

رات کے دس بج گئے مگر زہرہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پھاٹک بند ہو گیا۔ رما کو اب اس کے آنے کی امید نہ رہی۔ پھر بھی دروازے کی طرف اس کے کان لگے ہوئے تھے۔ کیا جالیا اسے ملی ہی نہیں۔ یا وہ وہاں گئی ہی نہیں۔ اس نے ارادہ کیا کہ اگر کل زہرہ نہ آئی تو کسی کو اس کے گھر بھیجے گا۔

علی الصبح وہ داروغہ کے پاس جا کر بولا۔ پرسوں رات تو آپ اپنے ہوش و حواس میں تھے

داروغہ نے حسد کو چھپاتے ہوئے کہا۔ میں محض آپ کو چھیڑ رہا تھا۔

رما۔ زہرہ رات آئی ہی نہیں۔ ذرا کسی کو بھیجکر پتہ تو لگوایئے، ماجرا کیا ہے؟

داروغہ نے بے اعتنائی سے کہا۔ اسے غرض ہوگی خود آئے گی۔ کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔

رمانے پھر اصرار نہ کیا۔ سمجھ گیا یہ حضرت اس سے جلے ہوئے ہیں، اب اور کس سے پوچھے۔

ایک ہفتہ تک زہرہ سے اس کی ملاقات نہ ہوئی۔ اب اس کے آنے کی کوئی امید نہ تھی۔

رمانے سوچا آخر بے وفا نکلی۔ یا ممکن ہے پولیس والوں نے اسے آنے کی ممانعت کردی ہو۔ کم سے کم مجھے ایک خط تو لکھ سکتی تھی۔ مگر اس کا ضمیر کہتا تھا کہ زہرہ بے وفائی نہیں کرسکتی۔

آٹھواں دن تھا آج ایک بہت اچھا فلم ہونے والا تھا۔ داروغہ نے آکر رما سے کہا۔

تو وہ چلنے کو تیار ہوگیا۔ کپڑے پہن رہا تھا کہ زہرہ آپہنچی۔ رمانے آنکھ اٹھاکر دیکھا پھر اپنے بال سنوارنے لگا۔ مگر اسے دیکھ کر تعجب ہوا کہ زہرہ محض ایک سفید ساڑھی پہنے ہوئے ہے۔ ایک بھی زیور اس کے جسم پر نہ تھا۔ ہونٹ سوکھے ہوئے تھے اور چہرے پر معشوقانہ شوخی کی جگہ متانت جھلک رہی تھی۔

وہ ایک منٹ تک کھڑی رہی۔ تب رما کے پاس جاکر بولی۔ کیا مجھ سے ناراض ہو گئے حضور! اس لئے کہ میں اتنے دنوں آئی کیوں نہیں۔

رمانے روکھے پن سے جواب دیا۔ اگر تم اب بھی نہ آتیں تو میرا کیا اختیار تھا۔

زہرہ نے مسکرا کر کہا۔ یہ اچھی دل لگی ہے۔ آپ ہی نے تو ایک کام سونپا اور جب وہ کام کرکے لوٹی تو آپ بگڑ بیٹھے۔ وہ کام تم نے آسان سمجھا تھا کہ چٹکیوں میں پورا ہوجاتا۔ تم نے مجھے اس عورت کے پاس بھیجا تھا جو اوپر سے موم ہے اور اندر سے پتھر جو اتنی نازک ہوکر بھی اتنی مضبوط ہے۔

رمانے بے توجہی سے پوچھا۔ ہے کہاں کیا کرتی ہے۔

زہرہ۔ اسی دینش کے گھر ہے جسے پھانسی کی سزا ہوگئی ہے۔ اس کے دو بچے ہیں بیوی

ہے اور ماں ہے۔ دن بھر انہیں بچوں کو لئے رہتی ہے۔ بڑھیا کے لئے ندی سے پانی لاتی ہے۔ گھر کا سارا کام کاج کرتی ہے اور جب فرصت پاتی ہے تو ان کے لئے چندہ مانگنے نکل جاتی ہے وہ خاندان بڑی تکلیف میں تھا۔ کوئی مددگار نہ تھا۔ دوست سبھی منہ پھیر بیٹھے تھے کئی فاقے تک ہو چکے تھے جالپا نے جا کر انہیں جِلا لیا۔

رما کی ساری بے دلی کافور ہو گئی۔ جوتے پہننا بھول گیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ تم کھڑی کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔ شروع سے کہو۔ ایک بات بھی مت چھوڑنا تم پہلے اس کے پاس کیسے پہنچیں، کیسے پتہ چلا؟

زہرہ۔ کچھ نہیں پہلے اس دیبی دین کے گھر گئی۔ اس نے وینش کے گھر کا پتہ بتا دیا۔ بس وہاں جا پہنچی۔

رما۔ تم نے اسے جا کر پکارا۔ تمہیں دیکھ کر کچھ جھجکی تو ضرور ہو گی۔

زہرہ مسکرا کر بولی۔ میں اس شکل میں نہ تھی۔ دیبی دین کے گھر سے نکل کر میں اپنے گھر گئی۔ اور بوہم سماج عورت کا سوانگ بھرا۔ نہ جانے مجھ میں ایسی کونسی بات ہے جس سے دوسرے فوراً بھانپ جاتے ہیں کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ اور برا ہموں لیڈروں کو دیکھتی ہوں کوئی ان کی طرف آنکھیں نہیں اٹھاتا۔ میرا لباس وہی ہے میں بھڑکیلے کپڑے اور زیور بالکل نہیں پہنتی، پھر بھی سب لوگ میری طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں میری اصلیت نہیں چھپتی مجھے یہی خوف تھا کہ کہیں جالپا بھانپ نہ جائے۔ نیا سوانگ بھر کر میں وہاں پہنچی تو وہ کیا کوئی بھی نہ پہچان سکتا تھا میں نے وینش کے گھر جا کر اس کی ماں سے بات چیت شروع کی۔ اپنا گھر منگیر بتلایا بچوں کے لئے مٹھائی لیتی گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ جو پارٹ میں کھیلنے گئی تھی وہ میں نے کامیابی کے ساتھ کھیلا دونوں عورتیں رونے لگیں۔ اسی اثنا میں جالپا بھی گنگا جل لئے آپہنچی۔ میں نے وینش کی ماں سے بنگلہ میں پوچھا یہ کون ہے اس نے کہا یہ بھی تمہاری ہی طرح ہم لوگوں کے غم میں شریک ہونے کے لئے آگئی ہے یہاں اس کا شوہر کسی دفتر میں نوکر ہے روز سویرے

آجاتی ہے اور بچوں کو گھمانے لے جاتی ہے ۔ میرے لئے روز ندی سے گنگا جل لاتی ہے ہمارے کوئی آگے پیچھے نہ تھا بچے دانے کو ترستے تھے ۔ جب سے یہ آگئی ہیں ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہے ہم نے نہ جانے کون سی تپسیا کی تھی جس کا یہ بردان ہمیں ملا ہے ۔ اس گھر کے سامنے ہی ایک چھوٹا سا باغ ہے محلے بھر کے بچے وہیں کھیلا کرتے ہیں ۔ شام ہو گئی تھی جالپا دیوی نے دونوں بچوں کو ساتھ لیا اور پارک کی طرف چلیں ۔ میں جو مٹھائی لے گئی تھی اس میں سے بڑھیا نے ایک ایک مٹھائی دونوں بچوں کو دی ۔ دونوں خوش ہو کر ناچنے لگے ۔ بچوں کی اس خوشی پر مجھے رونا آگیا جب پارک میں دونوں بچے کھیلنے لگے تو جالپا سے میری باتیں ہونے لگیں ۔

رمانے کرسی اور قریب کر لی اور آگے کو جھک گیا بولا ۔ کس طرح بات چیت شروع کی ۔

زہرہ ۔ کہہ رہی ہوں میں نے پوچھا ۔ جالپا دیوی گھر کی دونوں عورتوں سے تمہاری تعریف سن کر میں تمہارے اوپر عاشق ہو گئی ہوں ۔

رما ۔ بالکل یہی الفاظ تھے ۔

زہرہ ۔ بالکل یہی ۔ میری طرف تعجب سے دیکھ کر بولیں ۔ تم بنگالن نہیں معلوم ہوتیں اتنی صاف ہندی کوئی بنگالن نہیں بولتی ۔ میں نے کہا ۔ میں مونگیر کی رہنے والی ہوں اور یہاں مسلمان عورتوں سے میری بہت آمد و رفت ہے ۔ آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے آپ کہاں رہتی ہیں ؟ کبھی کبھی دو گھڑی کے لئے چلی آؤں گی ۔ تمہاری محبت میں شاید میں بھی آدمی بن جاؤں ۔

جالپا نے شرما کر کہا ۔ تم تو مجھے بنانے لگیں بہن ۔ کہاں تم کالج کے پڑھنے والی کہاں میں جاہل ، گنوار ، عورت تم سے مل کر میں البتہ آدمی بن جاؤں گی ۔ جب جی چاہے یہیں چلی آنا ۔ یہیں میرا گھر سمجھو ۔

میں نے کہا ۔ تمہارے شوہر بہت شریف معلوم ہوتے ہیں کہ تمہیں آزادی دے رکھی ہے کس دفتر میں ہیں ؟

جالپا نے اپنے ناخنوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ پولیس میں اُمیدوار ہیں ۔

میں نے تعجب سے پوچھا۔ پولیس میں رہتے ہوئے بھی انہوں نے تمہیں یہاں آنے کی آزادی دے دی؟

جالیا اس سوال کے لئے تیار نہ تھی۔ کچھ چونک کر بولی۔ وہ مجھ سے کچھ نہیں کہتے۔ میں نے ان سے یہاں آنے کا کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔ وہ گھر بہت کم آتے ہیں وہیں پولیس والوں کے ساتھ رہتے ہیں۔

میں نے پوچھا۔ تم اپنے شوہر کے ذریعہ سے میری ملاقات اس مخبر سے کرا سکتی ہو جس نے ان بے گناہوں کے خلاف شہادت دی۔

رما ناتھ کی آنکھیں فرطِ اشتیاق سے پھیل گئیں اور چھاتی دھک دھک کرنے لگی۔

زہرہ نے پھر اپنا قصہ کہنا شروع کیا۔ یہ سُن کر جالپا دیوی نے مجھے تیز نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔ اس سے مل کر کیا کرو گی۔

میں نے کہا۔ میں اس بھلے آدمی سے صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم نے اتنے بیگناہوں کو پھنسا کر کیا پایا۔ صرف یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ کیا جواب دیتا ہے۔

جالپا کا چہرہ یکایک سرخ ہو گیا بولیں۔ وہ کہہ سکتا ہے۔ میرا فائدہ اسی میں تھا ساری دنیا اپنے فائدے کے لئے مرتی ہے میں نے بھی اپنا فائدہ اس میں سوچا۔ جب پولیس کے آدمی سے یہ سوال کوئی نہیں کرتا تو اسی غریب سے یہ سوال کیوں کیا جائے۔

میں نے پوچھا۔ اچھا ذرا دیر کے لئے فرض کر لو تمہارا شوہر ہی مخبر ہوتا تو تم کیا کرتیں؟

جالپا نے میری طرف سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ تم مجھ سے یہ سوال کیوں کرتی ہو۔ خود اپنے دل میں اس کا جواب کیوں نہیں ڈھونڈتیں۔

میں نے کہا۔ میں تو ان سے کبھی نہ بولتی۔ نہ کبھی ان کی صورت دیکھتی۔

جالپا نے دور نگے پن سے جواب دیا۔ شاید میں بھی ایسا ہی سمجھتی یا ممکن ہے نہ سمجھتی کچھ کہہ نہیں سکتی۔ آخر پولیس والوں کے گھروں میں بھی تو عورتیں ہیں۔ وہ کیوں اپنے شوہروں

سے کچھ نہیں کہتیں۔ جس طرح ان کے دل اپنے مردوں کے لئے ہو گئے ہیں، ممکن ہے میرا دل بھی ویسا ہی ہو جاتا۔

اتنے میں اندھیرا ہو گیا، جا لیا دیوی نے کہا۔ اب مجھے دیر ہو رہی ہے بہن! بچے ساتھ ہیں، ممکن ہو تو کل پھر ملئے گا آپ کی باتیں نہایت دلچسپ ہوتی ہیں۔

میں چلنے لگی تو انہوں نے چلتے چلتے مجھ سے کہا، ضرور آیئے گا، میں یہیں ملوں گی، آپ کا انتظار کرتی رہوں گی، ہاں میں نے آپ کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔

میں نے اپنا نام بتلا دیا۔

رمانے کہا، یہ تم نے بڑا غضب کیا۔

زہرہ بولی۔ نام بتلانے میں کیا ہرج تھا، پہلے تو وہ چونکیں لگر شاید سمجھ گئیں بنگالی مسلمان ہو گی جب وہ چلنے لگیں تو میں نے کہا۔ آپ سے باتیں کر کے ابھی سیری نہیں ہوئی، اگر کوئی ہرج نہ ہو تو میں بھی تمہارے گھر چلوں، راستہ میں باتیں ہو نگیں، جا لیا راضی ہو گئیں۔ ہم دونوں چلے اس ذرا سے کنگھرے میں نہ جانے وہ کیونکر رہتی ہیں، تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں ہے۔ کہیں مٹکے ہیں کہیں کھاٹ۔ کہیں صندوق، نمی سے دیواریں تر ہو رہی تھیں اور تعفن کے مارے ناک پھٹی جاتی تھی۔ کھانا تیار ہو گیا تھا ونیش کی بیوی برتن دھو رہی تھی، جا لیا دیوی نے اسے اٹھا کر کہا۔ بچوں کو کھلا کر سلا دو، میں برتن دھوئے دیتی ہوں۔ ان کی اس بے نفسی کا میرے دل پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ میں وہیں بیٹھ گئی، اور مانجھتے ہوئے برتنوں کو دھونے لگی۔

جا لیا نے میرے ہاتھوں سے برتن چھین لینا چاہے لیکن جب میں اپنی جگہ سے نہ ہلی تو انہوں نے پانی کا مٹکا الگ ہٹا کر کہا۔ میں پانی نہ دوں گی۔ تم یہاں سے اٹھ جاؤ۔ مجھے بڑی شرم آتی ہے تمہیں میری قسم ہٹ جاؤ۔ تم نے اپنی زندگی میں ایسا کام کاہے کو کیا ہو گا۔

میں نے کہا۔ تم نے کبھی تو نہیں کیا ہو گا۔

جا لیا نے کہا۔ میری اور بات ہے، میں نے پوچھا، کیوں جو بات تمہارے لئے ہے وہی

بات میرے لئے ہے کہ کوئی مہری کیوں نہیں رکھ لیتی۔ جالیپا نے کہا، مہریاں آٹھ آٹھ روپے مانگتی ہیں، میں بولی، میں آٹھ دس روپے مہینہ دے دیا کروں گی۔

جالیپا نے ایسی نگاہوں سے میری طرف دیکھا جس میں سچی محبت کے ساتھ سچی خوشی اور دعائے خیر بھری ہوئی تھی، کتنی پاکیزہ نگاہ ہے اس کی۔ اس بے غرض خدمت کے سامنے مجھے اپنی زندگی کتنی حقیر کتنی قابلِ نفرت معلوم ہو رہی تھی، ان برتنوں کے دھونے میں مجھے جو لطف آیا اُسے بیان نہیں کر سکتی۔ برتن دھونے کے بعد جالیپا دیوی بڑھیا کے پاؤں دبانے بیٹھ گئیں، میں کھڑی یہ پاک نظارہ دیکھ رہی تھی۔

نو بجے ہم دونوں وہاں سے چلے راستے میں جالیپا نے کہا، زہرہ تم سمجھتی ہوگی میں ان لوگوں کی یہ خدمت کر رہی ہوں، یہ بات نہیں ہے، میں دراصل اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہی ہوں، مجھ سے زیادہ بدنصیب عورت دنیا میں نہ ہوگی۔

میں نے انجان بن کر کہا، اس کا مطلب میں نہیں سمجھی۔

جالیپا نے پُرحسرت لہجے میں کہا، کبھی موقعہ آئیگا تو بتا دوں گی۔

میں نے کہا، تم مجھے چکر میں ڈالے دیتی ہو بہن۔ جب تک اس کا مطلب نہ سمجھا دوں گی میں تمہارا گلا نہ چھوڑوں گی۔

جالیپا نے لمبی سانس کھینچ کر کہا، زہرہ! کسی بات کو خود چھپائے رہنا اس سے زیادہ آسان ہے کہ دوسروں پر وہ بوجھ رکھوں۔

کچھ دور تک ہم دونوں خاموش چلتے رہے، یکایک جالیپا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا، زہرہ اگر اس وقت تمہیں معلوم ہو جائے کہ میں کون ہوں تو شاید تم نفرت سے منہ پھیر لوگی اور میرے سائے سے دور بھاگوگی۔

ان الفاظ میں خدا جانے کیا جادو تھا کہ میرے سارے رُوئیں کھڑے ہو گئے، یہ ایک رنج اور شرم سے بھرے ہوئے دل کی نورانی صدا تھی، جس نے میرے سیاہ کارناموں کو واضح کر دیا۔

میرے جی میں ایسا آیا کہ اپنا سارا سوانگ کھول دوں، میں نے بڑے بڑے گرگ باراں دیدہ اور چھپے ہوئے شہدوں اور پولیس افسروں کو بیچ کا عطو بنا لیا ہے مگر جالپا دیوی کے سامنے میرے منہ سے آواز تک نہ نکلتی تھی، معلوم نہیں کس طرح میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ بولی یہ تمہارا خیال غلط ہے دیوی جی، شاید تب میں تمہارے پیروں پر گر پڑوں گی۔ اپنی یا اپنوں کی برائیوں پر شرمندہ ہونا پاک نفسوں ہی کا کام ہے۔

جالپا نے کہا۔ تو کلیجہ مضبوط کر کے سن لو کہ میں اس مخبر کی بدنصیب بیوی ہوں جس نے ان بے گناہوں پر یہ آفت ڈھائی ہے، ہم لوگ الہ آباد کے رہنے والے ہیں ایک ایسا واقعہ ہوا کہ انہیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔

رما نے کہا۔ اس کا تو قصہ ہے کبھی تم سے بتاؤں گا۔

زہرہ بولی۔ یہ سب مجھے دوسرے دن معلوم ہو گیا اب میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں، جالپا نے اپنی کوئی بات شاید ہی مجھ سے چھپائی ہو، کہنے لگی زہرہ میں بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ ایک طرف تو ایک آدمی کی جان اور کئی خاندانوں کی تباہی ہے دوسری طرف اپنی ذلت اور رسوائی ہے، میں چاہوں تو آج ان سبھوں کی جان بچا سکتی ہوں، میں عدالت کو ایسا ثبوت دے سکتی ہوں کہ مخبر کی شہادت کی کوئی وقعت نہ رہ جائے گی، بس اسی دبدھے میں پڑی اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں، نہ تو یہی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کو مرنے دوں اور نہ یہی ہو سکتا ہے کہ رما کو آگ میں جھونک دوں۔ میں خود مر جاؤں گی پر انہیں ایذا نہیں پہنچا سکتی۔ ابھی دیکھ رہی ہوں ہائیکورٹ سے کیا فیصلہ ہوتا ہے نہیں کہہ سکتی اس وقت میں کیا کر بیٹھوں، شاید اسی دن زہر کھا کر سو رہوں۔

دیوی دین کا گھر آ گیا، ہم دونوں رخصت ہوئے جالپا نے مجھ سے بہت اصرار کیا کہ کل اسی وقت پھر آنا، انہیں صرف شام کو باتیں کرنے کی فرصت ملتی ہے، وہ اتنے روپے جمع کر دینا چاہتی ہیں کہ کم سے کم ونیش کے گھر والوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ ایک ہزار سے زیادہ

جمع کر چکی ہیں، میں نے بھی پچیس روپے ان کی نذر کئے، میں نے دو ایک بار کنایتاً کہا کہ آپ اس زحمت میں نہ پڑیں لیکن جب میں نے اس کا اشارہ کیا، انہوں نے ایسا منہ بنایا گویا اب وہ یہ بات سننا بھی نہیں چاہتیں۔

ذرا دم لے کر زہرہ نے پھر کہا، میں نے ایک بات سوچی ہے کہو تو بتاؤں؟

رما نے اس طرح کہا، گویا اس کا دھیان کہیں اور ہے، کیا بات ہے؟

زہرہ۔ انسپکٹر صاحب سے کہہ دوں، وہ جالپا کو الہ آباد پہنچا دیں۔ بس عورتیں اسٹیشن تک اپنی باتوں میں لگائے جائیں، جوں ہی گاڑی چلے انہیں اس میں بٹھا دیں، اس کے سوا اور کوئی تدبیر مجھے نظر نہیں آتی۔

رما نے زہرہ کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر کہا، کیا یہ مناسب ہوگا۔

زہرہ شرمندہ ہو کر بولی۔ اور کیا کیا جائے۔

رما نے جھٹ پٹ جوتے پہن لئے اور زہرہ سے پوچھا۔ اس وقت وہ دیبی دین کے ہی گھر پہ ہونگی۔

زہرہ نے اس کا راستہ روک کر کہا۔ تو کیا اسی وقت جاؤ گے۔

رما۔ ہاں زہرہ! اسی وقت جاؤں گا بس ان سے دو باتیں کر کے وہیں جاؤنگا جہاں مجھے اب سے بہت پہلے جانا چاہیئے تھا۔

زہرہ۔ مگر کچھ سوچ تو لو نتیجہ کیا ہوگا۔

رما۔ خوب سوچ چکا، زیادہ سے زیادہ دروغ بیانی کے جرم میں تین چار سال قید۔ بس اب رخصت! بھول مت جانا زہرہ شاید پھر کبھی ملاقات ہو۔

رما برآمدے سے اتر کر صحن میں آیا اور ایک لمحہ میں پھاٹک کے باہر تھا، زہرہ بے حس و حرکت کھڑی اسے حسرت بھری آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، رما پر اس کا دل کبھی اتنا فریفتہ نہ ہوا تھا جیسے کوئی ناگن اپنے محبوب کو میدانِ کارزار کی طرف جاتے دیکھ کر غرور سے پھولی

نہ سماتی ہو۔

چوکیدار نے لپک کر داروغہ سے یہ خبر کہی۔ بیچارے کھانا کھا کر لیٹے ہی تھے گھبرا کر نکلے اور رما کے پیچھے دوڑے۔ بابو صاحب ذرا سنیئے تو۔ ایک منٹ رک جایئے۔ اس سے کیا فائدہ کچھ معلوم تو ہو۔ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ آخر بیچارے ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔ رما نے لوٹ کر انہیں اٹھایا اور پوچھا۔ کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔

داروغہ۔ نہیں ذرا ٹھوکر کھا گیا تھا۔ آخر آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں سوچیئے اس اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

رما نے داروغہ کو جھکمہ دیتے ہوئے کہا۔ جالپا کو شاید مخالفوں نے پٹی پڑھائی ہے کہ تو ہائی کورٹ میں ایک درخواست دے دے ذرا اسے جا کر سمجھاؤں گا۔

داروغہ نے پوچھا۔ یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔

زہرہ کہیں سے سُن آئی ہے۔

تمہاری بیوی ہو کر تمہارے ساتھ اتنی دغا۔ ایسی عورت کا سر کاٹ لینا چاہیئے۔

اسی لئے تو جا رہا ہوں۔ یا تو اسی وقت اسے اسٹیشن پر بھیجکر آؤں گا یا اس سے بُری طرح پیش آؤں گا کہ وہ بھی یاد کرے گی۔

میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔

جی نہیں۔ بالکل معاملہ بگڑ جائے گا۔

داروغہ لاجواب ہو گیا۔ ایک منٹ تک کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر لوٹ پڑا۔ اُدھر رما نے ایک تانگہ لیا اور دیبی دین کے گھر جا پہنچا۔

تھوڑی دیر قبل جالپا دنیش کے گھر سے پہنچی تھی کہ اتنے میں رما نے نیچے سے آواز دی۔

دیبی دین نے کہا۔ بھیّا ہیں شاید۔

جالپا۔ کہہ دو یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔ وہیں جائیں۔

دیبی۔ نہیں نہیں۔ ذرا پوچھ تو لوں کیا کہتے ہیں اتنی رات گئے انہیں چھٹی کیسے ملی۔
جالیپا۔ مجھے سمجھانے آئے ہوں گے۔ اور کیا۔ لیکن منہ دھولیں۔
دیبی دین نے دروازہ کھول دیا۔ رمانے اندر آکر کہا۔ دادا تم مجھے یہاں دیکھ کر تعجب کر رہے ہوگے۔ ایک گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا ہوں تم لوگوں سے اپنے بہت سے گناہوں کو معاف کرانا تھا۔ جالیپا اُوپر ہیں۔
دیبی دین۔ ہاں ہیں تو۔ ابھی آئی ہیں بیٹھو کچھ کھانے کو لاؤں۔
رما۔ نہیں میں کھانا کھا چکا ہوں۔ بس جالیپا سے دو دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔
دیبی۔ جب وہ تم سے بولیں بھی۔
رما۔ کیا میری صورت سے اتنی نفرت ہے ذرا پوچھو تو۔
دیبی۔ اس میں پوچھنا کیا ہے۔ دونوں بیٹھی تو ہیں جاؤ تمہارا گھر جیسے تب ویسے اب ہے۔
رما۔ نہیں دادا۔ ان سے پوچھ لو۔ میں یوں نہ جاؤں گا۔
دیبی دین نے اوپر جا کر کہا۔ تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں بہو۔
جالیپا نے منہ لٹکا کر کہا۔ تو کہتے کیوں نہیں۔ کیا میں نے ان کی زبان بند کر دی ہے۔
جالیپا نے یہ الفاظ اتنے زور سے کہے کہ نیچے رمانے بھی سُن لئے۔ کتنے دل آزار الفاظ تھے۔ رما کا سارا شوق ملاقات غائب ہوگیا۔ نیچے ہی کھڑے کھڑے بولا۔ وہ اگر مجھ سے نہیں بولنا چاہتی تو کوئی زبردستی نہیں ہے۔ میں اس وقت جج صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔ ان سے سارا قصہ کہوں گا۔ میری عقل پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ جان کی محبت اور تکلیفوں کے خوف نے میری عقل میں فتور ڈال دیا تھا جیسے کوئی نحوست سر پر سوار تھی۔ تم لوگوں کی دعاؤں نے وہ نحوست دور کر دی شاید دو چار سال کے لئے سرکاری مہمانی قبول کرنی پڑے۔ جیتا رہا تو پھر ملاقات ہوگی۔ نہیں تو میری بُرائیوں کو معاف کرنا اور بھول جانا۔ تم بھی دادا اور اماں تم بھی میرے قصوروں کو معاف کرنا۔ تم لوگوں نے میرے ساتھ جو احسانات کئے ہیں اگر جیتا لوٹا تو شاید تم لوگوں کی کوئی خدمت

کر سکوں، میری تو زندگی خراب ہو گئی۔ نہ دین کا ہوا نہ دنیا کا۔ جالیا دیوی سے کہہ دینا کہ میں نے ہی ان کے زیور چرائے تھے صراف کو دینے کے لئے روپوں کی ضرورت تھی اس لئے مجھ کو یہ فعل کرنا پڑا۔ بس یہی کہنے آیا تھا۔

رما برآمدے کے نیچے اتر پڑا۔ اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔ جالیا بھی نیچے اتری لیکن رما کا کہیں پتہ نہ تھا۔ برآمدے کے نیچے اتر کر دیبی دین سے پوچھا۔ کدھر گئے ہیں دادا!

دیبی دین نے کہا۔ میں نے کچھ نہیں دیکھا ہے بہو! میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ وہ اب نہ ملیں گے دور سے گئے ہیں۔

جالیا کئی منٹ تک سڑک پر بے خودی کی سی حالت میں کھڑی رہی۔ انہیں کیسے روک لے۔ اس وقت وہ کتنے مایوس ہیں۔ وہ پچھتا رہی تھی کہ انہیں ذرا دیر کے لئے اوپر کیوں نہ بلا لیا آئندہ کا حال کون جانتا ہے نہ جانے کب ملاقات ہو یا نہ ہو۔ شادی ہونے کے اس دو ڈھائی سال کے اندر کبھی اس کا دل محبت سے اتنا بے تاب نہ ہوا تھا۔ نمود اور آسائش کے جنون میں اس نے خانہ محبت کی دیواروں کو دیکھا تھا وہ اسی میں خوش تھی۔ رفیق حیات بن کر اس نے خانۂ محبت کے اندر قدم رکھا تھا۔ کتنا دلفریب نظارہ تھا۔ کتنی دل آویز نکہت جہاں کی ہوا میں، روشنی میں اور فضا میں تقدس کی جھلک تھی۔ محبت اپنی معراج پر پہنچکر پرستش بن جاتی ہے۔

اتنے میں زہرہ آ گئی۔ جالیا کو سڑک پر دیکھ کر بولی۔ یہاں کیسے کھڑی ہو جالیا آج تو میں نہ آ سکی۔ چلو آج مجھے تم سے بہت کچھ باتیں کرنی ہیں۔

(۴۹)

داروغہ کو بھلا کہاں چین۔ رما کے جانے کے بعد ایک گھنٹہ تک اس کا انتظار کرتے رہے پھر گھوڑے پر سوار ہوئے اور دیبی دین کے گھر جا پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کہ رما کو یہاں سے

گئے ہوئے آدھ گھنٹے سے اُوپر ہوگیا۔ انہیں اعتبار نہ آیا پہلے نیچے کی کوٹھری دیکھی، پھر اوپر چڑھ گئے سمجھا رما وہاں چھپا بیٹھا ہو گا۔ وہاں تین عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں زہرہ کو شرارت سوجھی تو اس نے لمبا سا گھونگھٹ نکال لیا اور اپنے ہاتھ ساڑھی میں چھپا لئے۔ داروغہ کو شک ہوا شاید رما بھیس بدلے ہوئے بیٹھا ہوا ہے۔ دیبی دین سے پوچھا۔ یہ تیسری عورت کون ہے ؟

دیبی دین نے کہا۔ میں نہیں جانتا کبھی کبھی بہو سے ملنے آجاتی ہیں۔

داروغہ۔ مجھ سے اڑاتے ہو بچہ۔ ساڑھی پہنا کر ملزم کو چھپانا چاہتے ہو۔ جا لپا دیوی سے کہہ دو نیچے چلی جائیں۔ اس گھونگھٹ والی عورت کو یہیں رہنے دو!

جالپا چلی گئی تو داروغہ جی نے زہرہ کے پاس جا کر کہا۔ کیوں حضرت مجھ سے یہ چالیں، وہاں سے کیا کہہ کر آئے تھے اور یہاں مزے میں سی آ گئے۔ اب یہ بھیس اُتار دیجئے اور میرے ساتھ چلئے دیر ہو رہی ہے۔

یہ کہہ کر انہوں نے زہرہ کا گھونگھٹ اٹھا دیا۔ زہرہ نے قہقہہ مارا۔ داروغہ جی گویا پھسل کر حیرت کے گڑھے میں گر پڑے۔ ارے زہرہ تم یہاں کہاں ؟

زہرہ نے کہا۔ اپنی ڈیوٹی بجا رہی ہوں۔

اور رما ناتھ کہاں گئے تمہیں تو معلوم ہی ہو گا۔

وہ تو میرے یہاں آنے کے پہلے ہی چلے گئے تھے۔

اچھا ذرا میرے ساتھ آؤ اس کا پتہ لگانا ہے۔

کیا ابھی تک بنگلے پر نہیں پہنچے۔

نہ۔ نہ جانے کہاں رہ گئے۔

زہرہ داروغہ جی کے ساتھ چلی تو انہوں نے راستے میں پوچھا۔ جالپا کب تک یہاں سے جائے گی۔

زہرہ۔ میں نے خوب پٹی پڑھائی ہے۔ اب اس کے یہاں سے جانے کی ضرورت

نہیں ، رنانا تھ نے بری طرح ڈانٹا ہے ۔

تمہیں یقین ہے اب یہ کوئی شرارت نہ کرے گی ۔

ہاں میرا تو یہی خیال ہے ۔

تو پھر یہ حضرت کہاں چلے گئے ؟

کہہ نہیں سکتی پیئے ہوئے تھے ۔

تو کہیں گر گرا پڑا ہوگا ، اس نے بہت دق کیا ہے ، میں ذرا ڈپٹی صاحب کے پاس جاتا ہوں ۔ آؤ تمہیں تمہارے گھر تک پہنچا دوں !

بڑی عنایت ہوگی ۔

ذرا دیر میں زہرہ کا مکان آگیا ، وہ اتر کر زینے کی طرف چلی ، مگر اتنی دیر میں داروغہ جی بھی مزے میں آگئے بولے ! اب تو جانے کو جی نہیں چاہتا ، زہرہ چلو کچھ غپ شپ ہو میں بھی آتا ہوں ۔

زہرہ نے زینے کے اوپر قدم رکھ کر کہا ، جاکر پہلے ڈپٹی صاحب کو اطلاع دیجئے یہ غپ شپ کا موقع نہیں ہے ۔

داروغہ نے موٹر سے اتر کر کہا ۔ نہیں اب نہ جاؤں گا مز ہرہ ! صبح دیکھی جائے گی ۔

زہرہ نے اوپر چڑھ کر دروازہ بند کر لیا اور اوپر جاکر کھڑکی سے سر نکال کر بولی ۔

آداب عرض !

(۵۰)

داروغہ جی مجبور ہو کر گھر جاکر لیٹ رہے ، نیند کھلی تو آٹھ بج رہے تھے ، اٹھ کر بیٹھے ہی تھے کہ ٹیلیفون پر پکار ہوئی ۔ ڈپٹی صاحب پوچھ رہے تھے ، رنانا تھ رات کو بنگلے پر تھا یا نہیں ۔

داروغہ کے ہوش اڑ گئے بولے نہیں، مجھ سے بہانہ کرکے اپنی بیوی کے پاس چلا گیا تھا۔

ڈپٹی صاحب نے غصے کے ساتھ کہا۔ تم نے اسے کیوں جانے دیا۔ تم سے اس کا جواب طلب ہوگا۔ اس نے جج سے سب حال کہہ دیا ہے۔ مقدمہ کی جانچ پھر سے ہوگی آپ سے بڑا بھاری بلینڈر ہوا ہے۔ سارا محنت پانی میں گر گیا۔

داروغہ۔ تو کیا وہ رات کو جج صاحب کے پاس چلا گیا۔

ڈپٹی، ہاں وہیں گیا تھا۔ جج صاحب پھر سے مقدمہ کی پیشی کریں گے۔ یہ سب آپ کا بنگلنگ ہے۔ زہرہ بھی دغا دیا۔ اب رماناتھ کا سب سامان کمشنر صاحب کے پاس بھیج دو۔ وہ کسی دوسری جگہ ٹھہرایا جائے گا۔

داروغہ جی اسی وقت رماناتھ کا سب سامان لے کر پولیس کمشنر کے بنگلے کی طرف چلے۔ رما پر ایسا غصہ آرہا تھا کہ پائیں تو کچا نگل جائیں۔ کم بخت کی کتنی خوشامدیں کیں۔ کتنی نازبرداری کی مگر دغا ہی دے گیا۔ اس میں زہرہ کی بھی سازش ہے۔ آج ہی بیگم صاحب کی بھی خبر لیتا ہوں۔ جیپ دیبی دین سے بھی سمجھوں گا۔

ایک ہفتہ تک پولیس کے حکام میں جو چل چل رہی اس کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ رات اور دن ——— اسی فکر میں چکر کھاتے رہتے۔ مقدمہ سے کہیں زیادہ اپنی فکر تھی۔ سب سے زیادہ تشویش داروغہ صاحب کو تھی۔ انہیں اپنے بچنے کی امید نظر نہیں آتی۔ ڈپٹی اور انسپکٹر دونوں نے ساری بلا اس کے سر ڈال دی تھی اور خود بالکل الگ ہو گئے تھے

سارے شہر میں یہ خبر پھیل گئی۔ اس مقدمہ کی دوبارہ پیشی ہوگی۔ انگریزی انصاف کی تاریخ میں یہ عدیم المثال واقعہ تھا۔ وکیلوں میں اس پر قانونی مباحثے ہونے۔ جج صاحب کو اس کا مجاز ہے بھی یا نہیں۔ لیکن جج اپنے ارادے پر مستقل تھا۔ پولیس والوں نے بڑے بڑے زور لگائے۔ پولیس کمشنر نے یہاں تک کہا کہ اس سے سارا محکمہ بدنام ہو جائے گا۔ لیکن جج نے کسی کی نہ سنی۔ جھوٹی شہادتوں پر پندرہ آدمیوں کی زندگی برباد کرنے کی ذمہ داری لینے

اسے روحانی تکلیف ہوتی تھی۔ اس نے ہائی کورٹ اور گورنمنٹ دونوں ہی کو اس کی اطلاع دے دی تھی۔

ادھر پولیس والے رما کی تلاش میں رات دن سرگرداں رہتے تھے۔ لیکن رما نہ جانے کہاں روپوش ہو گیا تھا۔

ہفتوں حکام میں خط و کتابت ہوتی رہی۔ منوں کاغذ سیاہ ہو گئے۔ اخباروں میں بھی اس معاملہ پر قیاس آرائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ایک اخبار کے اڈیٹر نے جالپا سے ملاقات کی اور اس کا بیان شائع کرا دیا۔ دوسرے اخبار نے زہرہ کا بیان چھاپ دیا۔ ان دونوں بیانات نے پولیس کی بخیہ ادھیڑی۔ زہرہ نے صاف کہہ دیا کہ مجھے صرف اس لئے پچاس روپے روز دیئے جاتے تھے کہ رما ناتھ کو بہلاتی رہوں اور اسے کچھ سوچنے یا کرنے کا موقعہ نہ ملے۔ پولیس والوں نے یہ بیان پڑھا تو دانت پیس لئے۔

آخر دو مہینے کے بعد فیصلہ ہوا۔ اس مقدمہ کی سماعت کے لئے ایک سولین تعینات کیا گیا۔ پھر پیشیاں ہونے لگیں۔ پولیس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ ملزموں میں کوئی مخبر بن جائے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ داروغہ صاحب چاہتے تو نئی شہادتیں بنا سکتے تھے۔ لیکن افسران کی خود غرضی سے وہ اتنے کبیدہ خاطر ہوئے کہ دور سے تماشہ دیکھنے کے سوا اور کچھ نہ کیا۔ جب ساری نیک نامی افسروں کو ملتی ہے اور ساری بدنامی ماتحتوں کو تو کوئی کیوں شہادتیں بنائے۔

آخر پولیس کو مجبور ہو کر مقدمہ اٹھا لینا پڑا۔ طویلے کی بلا بندر کے سر گئی داروغہ تنزل ہو گئے۔ اور نائب داروغہ کا نزائی میں تبادلہ کر دیا گیا۔

جس دن ملزموں کو بری کیا گیا۔ آدھا شہر ان کا خیر مقدم کرنے کو جمع تھا۔ پولیس نے انہیں دس بجے رات کو چھوڑا۔ لیکن خلقت جمع ہو گئی۔ لوگ جالپا کو بھی کھینچ لے گئے۔ اس پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی اور اس کی تعریف کے نعروں سے آسمان گونج رہا تھا۔

مگر رماناتھ کی مصیبتوں کا ابھی خاتمہ نہ ہوا تھا۔ اس پر دروغ بیانی کا مقدمہ چلانے کا فیصلہ ہو گیا۔

(۵۱)

اسی بنگلے میں ٹھیک دس بجے مقدمہ پیش ہوا۔ ساون کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ کلکتہ دلدل ہو رہا تھا لیکن تماشائیوں کا ہجوم میدان میں کھڑا تھا۔ عورتوں میں ونیش کی بیوی اور ماں بھی آئی تھیں۔ پیشی سے دس منٹ پہلے جالپا اور زہرہ بھی بند گاڑیوں میں آ پہنچیں۔

پولیس کی شہادتیں شروع ہوئیں۔ پر اُن میں قابلِ ذکر کوئی بات نہ تھی۔ محض ضابطہ کی پابندی تھی۔ اس کے بعد رماناتھ کا بیان ہوا۔ پر اس میں کوئی نئی بات نہ تھی اس نے اپنی زندگی کے پورے ایک سال کی سرگذشت کہہ سنائی۔ وکیل کے پوچھنے پر اس نے کہا جالپا کی بے نفسی، حق پسندی اور استقلال نے میری آنکھیں کھولیں۔ اور اس سے بھی زیادہ زہرہ کی دلجوئی اور خلوص نے۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس طرف سے روشنی ملی۔ جدھر اوروں کو تاریکی ہی ملتی ہے۔

اس کے بعد صفائی کی طرف سے دیبی جالپا اور زہرہ کے بیان ہوئے۔ زہرہ کا بیان بہت ہی پُر اثر تھا۔ اس نے کہا۔ میں نے دیکھا کہ جس آدمی کو نشانہ ستم بنانے کی خدمت مجھے سونپی گئی ہے وہ خود درد سے تڑپ رہا ہے اسے مرہم کی ضرورت ہے زخموں کی نہیں، جالپا دیوی نے اسے جتنی عقیدت تھی اسے دیکھ کر مجھے اپنی خود غرضی اور بے غیرتی پر شرم آئی۔ میری زندگی کتنی حقیر کتنی گری ہوئی اور کتنی شرمناک ہے، یہ مجھ پر اس وقت کھلا جب میں جالپا سے ملی۔ اس کی بے غرض خدمت اس کے مردانہ عزم اور اس کی پاک غریب دوستی نے میری زندگی کی رفتار پلٹ دی۔ میں نے فیصلہ کیا اس آغوش میں میں بھی پناہ لوں گی۔

مگر اس سے بھی معرکہ کا بیان جالپا کا تھا۔ وہ بیان سُن کر حاضرین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے۔ میرے شوہر بے گناہ ہیں ایشور کی نگاہوں

۔۔ما ہی نہیں ، قانون کی نگاہوں میں بھی ۔ ان کی تقدیر میں میری نمائش پسندی کا تاوان دینا لکھا تھا وہ انہوں نے دیا ۔ اصلی خطاوار میں ہوں جس کے باعث انہیں یہ عذاب جھیلنے پڑے ۔ میں مانتی ہوں کہ میں نے انہیں اپنا بیان بدلنے کے لئے مجبور کیا ۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ وہ سچ مچ ڈاکوؤں میں شریک ہوئے اور ان کی شہادت واقعات پر مبنی ہے تو میں انہیں تبدیل بیان کے لئے ہرگز آمادہ نہ کرتی ۔ جن تاریخوں میں میرے شوہر کا ڈاکوؤں میں شریک ہونا بتلایا جاتا ہے ان تاریخوں میں وہ الہ آباد میں تھے عدالت سہل ہے تو وہاں کے میونسپل بورڈ کے دفتر سے اس کی تصدیق کر سکتی ہے ۔

عدالت نے سرکاری وکیل سے پوچھا کیا الہ آباد سے اس معاملے میں کوئی رپورٹ مانگی گئی تھی ؟

سرکاری وکیل نے کہا ۔ جی ہاں ! مگر ہمیں اس معاملہ سے کوئی بحث نہیں ہے ۔

صفائی کے وکیل نے کہا ۔ اس سے یہ ثابت ہو ہی جاتا ہے کہ ملزم ڈاکے میں شریک نہ تھا ۔ اب صرف یہ امر رہ جاتا ہے کہ وہ مخبر کیوں بنا ؟

سرکاری وکیل نے کہا ۔ خود غرضی کے سوا اور کیا سبب ہو سکتا ہے ؟

صفائی کے وکیل نے کہا ۔ میرا دعویٰ ہے کہ اسے دھوکا دیا گیا اور جب اسے معلوم ہو گیا کہ اسے پولیس سے خائف ہونے کا کوئی سبب نہیں ہے تو اسے دھمکیوں سے مجبور کیا گیا ۔

اس کے بعد سرکاری وکیل نے بحث شروع کی ۔ جناب والا ۔ آج آپ کے ہاں ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا ہے جیسا خوش قسمتی سے بہت کم ہوا کرتا ہے ۔ آپ کو جنک پور کی ڈکیتی کا حال معلوم ہے جنک پور کے قریب و جوار میں متواتر کئی ڈاکے پڑے اور پولیس کے عملے مہینوں اپنی جان ہتھیلی پر لئے ڈکیتوں کی تلاش میں سرگرم رہے اور آخر ان کی کوشش بار آور ہوئی اور ڈاکوؤں کا سراغ ملا ۔ یہ لوگ گھر کے اندر بیٹھے ہوئے پائے گئے ۔ پولس نے یکبارگی

سب کو گرفتار کر لیا۔ لیکن آپ جانتے ہیں ایسے معاملوں میں پولیس کے لئے عدالتی ثبوت کتنا مشکل ہے، عوام جان کے خوف سے شہادت دینے کو تیار نہیں ہوتے، یہاں تک کہ جن گھروں میں ڈاکے پڑے تھے وہ شہادت دینے کے موقعہ آیا تو صاف نکل گئے۔ پولیس اسی الجھن میں پڑی ہوئی تھی کہ ایک نوجوان آتا ہے اور ان ڈاکوؤں کا سرغنہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، وہ ان وارداتوں کا اتنا مسودہ اور مفصل ذکر کرتا ہے کہ پولیس کو اس پر یقین آجاتا ہے، وہ اس موقعہ پر اس آدمی کو پاکر غیبی امداد سمجھتی ہے، یہ آدمی الہ آباد سے کسی معاملہ میں ماخوذ ہوکر بھاگ آیا تھا اور یہاں بھی کون مرتا تھا، اس میں اور کوئی صفت ہو یا نہ ہو موقع تناشی کی صفت ضرور ہے، اس موقعہ سے اس نے اپنے مستقبل کی تعمیر کرنے کا فیصلہ کر لیا، مخبر بن کر اسے سزا کا تو کوئی خوف نہ تھا ہی نہیں، اس کے برعکس فائدے بے شمار تھے، پولیس اس کی خوب آؤ بھگت کرتی ہے۔ اور اسے اپنا مخبر بنا لیتی ہے، بہت ممکن تھا کہ ان وارداتوں کی کوئی شہادت نہ پاکر پولیس ڈکیتی کے ملزموں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاتی، لیکن یہ غیبی امداد پاکر اس نے مقدمہ چلانے کا ارادہ کیا۔

لیکن ایسا ہوتا ہے کہ ان اثنا میں اسے تقدیر سازی کے دوسرے موقع ہاتھ آگئے ممکن ہے معنویانہ جماعتوں سے اسے ترغیبیں دی گئی ہوں، ترغیبوں نے اسے مطلب براری کا نیا راستہ دکھا دیا، جہاں دولت کے ساتھ نیک نامی بھی تھی واہ واہی بھی تھی، اور قوم پروری کی شہرت بھی، یہ شخص اپنی غرض کے لئے سب کچھ کر سکتا ہے یہی اس کی زندگی کا مقصد اولی ہے، ہم خوش ہیں کہ بالآخر اس کی حق پسندی اس پر غالب آئی، چاہے اس کے اسباب کچھ بھی ہوں، بے گناہوں کو سزا دلانا پولیس کے لئے اتنا ہی قابل اعتراض ہے جتنا گناہگار کو چھوڑ دینا، وہ اپنی کارگذاری دکھلانے کے لئے ہی ایسے مقدمہ نہیں چلاتی۔ اس جوان کی ابلہ فریبیوں سے پولیس کی جو بدنامی ہوئی، اور جو سرکار کے روپے خرچ ہوئے اس کی اسے معقول سزا ملنی چاہیئے۔ ایسے دروغ بافوں کو آزاد رہ کر سوسائٹی کے ٹھگنے کا موقعہ

دینا صریح بے انصافی ہوگی۔ اس کے لئے سب سے موزوں مقام وہ ہے جہاں اسے کچھ دن تہذیب نفس کا موقعہ ملے۔ شاید اس خلوت میں اس کا ضمیر بیدار ہو۔ آپ کو محض یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے پولیس کو دغا دی یا نہیں۔ اس تنقیح کے صحیح تسلیم کرنے میں اب شک کی گنجائش نہیں، اگر پولیس نے اسے دھمکیاں دی تھیں تو وہ پہلے ہی عدالت میں اپنا بیان واپس لے سکتا تھا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ دھمکیوں کا الزام بالکل غلط ہے۔ اس نے جو کچھ کیا اپنی رضا و رغبت سے کیا۔ ایسے آدمی کو اگر سزا نہ دی گئی تو اس کی شعبدہ بازیوں کا سلسلہ قائم رہے گا۔

اس کے بعد صفائی کے وکیل نے جواب دیا۔ یہ مقدمہ انگریزی تاریخ ہی میں نہیں شاید دنیا کی تاریخ انصاف میں اپنی نوعیت کا بے مثال مقدمہ ہے۔ رما ناتھ ایک معمولی طبقہ کا آدمی ہے اس نے تعلیم بھی بہت ہی معمولی درجہ کی پائی ہے وہ اونچے خیالات کا آدمی نہیں ہے الہ آباد کی میونسپلٹی میں وہ کئی سال ملازم رہ چکا ہے وہاں سے اس کا کام چنگی کے روپے وصول کرنا تھا۔ عام دستور کے مطابق وہ تاجروں سے رشوت بھی لیتا ہے اور اپنی آمدنی کی پرواہ نہ کرکے اناپ شناپ خرچ کرتا ہے۔ آخر ایک دن میزان میں غلطی ہو جانے کے باعث اسے شک ہوتا ہے کہ کچھ سرکاری رقم اس کے تصرف میں آگئی ہے وہ اتنا بدحواس ہو جاتا ہے کہ کسی سے اس کا ذکر نہیں کرتا۔ خفیہ طور پر گھر سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ وہاں دفتر میں اس پر شبہ ہوتا ہے اور اس کے کاغذات کی جانچ ہوتی ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کوئی بے جا تصرف نہیں کیا۔ صرف میزان کی غلطی تھی۔

اس کے بعد اس نے رما کے پولیس کے پنجے میں پھنسنے، فرضی مخبر بننے اور شہادت دینے کا ذکر کرکے سلسلۂ بحث جاری کیا۔

اب رما ناتھ کی زندگی میں ایک نیا تغیر جو کہ ایک شوقین مزاج اور ملازمت کے دلدادہ نوجوان کو فرض اور حق کے راستے پر لگا دیتا ہے۔ اس کی زوجہ جالپا اس کی تلاش میں الہ آباد

سے یہاں آتی ہے اور جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ رما ایک مقدمہ میں پولیس کا مخبر ہو گیا ہے تو وہ اس سے خفیہ طور پر ملنے آتی ہے، رما پولیس کا مہمان ہے اپنے بنگلے میں آرام سے پڑا ہوا ہے پھاٹک پر سنتری پہرہ دے رہا ہے۔ جالپا کو شوہر سے ملنے سے ناکامی ہوتی ہے، تب وہ ایک خط لکھ کر اس کے سامنے پھینک دیتی ہے اور دیبی دین کے ساتھ چلی جاتی ہے، رما یہ خط پڑھتا ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ جاتا ہے وہ چھپ کر جالپا کے پاس آتا ہے جالپا اس سے ساری داستان کہہ سناتی ہے اور اسے اپنا بیان واپس لینے پر مجبور کرتی ہے، رما پہلے تو ڈرتا ہے مگر راضی ہو جاتا ہے اور بنگلہ پر جا کر پولیس افسروں پر اپنا ارادہ ظاہر کرتا ہے حکام کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ رما پر غبن کا کوئی الزام نہیں ہے۔ تو وہ جالپا کو گرفتار کرنے کی دھمکی دے کر اسے اپنے ارادے سے باز رکھتے ہیں۔ رمانا تھ کی ہمت پست ہو جاتی ہے وہ جانتا ہے پولیس کے اختیارات وسیع ہیں مجبور ہو کر وہ جج کے اجلاس میں اپنے پہلے بیان کی تائید کرتا ہے۔ آخر ملزموں کو سزا ہو جاتی ہے، رمانا تھ کی اور خاطر داریاں ہونے لگتی ہیں۔

اس کے بعد جو واقعات ہوئے، ان کا مختصر ذکر کرنے کے بعد وکیل صاحب نے فرمایا، میں یہ نہیں کہتا کہ اس نے جھوٹی شہادت نہیں دی۔ لیکن ان حالات اور ان ترغیبوں پر نگاہ ڈالئے تو اس جرم کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے، اس جھوٹی شہادت کا نتیجہ اگر یہ ہوتا کہ کسی بے قصور کو سزا مل جاتی تو دوسری بات تھی، یہاں تو بیندرہ نوجوانوں کی قیمتی جان بچ گئی، ملزم نے خود اپنی جھوٹی شہادت کا اقبال کیا ہے، کیا اس دلیرانہ حق پسندی کا یہی انعام اسے ملنا چاہیئے۔ جالپا دیوی کی اصول پروری کیا اسی برتاؤ کی مستحق ہے۔ جالپا ہی اس ڈرامہ کی ملکہ ہے، اس کی حق پسندی، اس کی فرض پروری۔ اس کی عصمت اور وفا اس کی بے نفسی غرض کن کن اوصاف کی تعریف کی جائے، اسے معلوم تھا کہ پولیس کی حمایت سے اس کا دنیاوی مستقبل کتنا روشن ہو جائے گا۔ ایک حسینہ کے دل میں جو آرزوئیں ہو سکتی ہیں جالپا کا دل اس سے خالی نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ حمایت حق کے جوش میں ان ساری

تمناؤں کو خیرباد کہتی ہے۔ ایک معمولی عورت ہیں جس نے اونچے درجے کی تعلیم نہیں پائی۔ کیا اتنا ایثار اور اتنی روشن طبعی کسی غیبی امداد کا ثبوت نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں ایسے مقدمات روز نہیں پیش ہوتے۔ شاید آپ لوگوں کو اپنی زندگی میں پھر ایسے مقدمہ کی سماعت کا موقعہ نہ ملے۔ یہاں آپ ایک مقدمہ کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں مگر اس اجلاس کے باہر ایک بہت بڑی عدالت ہے جہاں آپ کے فیصلہ کی جانچ ہوگی۔ آپ کا وہی فیصلہ واجب سمجھا جائے گا جسے یہ باہر کی عدالت بھی واجب تسلیم کرے۔ وہ عدالت کی موشگافیوں میں نہیں پڑتی۔ جن میں الجھ کر ہم اکثر گمراہ ہو جایا کرتے ہیں۔ اکثر پانی کا دودھ اور دودھ کا پانی کر بیٹھتے ہیں۔ اگر آپ جھوٹ سے نائب ہو کر حق کی پیروی کرنے کے لئے کسی کو مجرم ٹھہراتے ہیں تو آپ دنیا کے سامنے عدل کا کوئی اونچا معیار نہیں رکھتے۔

سرکاری وکیل نے اس دلیل کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ فرض اور ایثار اپنی جگہ پر بہت ہی قابل قدر ہیں۔ لیکن جب آدمی نے عمداً جھوٹی شہادت دی۔ اس نے قانون کی نگاہ میں اور اخلاق کی نگاہ میں جرم کیا ہے۔ اور سزا کا مستوجب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے الہ آباد میں بے جا تصرف نہیں کیا اسے وہم تھا۔ لیکن ایسی حالت میں ایک سچے آدمی کا یہ فرض تھا کہ وہ گرفتار ہو جانے پر اپنی صفائی پیش کرتا۔ نہ یہ کہ اپنے کمینے اغراض کے لئے جھوٹ کا جال پھیلاتا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا یہ فعل ناواجب ہے تو آپ اسے ضرور سزا دیں۔

فریقین کے وکیلوں کی بحث ختم ہو جانے کے بعد جج نے اسیسروں سے مشورہ کیا اور یہ تجویز سنائی۔ مقدمہ صرف یہ ہے کہ ایک نوجوان نے اپنے کو ایک الزام سے بری کرنے کے لئے پولیس کی پناہ لی۔ اور جب اسے معلوم ہو گیا کہ جس بنا پر وہ پولیس کی حمایت میں جاتا ہے اس کی کوئی ہستی نہیں تو وہ اپنا بیان واپس لے لیتا ہے۔ رمانا تھ اگر حق پرور ہوتا تو وہ پولیس کی حمایت میں جاتا ہی کیوں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ پولیس نے ایسی جھوٹی شہادت

دینے کی ترغیب دی ۔ میں یہ نہیں مان سکتا کہ شہادت کی تحریک رمانا تھ کی جانب سے ہوئی ۔ اسے ترغیب دی گئی ۔ اور سزا کے خوف سے اس نے اسے منظور کر لیا ۔ اسے اس بات کا یقین بھی دلا دیا گیا ہوگا کہ جن لوگوں کے خلاف شہادت دینے کے لئے اسے آمادہ کیا جا رہا ہے ۔ وہ فی الواقع خطا وار تھے ۔ کیونکہ رمانا تھ میں اگر سزا کا خوف ہے تو احساس غیرت بھی ہے ۔ وہ اپنے پیشے ور گواہوں میں نہیں ہے ۔ جو اپنے مفاد کے لئے جھوٹی شہادتیں دیا کرتے ہیں ۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو رما اپنی بیوی کے اصرار سے اپنا بیان تبدیل کرنے پہ بھی کبھی راضی نہ ہوتا ۔ اس لئے میں اسے بری کرتا ہوں ۔

(۵۲)

چیت کی سہانی فرحت بخش شام ۔ گنگا کا کنارہ ۔ ٹیسوؤں سے لہلہاتا ہوا ڈھاک کا میدان ایک برگد کا چھتنا ور درخت ۔ اس کے نیچے بندھی ہوئی گائے بھینس ۔ کدو اور لوکی بیلوں سے لہراتی ہوئی جھونپڑیاں ۔ نہ کہیں گرد و غبار نہ شور و غل و آرام و سکون کے لئے اس سے بہتر کوئی اور جگہ ہو سکتی ہے ۔ نیچے سنہری گنگا ۔ سرخ ، سیاہ اور نیلے رنگوں سے چمکتی ہوئی میٹھے سروں میں گاتی ۔ کہیں لپکتی ۔ کہیں جھجکتی ۔ کہیں شوخ اور کہیں متین اس طرح بہتی ہوئی چلی جاتی ہے گویا بے فکروں کا خوشنما بچپن ہنستا چلا جاتا ہو ۔

دیبی دین اور رمانا تھ نے یہیں سکونت اختیار کی ہے ۔

تین سال گذر گئے ہیں ۔ اسی اثنا میں دیبی دین نے زمین خرید لی ہے باغ لگایا ۔ کھیتی جمائی ۔ مویشی جمع کئے اور مسلسل جد و جہد میں آرام و سکون کا لطف اٹھا رہا ہے اس کے چہرے پر اب وہ زردی اور جھریاں نہیں ہیں بلکہ ایک نئی رونق نظر آ رہی ہے ۔

شام ہو گئی مویشی چراگاہ سے لوٹے ۔ جگو نے انہیں کھونٹے سے باندھا اور تھوڑا تھوڑا بھوسہ لا کر ان کے سامنے ڈال دیا ۔ دیبی دین اور گوپی بھی بیل گاڑی پر پودے لادے ہوئے

آپہنچے۔ دیا ناتھ نے برگد کے نیچے زمین صاف کر رکھی ہے وہیں پولے اتارے گئے۔ یہی اس چھوٹی سی بستی کا ہی کھلیان ہے۔ دیا ناتھ نوکری سے برخاست ہو گئے ہیں اور اب دیی دین کے اسسٹنٹ ہیں۔ ان کو اخباروں سے اب بھی وہی عشق ہے۔ روز کئی اخبار آتے ہیں اور شام کو کام سے فرصت پانے کے بعد منشی جی اخباروں کو پڑھ کر سناتے ہیں اور سمجھاتے ہیں۔ آس پاس کے گاؤں کے دس پانچ آدمی روز جمع ہو جاتے ہیں۔ روز ایک چھوٹی سی سبھا ہوتی ہے۔

رما کو تو اس زندگی سے اتنی دلچسپی ہو گئی ہے کہ اب اسے شاید تھانیداری ہی نہیں چنگی کی انسپکٹری بھی مل جائے تو وہ ملازمت کا نام نہ لے۔ روز صبح اٹھ کر گنگا اشنان کرتا ہے اور دن نکلتے نکلتے اپنے شفا خانے میں آ بیٹھتا ہے اس نے طب کی دو چار کتابیں پڑھ لی ہیں۔ اور چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا علاج کر لیتا ہے بس پانچ مریض روز آجاتے ہیں اور اس کی شہرت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں سے فرصت پا کر اپنے باغ میں چلا جاتا ہے۔ وہاں کچھ ساگ بھاجی لگی ہوئی ہے کچھ پھل پھول کے درخت ہیں۔ ابھی تو باغ سے محض ترکاری ملتی ہے۔ لیکن امید ہے کہ تین چار سال میں پھلوں کی کافی مقدار پیدا ہونے لگے گی۔

دیی دین نے بیلوں کو گاڑی سے کھول کر کھونٹے سے باندھ دیا اور دیا ناتھ سے بولا۔ ابھی بھیا نہیں آئے۔

دیا ناتھ نے جواب دیا۔ ابھی نہیں۔ مجھے تو اب بہو کے اچھے ہونے کی امید نہیں ہے۔ زمانے کا پھیر ہے کتنے آرام سے رہتی تھیں اور آج یہ حال ہے۔ وکیل صاحب نے اچھی جائداد چھوڑی تھی۔ مگر بھائی بھتیجوں نے سب ہڑپ کر لی۔

دیی دین۔ بھیا کہتے تھے عدالت کرتی تو سب مل جاتا۔ مگر کہتی ہے میں عدالت میں جھوٹ نہ بولوں گی۔

یکایک جاگیشوری ایک بچے کو گود میں لئے جھونپڑے سے نکلی اور بچے کو دیا ناتھ کی گود میں دیتی ہوئی بولی ۔ مہتو ذرا چل کر رتن کو دیکھو جانے کیسی ہوئی جاتی ہے ۔ زہرہ اور بہو دونوں رو رہی ہیں ۔

دیبی دین نے منشی جی سے کہا ۔ چلو لالہ دیکھیں ۔

جاگیشوری بولی ۔ یہ جا کر کیا کریں گے بیمار کو دیکھ کر تو آپ ہی ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں ۔

دیبی دین نے رتن کی کوٹھری میں جا کر دیکھا ۔ رتن بانس کی ایک کھاٹ پر پڑی تھی جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا وہ سورج مکھی کا سا کھلا ہوا چہرہ مرجھا کر زرد ہو گیا تھا وہ دل نواز ہستی اور مسرت میں ڈوبا ہوا نغمہ فضا میں غائب ہو گیا تھا ۔ صرف اس کی یاد باقی تھی زہرہ اس کے اوپر جھکی ہوئی اسے دردناک اور مجبور نگاہوں سے دیکھ رہی تھی ۔ آج سال بھر سے اس نے رتن کی بیماری میں اپنے تئیں قربان کر دیا تھا ۔ رتن نے اس کے ساتھ جو محبت آمیز برتاؤ کیا اس بے اعتباری اور حقارت کے ماحول میں جس خلوص اور دلیری کے ساتھ نبھایا جوڑا تھا اس کا احسان وہ اور کس طرح مانتی ۔ جو ہمدردی اسے جالپا سے کبھی نہ ملی وہ رتن نے عطا کی ۔ اس دوستی میں اس کے دلِ محروم نے شوہر کا سکھ پایا اور اولاد کا بھی ۔

دیبی دین نے رتن کے چہرے کی طرف فکر مند نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا ۔ کتنی دیر سے نہیں بولیں ۔

جالپا نے آنکھیں پونچھ کر کہا ۔ ابھی ابھی تو بول رہی تھیں ۔ یکایک آنکھیں اوپر چڑھ گئیں اور بے ہوش ہو گئیں ۔

زہرہ نے پوچھا ۔ کیا بابو جی ابھی وید کو لے کر نہیں لوٹے ۔

دیبی دین نے آہستہ سے کہا ۔ ان کی دوا اب وید کے پاس نہیں ہے ۔

یہ کہہ کر اس نے تھوڑی دیر کو بات روک دی اور پھر رتن کے سر پر ہاتھ پھیرا، کچھ منہ ہی منہ میں بُد بُدایا اور چٹکی راکھ اس کے ماتھے پر لگا دی۔ تب پکار اٹھی رتن آنکھیں کھولو۔

رتن نے آنکھیں کھول دیں۔ اور ادھر اُدھر وحشت آمیز انداز سے دیکھ کر بولی۔ میرا موٹر آیا تھا نا؟ کہاں گیا، وہ آدمی؟ اس سے کہہ دو تھوڑی دیر کے بعد لائے۔ زہرہ! آج میں تمہیں اپنے باغیچہ کی سیر کراؤں گی۔ ہم دونوں جھولے پر بیٹھیں گے۔

زہرہ پھر رونے لگی۔ جالپا بھی سیلاب اشک کو روک نہ سکی۔ رتن ایک لمحہ تک چھت کی طرف تاکتی رہی۔ پھر یکایک گویا اس کا حافظہ بیدار ہو گیا ہو، شرمندہ ہو کر ایک غمناک تبسم کے ساتھ بولی میں ایک خواب دیکھ رہی تھی۔

سرخ آسمان پر تاریکی کا پردہ پڑ گیا تھا۔ اسی وقت موت نے رتن کی زندگی پر پردہ ڈال دیا۔

رما ناتھ وید جی کو لے کر پھر رات کو لوٹے تو یہاں موت کا ناٹا چھایا ہوا تھا۔ رتن کی موت کا غم وہ غم نہ تھا جس میں انسان ہائے ہائے کرتا ہے بلکہ وہ غم جس میں آہیں خاموش ہو جاتی ہیں جس میں آنکھیں خشک ہو جاتی ہیں جو روح پر ہیبت کی طرح مسلط ہو جاتا ہے۔

رتن کے بعد زہرہ اکیلی رہ گئی۔ دونوں ساتھ سوتی تھیں ساتھ بیٹھتی تھیں ساتھ کام کرتی تھیں۔ اب زہرہ کا جی کسی کام میں نہ لگتا۔ کبھی دریا کے کنارے جا کر رتن کو یاد کرتی اور روتی کبھی اس آم کے پودے کے پاس جا کر گھنٹوں کھڑی رہتی جسے ان دونوں نے لگایا تھا گویا سہاگ لٹ گیا۔ جالپا کو بچے کی پرورش و پرداخت اور گھر کے کام کاج سے اتنی فرصت نہ ملتی کہ اس کے ساتھ بہت دیر تک بیٹھتی اور یہ بھی ایک طرح سے اچھا تھا کیونکہ جب دونوں ساتھ ہوتیں تو رتن کا ذکر آ جاتا اور دونوں رونے لگتیں۔

بھادوں کا مہینہ تھا عناصر معرکہ کار زار گرم تھا بحری فوجیں ؟؟ جہازوں پر

چڑھ کر آبی تیروں کی بارش کر رہی تھیں۔ زمین اس پرورش سے عاجز آکر گوشۂ عافیت تلاش کرتی پھرتی تھی۔ گنگا گاؤں اور قصبوں کو نگل رہی تھی۔ گاؤں کے گاؤں بہتے چلے جاتے تھے۔ سزہرہ ندی کے کنارے بیٹھی سیلاب کی غاصبانہ براندازیوں کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ وہ لاغر اندام گنگا اتنی جسیم اور مہیب ہو سکتی ہے اس کا وہ قیاس بھی نہ کر سکتی تھی۔ اسی گنگا میں وہ ایک ہلکی سی ڈونگی میں بیٹھ کر جل بہار کیا کرتی ہے۔ آج اس میں پہاڑ کا بھی پتہ نہ لگے گا۔ لہریں جنون کے عالم میں گرجتیں، منہ سے پھین نکالتی، بلیوں اچھل رہی تھیں۔ کبھی لپک کر آگے جاتیں، پھر پیچھے لوٹ پڑتیں اور چکر کھا کر آگے دوڑتیں۔ کہیں جھونپڑا ڈگمگاتا تیزی سے بہا جا رہا تھا، گویا کوئی شرابی دوڑا جاتا ہو۔ کہیں کوئی درخت ڈال پتوں سمیت ڈوبتا اترتا کسی دور بحر کے کوہ قامت جاندار کی طرح تیرتا چلا جاتا تھا۔ گائے بھینسیں، کھاٹ کھٹولے طلسمی تصویروں کی طرح آنًا فانًا میں آنکھوں کے سامنے سے نکل جاتے تھے۔ اور ایک بار غائب ہو کر ایک فرلانگ کے بعد پھر نکل پڑتے تھے۔

دفعتًا ایک کشتی نظر آئی۔ اس پر کئی مرد عورت بیٹھے ہوئے تھے۔ بیٹھے کیا، جمٹے ہوئے تھے۔ کشتی زیر و زبر ہو رہی تھی۔ پس یہی معلوم ہوتا تھا کہ اب اُلٹی۔ اب اُلٹی۔ مگر واہ ری ہمتِ مردانہ سب کے سب اب بھی گنگا ماتا کی جے کے نعرے لگاتے جاتے تھے۔ عورتیں اب بھی گنگا کے گیت گا رہی تھیں۔ مرگ و حیات کی کش مکش کا کتنا ہیبت ناک نظارہ تھا۔ دونوں طرف کے آدمی سینوں پر ہاتھ رکھے شدتِ سکون کی حالت میں کھڑے تھے۔ جب کشتی کروٹ لیتی تو لوگوں کے دل اُچھل اُچھل کر لبوں تک آ جاتے۔ رسیاں پھینکنے کی کوشش کی جا رہی تھی، مگر وہ ساحل سے تھوڑی دور ہی گر پڑتی تھیں۔ یکایک ایک بار کشتی اُلٹ گئی۔ وہ سب ہستیاں بحرِ فنا میں غرق ہو گئیں۔ ایک لمحے تک کئی مرد و عورت ڈوبتے نظر آئے۔ پھر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ صرف ایک سفید سی چیز ساحل کی طرف چلی آ رہی تھی۔ ایک ہی ریلے میں وہ ساحل سے کوئی تیس گز قریب آ گئی۔

اب معلوم ہوا کوئی عورت ہے، زہرہ، جالپا اور رما ناتھ تینوں ہی آبہونچے تھے۔ عورت کی گود میں ایک بچہ بھی نظر آرہا تھا۔ دونوں چشم زدن میں کہاں سے کہاں جا پہنچیں گے۔ انہیں کیسے گنگا کے منہ سے نکال لیا جائے۔ تینوں ہی بے تاب تھے۔ تینوں بیکسانہ اضطراب سے اس عورت کی طرف دیکھتے تھے۔ اور دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتے تھے۔ عورتیں معذور تھیں رما ناتھ تیرنا جانتا تھا لیکن لہروں سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کہیں لہروں کے زور میں پاؤں اکھڑ جائیں۔ تو خلیج بنگال کے سوا کہیں ٹھکانہ نہ لگے۔

زہرہ نے بے صبر ہو کر کہا۔ ابھی دونوں زندہ ہیں۔ جالپا سچ!

اور وہ ایک بے ہوشی کے عالم میں پانی میں چل پڑی۔

رما ناتھ نے شرمندہ ہو کر کہا۔ تم کہاں جاتی ہو زہرہ! تیار تو میں بھی تھا لیکن وہاں تک پہونچ بھی سکوں گا۔ اس میں شک ہے دیکھتی نہیں ہو پانی میں کتنا توڑ ہے۔

زہرہ گھٹنے تک پانی میں جا پہنچی تھی۔ بولی۔ نہیں تم نہ آنا خدا کے لئے میں ابھی نکالے لاتی ہوں۔

وہ کمر تک پانی میں پہنچ گئی۔ رما ناتھ گھبرا کر بولا۔ کیوں ناحق جان دینے جاتی ہو زہرہ! خدا کے لئے لوٹ آؤ، ٹھہرو میں آتا ہوں۔

زہرہ نے ہاتھوں سے منع کرتے ہوئے کہا۔ نہیں نہیں تمہیں میری قسم، تم نہ آنا۔ میں ابھی لئے آتی ہوں۔ مجھے کچھ کچھ تیرنا آتا ہے۔

جالپا نے کہا۔ لاش ہو گی اور کیا۔

رما بولا۔ شاید ابھی جان ہو۔

جالپا۔ اچھا زہرہ تیر بھی لیتی ہے جبھی ہمت پڑی۔

رما نے زہرہ کی طرف فکرمند نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ہاں کچھ کچھ جانتی تو ہے۔ مگر

لوٹ آئے تو کہیں۔ مجھے اپنی پست ہمتی پر شرم آرہی ہے۔

جالپا نے چیں بجبیں ہوکر کہا۔ اس میں شرم کی کون سی بات ہے۔ مُردہ لاش کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈالنا کونسی عقلمندی ہے۔

رما نے اپنے نفس کو ملامت کرتے ہوئے کہا۔ یہاں سے کون جان سکتا ہے زندہ ہے یا مُردہ۔ واقعی بال بچوں والا نامرد ہوجاتا ہے۔ میں کاٹھ کے اُلّو کی طرح کھڑا رہا اور زہرہ چلی گئی۔

زہرہ ہاتھ پیر مارتی لاش کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اتنے میں ایک لہر آئی اور لاش کو پھر ساحل سے دور کھینچ لے گئی۔ زہرہ خود اس کے زد میں آگئی اور کئی ہاتھ بہاؤ کی طرف چلی گئی۔ وہ پھر سنبھلی۔ پر ایک دوسرے ریلے نے پھر اُسے ڈھکیل دیا۔ وہ کسی طرح نہ سنبھل سکی۔ اس نے چیخ ماری اور پانی میں سما گئی۔

رما بے تاب ہوکر پانی میں کود پڑا۔ اور زور زور سے پکارنے لگا۔ زہرہ زہرہ میں آتا ہوں۔

مگر زہرہ میں اب لہروں سے جنگ کرنے کی طاقت نہ تھی۔ وہ پھر باہر نکلی۔ مگر ایک فرلانگ پر وہ بھی جا رہی تھی۔ اس کے اعضا میں کوئی بھی حرکت نہ تھی۔

یکایک ایک ایسا ریلا آیا کہ وہ بیچ دھار میں جا پہنچی۔ اب صرف اس کے سر کے بال نظر آرہے تھے۔ وہ بھی صرف ایک لمحے تک۔ پھر وہ نشان بھی غائب ہوگیا۔ یہی اس کی آخری دیدار تھی۔

رما ایک سو گز تک ہاتھ پاؤں مارتا لہروں کا سامنا کرتا گیا۔ لیکن اتنی سی دور میں اس کا دم پھول گیا۔ اب آگے کہاں جائے۔ زہرہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہی آخری جھلک آنکھوں کے سامنے تھی۔

کنارے پہ جالپا کھڑی ہائے ہائے کر رہی تھی۔ آخر وہ بھی پانی میں گھُسی۔

رما اب آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک طاقت آگے کھینچتی تھی، دوسری پیچھے آگے کی طاقت میں مایوسی تھی، قربانی تھی، وفا تھی۔ پیچھے کی طاقت میں فرض تھا بندش تھی اور زندگی کی امیدیں تھیں۔ بندش نے روک لیا، وہ لوٹ پڑا۔

کئی منٹ تک جالپا اور رما گھٹنوں تک پانی میں کھڑے اسی طرف تاکتے رہے رما کی زبان تاسف نے بند کر رکھی تھی، جالپا کے غم نے۔

آخر رما نے کہا۔ پانی میں سے نکل چلو ٹھنڈ لگ جائے گی۔

جالپا پانی سے باہر نکل کر کنارے پر کھڑی ہو گئی۔ پر منہ سے کچھ نہ بولی۔ موت کے اس طمانچے نے اس کے حواس کو مفلوج سا کر دیا تھا۔ زندگی کی حبابی کیفیت زندگی میں دوسری بار اس کی نظروں کے سامنے آئی۔ رتن کی موت کا پہلے ہی سے اندیشہ تھا، معلوم تھا کہ وہ تھوڑے دنوں کی مہمان ہے۔ مگر زہرہ کی موت تو بجلی کی چوٹ تھی۔ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے تینوں آدمی روانی دریا کا تماشہ دیکھنے خوش خوش چلے تھے کون جانتا تھا کہ موت انہیں اپنی بے دردیوں کا تماشہ دکھانے کے لئے کھینچے لئے جا رہی ہے۔

ان چار برسوں میں زہرہ نے اپنی خدمت بے نفسی اور پُر انکسار اخلاق سے سبھی کو گرویدہ کر لیا تھا۔ اپنے ماضی کی یاد کو دل سے مٹانے کے لئے۔ اپنے پچھلے داغوں کو دھو ڈالنے کے لئے اس کے پاس اس کے سوا اور کیا ذریعہ تھا۔ اس کی ساری خواہشیں اور ساری حسرتیں اسی جوش خدمت میں جذب ہو گئی تھیں۔ کلکتہ میں وہ حظ نفس اور تفریح کی چیز تھی۔ اس وقت شاید کوئی شریف آدمی اسے اپنے گھر میں قدم نہ رکھنے دیتا۔ یہاں وہ ہمدردی اور محبت کی چیز تھی سبھی اس کے ساتھ گھر کے آدمی کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ منشی دیا ناتھ اور جاگیشوری کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا گیا تھا کہ وہ دیبی دین کی بیوہ بہو ہے۔ زہرہ نے کلکتہ میں جالپا سے محض اس کے ساتھ

رہنے کی التجا تھی۔ مگر اس کا دل تر ازوں سے خالی نہ تھا۔ جالپا کے خلوص اور بےلوث پن نے اسے تہذیبِ نفس کی جانب مائل کر دیا تھا۔ رتن کی پاکیزہ اور بے غرض زندگی اسے روز بروز ایثار کی طرف لئے جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اس میں غرض کا مشابہ بھی نہ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد رما بھی پانی سے نکلا۔ اور ماتم میں ڈوبا ہوا آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلا۔ اس کے بعد اکثر وہ اور جالپا ندی کے کنارے آ بیٹھتے اور جہاں زہرہ ڈوبی تھی وہاں گھنٹوں دیکھا کرتے۔ کئی دنوں تک انہیں امید ہو رہی تھی کہ شاید زہرہ کہیں بچ گئی ہو۔ اور کسی طرف سے ہنستی ہوئی چلی آئے۔ رفتہ رفتہ امید کا جھلملاتا ہوا چراغ بھی یاس کی تاریکی میں فنا ہو گیا۔ ہاں ابھی تک زہرہ کی وہ پاکیزہ صورت ان کی آنکھوں کے سامنے پھرا کرتی ہے۔ اس کے لگائے پودے۔ اس کی پالی ہوئی بلی۔ اس کے ہاتھوں کے سلے ہوئے کپڑے یہ سب اس کی یادگاریں ہیں جو خیال کو اس کے وجود کا یقین دلاتی رہتی ہیں۔

ختم شد